قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے سفرنامے

مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے ملک و بیرون ملک کے متعدد اہم اسفار کی تفصیل خود قاضی صاحب کی شگفتہ تحریر میں

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

(فاضل دارالعلوم دیوبند)

ناشر

قاضی اطہر اکیڈمی

لکھنؤ۔ انڈیا

قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے

تالیف

مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

ترتیب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

قاضی اطہر اکیڈمی، لکھنؤ

تفصیلات

نام کتاب............ قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے

مصنف .... مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

مرتب .... مولانا ضیاءالحق خیرآبادی

پبلشرز .... قاضی اطہر اکیڈمی، لکھنؤ

باہتمام .... مولانا ضیاءالحق خیرآبادی

صفحات 384

قیمت .... 140/=

تعداد 1000

سنہ طباعت............ اپریل ۲۰۰۵ء

ملنے کا پتہ

مکتبہ ضیاءالکتب، خیرآباد، ضلع مئو

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆☆☆☆

اسفار مولانا خالد کمالؒ بن مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

قاضی اطہر مبارکپوری علم وتحقیق کی دنیا کی ایک قد آور شخصیت کا نام ہے، تاریخ ان کا خصوصی موضوع تھا، بالخصوص عرب وہند کے ابتدائی چارسوسالہ تعلقات پر جوانھوں نے لکھ دیا وہ ایک سند ہے، اوراب تک اس پر اضافہ نہیں کیا جاسکا اور مستقبل میں بھی اس کی امید کم ہے،

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کے پیش لفظ میں بالکل درست تحریر فرمایا کہ:

''اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب وگیاہ صحرا میں تنہا چلے، اور جب لوٹے تو باغ وبہار کا ایک پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے''

قاضی صاحب نے بمبئی جیسے علم کُش شہر میں رہتے ہوئے نہایت مصروف علمی زندگی گزاری، اپنی خودنوشت سوانح میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

میں ''انقلاب'' اور ''البلاغ'' کے علاوہ ''معارف'' ''صدق جدید'' اور ''برہان'' وغیرہ میں مضامین لکھنے کے ساتھ عربی اردو میں تصنیف وتالیف میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتا تھا، اسی میں بہت محدود طور پر شہر کی علمی واصلاحی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا، الغرض اپنے کو بالکل مصروف کررکھا تھا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ایک مرتبہ بمبئی میں کہا کہ آپ کے انہماک ومصروفیت کو دیکھ کر الفرقان کے لئے مضمون کا تقاضہ کرنے میں ڈر معلوم ہوتا ہے،

ظاہر ہے کہ اس مصروفیت کے ساتھ اسفار کی نوبت کم آتی تھی، خاص خاص احباب کے اصرار پر ہی کبھی اسفار ہوا کرتے تھے، البتہ قاضی صاحب نے اس کا التزام ضرور کیا کہ اسفار سے متعلق اپنے تاثرات کو البلاغ میں شائع کرتے رہے، جب ماہنامہ ضیاء الاسلام کے قاضی اطہر نمبر کی تیاری چل رہی تھی اس وقت البلاغ کی بہت سی فائلیں نظر سے گزریں، اسی وقت ان سفرناموں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا، اوران کی افادیت کے پیش نظر برابر یہ خیال دل میں رہا کہ موقع ملتے ہی اسے مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کرنا چاہئے تاکہ تحقیق ونظر کے نئے نئے گوشے علمی دنیا کے سامنے آئیں۔

قاضی صاحب نے جس موضوع کو مطالعۂ وتصنیف کا محور بنایا تھا اس نے ان کے مزاج کو علم وتحقیق کے ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا، لہٰذا ان کے اسفار میں بھی ان کا تحقیقی وتاریخی مزاج ساتھ ساتھ چلتا رہا، انھوں نے ان ممالک اور علاقوں کا جہاں جہاں ان کے قدم پڑے سطحی وتفریحی نظر سے زیادہ علمی وتاریخی اور تمدنی اعتبار سے جائزہ لیا، اوران سفرناموں میں ان علاقوں اور خطوں کی بنیادی تاریخ آ گئی ہے، ان کے سامنے بادشاہوں کی بنوائی ہوئی بلند وبالا عمارات اورآہنی وسنگین قلعے کی تعمیراتی خصوصیات اور حسن وجمال سے زیادہ ان قوموں کی تاریخ کا باب روشن رہا، اورآیت قرآنی فسیروا فی الارض ...... نے ان کے ذہن ودماغ کے ایمانی دروں کو کھولا اوراسی نظر سے قاضی صاحب نے انھیں دیکھا اوراس سے متاثر ہوئے، اوراپنے تاثرات کو حقائق کی روشنی میں مرتب فرمایا، اس طرح یہ سفرنامہ ایک تاریخی وعلمی دستاویز بن گیا ہے، جس میں سفرنامہ کا لطف بھی ملتا ہے اورتاریخی حقائق بھی حاصل ہوتے ہیں، جغرافیائی حالات کے ساتھ ان خطوں کا تہذیبی وتمدنی معیار بھی، شخصیات کا جامع تعارف بھی اورآثار کی قدیم وجدید تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔

بس اس سفرنامے کے بارے میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ قاضی صاحب کا یہ

سفرنامہ ،سفر ناموں کے ازدحام میں خوامخواہ کا اضافہ نہیں، بلکہ تاریخی وتمدنی انسائیکلوپیڈیا ہے، جس کو مسافر نے بچشم خود مشاہدہ کرنے اورتاریخی حیثیت سے جائزہ لینے کے بعد اپنے واردات قلب کو پوری دیانت داری کے ساتھ نہایت سادگی اور بے ساختگی سے سلک تحریر میں پرو دیا ہے۔

اس کتاب میں کل اٹھارہ اسفار کی روداد ہے،اور یہ سب کے سب البلاغ میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں ابتدائی دو میں سفر حج سے متعلق تاثرات ہیں، اور تیسرا سفر قاہرہ کا ہے، قاضی صاحب نے ۱۳۹۷ھ میں چوتھا حج کیا، اس کے بعد افریقہ اور بلاد عرب کا ٦/ ماہ تک سفر کیا، سفر قاہرہ والے سفرنامہ کے آغاز میں اس کی بھی مختصر روداد آگئی ہے، سفر قاہرہ بھی اسی طویل سفر کا ایک حصہ تھا، اس کے علاوہ بقیہ ۱۵/اسفار کا تعلق اندرون ملک سے ہے، ان میں سے درج ذیل سفرنامے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

بمبئی سے ایلوراتک	مبارکپور سے جون پورتک
دہلی کا ایک یادگار سفر	بمبئی سے برہان پورتک
احمد نگر کا علمی ودینی سفر	سفرنامہ ناندیڑ، وغیرہ

قاضی صاحب نے ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۶ء میں پاکستان کا سفر کیا، اول الذکر کی روداد قومی آواز لکھنؤ اور ثانی الذکر کی اردو ٹائمز بمبئی میں شائع ہوئی، مگر باوجود تلاش وجستجو کے ان کے حصول میں کامیابی نہ ہوسکی، اگر کوئی صاحب اسے حاصل کرسکیں تو مرتب کو ضرور مطلع کریں، تاکہ اگلے ایڈیشن میں اسے شائع کیا جاسکے، مرتب ان کا شکرگزار ہوگا۔

کتاب کے اخیر میں قاضی صاحب کے فرزند اکبر مولانا خالد کمال صاحب فاضل دیوبند ومدینہ یونیورسٹی ، کے تین اسفار جو سعودی عرب اور مغربی افریقہ سے متعلق ہیں، ان کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر شامل کتاب کردیا گیا ہے، امید کہ یہ قارئین کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اس سفرنامے کی ترتیب میں سب سے زیادہ تعاون قاضی صاحب کے صاحبزادۂ محترم قاضی مولوی ظفر مسعود صاحب کا رہا، بلکہ کہنا چاہئے کہ وہی اس کے اصل محرک تھے، انھوں نے اس کے ساتھ خاص دلچسپی لی، البلاغ کی تمام فائلیں اور مضامین کے فوٹو اسٹیٹ انھوں نے مہیا کئے، اس سلسلے میں مجھ سے برابر رابطہ رکھا اور حوصلہ افزائی فرماتے رہے ان کی اس حوصلہ افزائی سے راہ کی کتنی مشکلیں سر ہوئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا قاضی سلمان مبشر صاحب نے بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کی، حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی قدردانی وحوصلہ افزائی ہی کی بدولت یہ کتاب مرتب ہو پائی ہے۔ **فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء**

اخیر میں اس ذات گرامی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا اور آئندہ جو کچھ ہونے کی توقع ہے وہ سب اسی کے فیض تربیت اور فیضان نظر کی برکت ہے، میری مراد مربی و مشفقم استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب مدظلہم العالی کی ذات بابرکات ہے، جب یہ سفرنامہ مرتب ہوگیا تو میری درخواست پر حضرت الاستاذ نے پوری کتاب پر ایک نظر ڈال کر اپنے مفید مشوروں سے نوازا، اور ایک مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا، جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ باری تعالی تادیر آپ کا سایۂ شفقت ہمارے سروں پر قائم رکھیں اور آپ کے فیض کو عام وتام فرمائیں۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اپنی مفید آراء سے مطلع فرمائیں تاکہ اسے آئندہ خوب سے ترخوب بنایا جاسکے۔

ضیاء الحق خیرآبادی
استاذ مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ
۸/صفر ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۹/مارچ ۲۰۰۵ء شنبہ

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقَدِّمَہ

بقلم: حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ
صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، ضلع اعظم گڈھ

میرے عزیز جناب مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے ابوالمعالی حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ کے سفرناموں کو جو ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی کے مختلف شماروں میں بکھرے ہوئے تھے، مرتب کرکے علمی و دینی اسفار کا ایک خوبصورت مرقع تیار کیا ہے، اس مرقع کو دیکھ کر قاضی صاحب کا ایک جملہ ذہن و دماغ میں جگمگانے لگا، اس جملہ نے اس وقت بھی مجھ کو بہت متاثر کیا تھا، جب میں نے ان کی زبان سے سنا تھا، اور آج جب یہ تحریر لکھ رہا ہوں، تو بھی طبیعت بے تاب ہے کہ اسے یہاں صفحۂ قرطاس کی نذر کروں۔

قاضی صاحب کے دورِ اخیر کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کے وقت قاضی صاحب ایک لمبے سفر سے تشریف لائے۔ چہرے پر تکان کے آثار صاف نمایاں تھے، کپڑے بھی متغیر ہو رہے تھے، ان کے ایک بے تکلف دوست اور ساتھی نے خیریت دریافت کی، تو فرمانے لگے کہ آج کل سفر بہت دشوار ہو گیا ہے، ٹرینوں میں اتنی بھیڑ بھاڑ اور مسافروں میں اتنی بے قاعدگی ہوتی ہے کہ ریزرویشن ہوتے ہوئے بھی دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ جسم اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ طبیعت پریشان ہو گئی۔ دیر تک سفر کی مشکلات کا تذکرہ کرتے رہے۔ اس پر ان کے بے تکلف

دوست نے ازراہِ بے تکلفی فرمایا کہ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ آپ سفر نہ کریں، آپ سفر بھی کئے جاتے ہیں، اوراس سے پریشان بھی ہوئے جاتے ہیں، قاضی صاحب نے فوراً فرمایا اوراپنی علاقائی زبان اور لہجے میں فرمایا کہ چپ رہو جی! تمہاری طرح ہم لوگ ''گھر گھسنے'' تھوڑا ہی ہیں۔ سفر کرنے سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس آخری جملے کی معنویت سے دل پھڑک گیا۔ اس پر جتنا غور کیجئے معنویت کی تہیں کھلتی جائیں گی۔

سفر کرنے والے بہت ہیں، اور ہر ایک سفر، کسی نہ کسی عنوان سے مسافر کے دامن شخصیت میں تکمیلی تحفے ڈالتا جاتا ہے، لیکن ہر سفر کے احوال وکوائف میں دوسروں کو شریک نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہر سفر کا سفر نامہ لکھا جاسکتا ہے۔

ہاں سفر ایسا ہو کہ اس کے ساتھ علمی اور دینی مقاصد وابستہ ہوں، مسافر نے اسی نقطۂ نظر سے سفر کے مرحلوں کو دیکھا ہو مقامات سفر کا اسی اعتبار سے مطالعہ کیا ہو، ایسے اسفار بیشک اس کے مستحق ہیں کہ ان کے سفر نامے لکھے جائیں، اور دوسروں کو سفر کے واردات میں شریک کیا جائے۔

سفر ایک درسگاہِ عبرت وموعظت ہے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، **أفلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلهم** (سورہ محمد: ۱۰) کیا ان لوگوں نے سفر نہیں کیا، کہ یہ پچھلے لوگوں کے انجام کا مشاہدہ کرتے۔

سفر عقل وفہم کے دروازوں کی کلید ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أفلم یسیروا فی الارض فتکون لهم قلوبٌ یعقلون بها أو آذان یسمعون بها (سورۃ الحج: ۴۶) کیا انھوں نے زمین کا سفر کیا، کہ انھیں عقل حاصل ہوتی جس سے سمجھتے یا کان نصیب ہوتے جن سے یہ سنتے۔

سفر کا یہ وہ نقطۂ نظر ہے، جس سے شخصیت کی تکمیل بدرجۂ کمال ہوتی ہے۔

قاضی صاحب ایک محقق عالم اور صاحب بصیرت مورخ تھے، اس کے ساتھ دینی حمیت وغیرت اور ایمانی وروحانی جذبات سے سرشار تھے، جہاں وہ تاریخ کے صفحات الٹتے پلٹتے اور ان کے مٹے مٹے نقوش کو ابھارتے اور صاف کرتے ہیں وہیں ایمانی عبرتیں، دینی حمیتیں اور روحانی حلاوتیں ساتھ ساتھ جلوہ نما ہوتی رہتی ہیں، ان کی مجلسی گفتگوؤں میں بھی یہ رنگ رچا بسا رہتا تھا، جہاں وہ علمی وتاریخی حقائق کے گوہر لٹاتے ہوتے، وہیں ان کی گفتگو سے اسلامی حمیت وغیرت کا درس بھی ملتا رہتا۔

قاضی صاحب نے جن اسفار کی داستان سنائی ہے، ان میں علم وتاریخ اور تہذیبی وتمدنی معلومات کے پہلو بہ پہلو عبرت وموعظت اور اسلامی حمیت وصلابت کے جلوے بھی ملتے ہیں۔

قاضی صاحب نے بہت سے سفر کئے ہیں، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی، اور ہر سفر سے علمی وتاریخی سوغاتیں اور عبرتوں ونصیحتوں کے خزانے ساتھ لائے ہیں۔ پھر ان میں قارئین کو شریک کیا ہے۔ ان سوغاتوں اور خزانوں کو عزیز مرتب سلّمہ نے اکٹھا کر کے تاریخی حقائق، تہذیبی وتمدنی معلومات اور علمی ودینی تعلیمات کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار کر دیا ہے یا یہ کہئے کہ بہترین الوان نعمت کا دسترخوان بچھا دیا ہے، ہم کو امید ہے کہ اس دسترخوان سے استفادہ کرنے والا، ان تمام فوائد سے متمتع اور آسودہ ہوگا، جن فوائد کے لئے سفر کی مشقت برداشت کی جاتی ہے، سفرناموں کے ادب میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اور قاضی صاحب کے باقیات صالحات اور حسنات کی ایک بہترین یادگار!

اعجاز احمد اعظمی

۱۵/صفر ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۶/مارچ ۲۰۰۵ء شنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف مؤلف

از: مولانا محمد عثمان صاحب معروفیؒ

مورخ اسلام الحاج مولانا عبدالحفیظ صاحب قاضی اطہر مبارکپوری، محلّہ حیدرآباد قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڈھ میں ۴؍رجب ۱۳۳۴ھ ۷؍مئی ۱۹۱۶ء بروز یکشنبہ صبح پانچ بجے پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری متوفی ۱۳۵۹ھ نے عبدالحفیظ نام رکھا۔ مگر قاضی اطہر سے مشہور ہوئے۔ اطہر آپ کا تخلص ہے، جوانی میں کچھ دنوں خوب شاعری کی، برجستہ اشعار کہتے تھے، پھر شاعری چھوڑ دی۔ قاضی اسلئے کہے جاتے ہیں کہ آپ کے خاندان میں ایک عرصہ تک نیابتِ قضا کا عہدہ قائم رہا۔

خاندان

قاضی اطہر بن الحاج الشیخ محمد حسن متوفی ۱۳۹۸ھ ابن الحاج الشیخ لعل محمد بن الشیخ محمد رجب بن الشیخ محمد رضا بن الشیخ امام بخش بن الشیخ علی الشہیدؒ شیخ علی کے اوپر کا حال نہیں ملتا البتہ شیخ محمد رجب سے شیخ علی شہید تک چار پشت نائب قاضی ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ ان نائب قاضیوں کا ایک ایک حلقہ متعین ہوتا تھا، اپنے اپنے حلقہ میں اقامت و امامت جمعہ و عیدین، پیش آمدہ وقتی مسائل، نکاح، طلاق، وراثت، اختلاف بین المسلمین کے قضایا وغیرہ کی انجام دہی نائب قاضیوں کے ذمہ ہوتی تھی، نائب قاضیوں کو سندیں اور احکامات قاضی القضاۃ کی طرف سے بھیجے جاتے تھے۔

دارالقضاۃ

انگریزوں کے آخری دور میں محکمہ قضاء ایک اعزازی محکمہ تھا۔ اس اطراف میں محمد آباد گوہنہ دارالقضاء تھا، یہاں کے قاضی القضاۃ قاضی محمد سلیم بن محمد عطا جعفری مچھلی شہری

متوفی ۱۲۶۶ھ، ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ سے سولہ برس تک قاضی رہے، اعظم گڈھ مسجد دلال گھاٹ کے سامنے احاطہ میں ان کی قبر ہے، قاضی محمد سلیم سے پہلے قاضی محمد رؤف اور ان کے بعد قاضی محمد شاہ عالم محمد آباد گوہنہ کے قاضی رہے۔ ان تینوں قاضیوں کا زمانہ، قاضی اطہر صاحب کے جد اعلیٰ شیخ امام بخش کو ملا اور تینوں کی سند قضاء ان کو ملی، راقم الحروف نے قاضی محمد سلیم اور قاضی شاہ عالم کی سندیں قاضی اطہر صاحب کے مکان پر دیکھی ہیں۔ اسی طرح مولانا محمد طاہر صاحب معروفی بھی اپنے حلقہ میں قاضی محمد سلیم کے نائب القاضی تھے، قاضی سلیم کی ایک تحریر بنام مولانا محمد طاہر نائب القاضی ۱۷/ربیع الآخر ۱۲۵۸ھ کی آپ کے خاندان میں محفوظ ہے۔ شیخ امام بخش نائب القاضی کا مکان راجہ مبارک شاہ کی مسجد سے متصل تھا، اس جامع مسجد کے امام بھی آپ ہی تھے۔

قصبہ مبارکپور

اس قصبہ کا نام پہلے قاسم آباد تھا، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ کے خلیفہ تھے اور شاہان شرقیہ کے دور میں جونپور آکر رہنے لگے تھے۔ انھیں کی اولاد میں راجہ مبارک شاہ بن راجہ سید احمد شاہ بن راجہ سید نور شاہ بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوریؒ دسویں صدی ہجری شہنشاہ ہمایوں کے دور ۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ میں یہاں آکر قاسم آباد کے کھنڈروں پر اپنے نام سے مبارک پور قصبہ کی نئی تعمیر کی اپنے ہمراہ کڑا مانک پور سے ایک علمی، دینی اور روحانی خانوادہ کو لاکر مبارک پور میں بسایا جو قصبہ اور اطراف میں دینی امور کا معتمد و متولی بنا اور نیابت قضا کے منصب پر نسلاً بعد نسل فائز رہا، اسی علمی خانوادہ کے ایک روشن چراغ قاضی اطہر صاحب مبارکپوری تھے۔ اس خانوادہ کو راجہ مبارک شاہ اپنا جانشین مقرر کر کے کڑا مانک پور چلے گئے وہیں ۲/شوال ۹۶۵ھ فوت ہوئے۔

(تذکرہ علماء مبارکپور۔ ماہنامہ البلاغ بمبئی شوال ۱۳۸۸ھ)

نانہال

قاضی جی کی والدہ کا نام حمیدہ بنت مولانا احمد حسین رسولپوریؒ ہے بڑی پابند صوم و صلوٰۃ تھیں، محلّہ کے بچوں کو پڑھاتی تھیں بچوں کو دینی کتابیں پڑھ کر سناتیں۔ قاضی جی کا

دینی مزاج بنانے میں ان کو بڑا دخل تھا، ۱۳۵۲ھ میں فوت ہوئیں، جب قاضی جی اٹھارہ برس کے تھے، آپ کی اسی سالہ نانی رحیمہ بنت حافظ نظام الدین سریانویؒ بڑی عابدہ زاہدہ پابند اوراد و وظائف، پچاس برس تک اپنے مکان کو لوجہ اللہ مدرسہ بنا کر گاؤں بھر کے بچے بچیوں کو قرآن کریم اور کتب دینیہ کی تعلیم دیتی رہیں۔ ۲۶/رمضان ۱۳۷۸ھ میں فوت ہوئیں۔ انھوں نے بھی قاضی جی کو دودھ پلایا تھا اور انتہائی محبت سے تربیت کی تھی۔ آپ کے نانا حکیم الحاج مولانا احمد حسین بن عبدالرحیم رسولپوریؒ ۱۲۸۸ھ میں پیدا ہوئے۔ جملہ علوم وفنون میں ماہر، عربی ادب کے صاحب دیوان شاعر، اعلیٰ مدرس و مفتی، بہترین مصنف، طبیب حاذق، عمدہ دواساز اور جلد ساز، زہد و تقویٰ کا نمونہ، ہمہ وقت کتب بینی یا کسی دوسرے عمل میں مصروف، ڈھاکہ میں طویل عرصہ تک صدارت تدریس کے منصب پر فائز، ہر ایک خط کے اعلیٰ خطاط و خوشنویس، یتیموں کے مربی، ۲۶/رجب ۱۳۵۹ھ میں رحلت کی اس وقت قاضی جی پچیس برس کے تھے، آپ نے نانا سے اور ان کی کتابوں سے بہت فیض حاصل کیا۔ آپ کے ماموں مولانا محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین رسولپوریؒ ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے، راقم کے استاد تھے، عربی ادب کے ماہر اور اچھے شاعر، جامع المنقول والمعقول ذی استعداد عالم، خاندانی طبیب حاذق، علم ہیئت وفلکیات کے امام، صاحب تصنیف وتالیف، مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور، پھر احیاء العلوم مبارکپور کے علیا کے استاد، نہایت سلیقہ شعار، بہترین جلد ساز، مستخرج دائمی اوقات صلوٰۃ، احیاء العلوم ہی میں بمرض سل ۱۱/صفر ۱۳۸۷ھ کو فوت ہوئے۔ ''مولانا محمد یحییٰ مدرس امجد جامعہ احیاء العلوم مبارکپور'' سے احقر نے تاریخ رحلت برآمد کی ہے، قاضی جی نے اپنے ماموں کی مشفقانہ و مربیانہ توجہات سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ آپ کے نانا کے بڑے بھائی حکیم الحاج المفتی مولانا عبدالعلیم بن عبدالرحیم متوفیٰ ۱۳۴۱ھ صدر مدرس چشمۂ رحمت غازی پوری، طبیب حاذق، اعلیٰ درجہ کے خطاط، خود اعتماد، زبردست عالم دین، عظیم مصنف، صاحب فتاویٰ، مناظر جلیل۔ آپ کے لڑکے حکیم مفتی مولانا محمد شعیب ۱۳۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸۵ھ میں رحلت کی چشمۂ رحمت غازی پور میں ۴۵/برس مدرس، صدر مدرس اور مفتی شہر رہے، آپ کے تلامذہ میں

مولانا عبیداللہ بلیاوی متوفی ۱۴۰۹ھ معتمد جماعت تبلیغ تھے، دوسرے لڑکے حکیم مولوی عبدالمجید بن مولانا عبدالعلیم متوفی ۱۳۸۳ھ بڑے ذاکروشاغل تھے۔ تیسرے لڑکے مولانا عبدالباقی ایڈووکیٹ بن مولانا عبدالعلیم اعظم گڈھ میں وکالت کرتے رہے، ۱۹۴۷ء کے پہلے الیکشن میں ایم، ایل، اے ہوئے، وکالت پر مولویت غالب رہی قاضی جی کو ایسا علمی و دینی ننہال ملا تھا، وہ خود لکھتے ہیں کہ درحقیقت میرا علمی سرمایہ ننہال کی دین ہے اور وہیں سے میں نے یہ دولت پائی ہے۔

تعلیم

قرآن کریم کی ابتدائی تعلیم گھر پر والدین سے پائی پھر مدرسہ احیاء العلوم میں منشی اخلاق احمد متوفی ۱۴۰۴ھ سے ریاضی پڑھی۔ کبوتر بازی کی وجہ سے ناغہ کرنے لگے تو والد محترم نے خوب مارا اور گھسیٹ کر مدرسہ لے گئے پھر باقاعدہ مدرسہ جانے لگے اور ایسا شوق ہوا کہ اردو کتابیں تلاش کر کے جمع کرنے لگے، مولانا نعمت اللہ مبارکپوریؒ متوفی ۱۳۶۲ھ فارسی پڑھی ۔اور نسخ و نستعلیق خطاطی سیکھی ،مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوری متوفی ۱۴۰۴ھ سے عربی کی اکثر کتابیں پڑھیں ۔مولانا شکراللہ صاحب مبارکپوری متوفی ۱۳۶۱ھ سے منطق وفلسفہ کی کئی کتابیں پڑھیں منطق کی بعض کتابیں مولانا بشیر احمد مبارکپوری متوفی ۱۴۰۴ھ سے پڑھیں مولانا محمد عمر صاحب مبارکپوری متوفی ۱۴۱۵ھ سے جلالین وغیرہ پڑھی اور ماموں مولانا محمد یحییٰ رسولپوری متوفی ۱۳۸۷ھ سے عروض وقوانی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے، نحومیر اور علم الصیغہ پڑھنے کے بعد قوت مطالعہ سے جمعہ کا خطبہ سمجھنے لگے، مقامات حریری پڑھنے کے بعد ایسی نظر پیدا ہوئی کہ درسی وغیر درسی کتابیں سمجھ میں آنے لگیں، آپ شرائطِ دورہ تک تمام کتابیں احیاء العلوم مبارکپور میں پڑھیں، ہمہ وقت درسی وغیر درسی کتب کے مطالعہ میں مصروف رہتے، پڑھنے کے وقت بعض کتابیں طلبہ کو پڑھانے بھی لگے تھے، ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں جا کر دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ بخاری شریف، ابوداؤد، ابن ماجہ، مولانا سید فخرالدین احمد صاحب متوفی ۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) سے ترمذی مولانا سید محمد میاں

صاحب متوفی ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء سے اور مسلم شریف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلیؒ سے پڑھی ۔ ۱۳۵۴ھ میں بھی صرف دو ماہ جامعہ قاسمیہ میں آپ رہے، اس وقت مولانا سید محمد میاں صاحب سے دیوان حماسہ باب اول اور مقامات زمخشری پڑھی ان کے خلوص وتوجہ نے بڑی حوصلہ مندی اور ہمت افزائی کی۔

شاعری

آپ ایک قادرالکلام شاعر تھے اور برجستہ گو تھے، شاعری میں کوئی استاد نہ تھا، طلب علم ہی کے زمانہ میں آپ کی نظمیں ''الفرقان'' بریلی ۱۳۵۷ھ رسالہ ''قائد'' مراد آباد ۱۳۵۷ھ میں شائع ہونے لگیں ، بعد میں لاہور کے اخبار ''زمزم'' اخبار ''مسلمان'' اخبار ''کوثر'' وغیرہ میں بکثرت اشعار چھپے اور یہی بسلسلہ صحافت امرتسر لاہور اور بمبئی لے جانے کے سبب بنے ، شاہنامہ کے طرز پر اصحاب صفہ کے نام سے ایک منظوم رسالہ ۲۲۵، اشعار پر مشتمل لکھا جسے ۱۳۵۹ھ میں شباب کمپنی بمبئی نے طبع کرنے کیلئے لیا مگر گم ہوگیا، بعد میں جب حالات نے آپ کو صحافی اور مصنف بنا دیا تو شاعری ترک کردی۔

مضمون نگاری

ابتدائی عربی درجہ میں ابھی پڑھ رہے تھے کہ مضمون نگاری شروع کردی ، پہلا مضمون بعنوان ''مساوات'' رسالہ ''مومن'' بدایوں ۱۳۵۳ھ میں طبع ہوا۔ احیاء العلوم میں جمعیۃ الطلبہ قائم ہوئی جس کا ماہوار قلمی رسالہ ''الاحیاء'' جاری ہوا، اس کے مدیر آپ بنائے گئے ۔ انجمن میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں اور علمی وادبی رسائل واخبارات منگائے گئے ان سب کا بالاستیعاب آپ نے مطالعہ کیا ، پھر کئی مضامین رسالہ ''پیام تعلیم'' دہلی ، اخبار الجمعیۃ دھلی ، رسالہ ''مومن'' بدایوں ، ہفتہ وار ''العدل'' گوجرانوالہ، پنجاب میں چھپے ، پھر مستقلاً رسالہ ''قائد'' مراد آباد میں چھپنے لگے ایک بار مضمون نگار کا نام مولانا قاضی عبدالحفیظ صاحب اطہر مبارکپوری فاضل دیوبند لکھ کر آیا تو آپ نے جواباً لکھا کہ میں ابھی طالب علم ہوں ۔ ہدایہ وغیرہ پڑھتا ہوں، بعد میں آپ کے مضامین ملک کے معیاری مجلّات ورسائل ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڈھ ''برھان'' دہلی ، ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند وغیرہ میں چھپنے

لگے یہاں تک کہ بعض رسائل کی مجلس ادارت میں آپ شامل کر لئے گئے، ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی کے عرصہ دراز تک مدیر تحریر رہے اخیر عمر میں آپ کی زیر سرپرستی ماہنامہ ''انوار العلوم'' جہانا گنج جنوری ۱۹۹۶ء سے جاری ہوا۔

صحافت

صحافت اور اخبار نویسی میں آپ کی عمر کا بیشتر حصہ صرف ہوا۔اس سلسلہ میں پہلے امرتسر گئے پھر لاہور جا کر اخبار ''زمزم'' کے کالموں کو مزین کیا، تقسیم ہند کے بعد لاہور چھوڑنا پڑھا تو بہرائچ جا کر ''انصار'' میں کام کیا۔اس کے بعد بمبئی گئے تو اخبار ''انقلاب'' کے کالموں کو سجایا اور ماہنامہ ''البلاغ'' کی ادارت سنبھالی اور اخیر میں شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے نگراں مقرر ہوئے اس اکیڈمی سے آپ کی چند کتابیں شائع ہوئیں۔صحافت کے دوران کسی نہ کسی درجہ میں تدریسی و تصنیفی مشغلہ بھی جاری رکھا۔

تدریس

ابھی آپ عربی درجات میں پڑھ رہے تھے کہ طلبہ کو بعض کتابوں کا درس دینے لگے ،فراغت کو بعد احیاء العلوم مبارکپور میں درس دیا۔یہیں احقر نے ۱۳۶۶ھ میں آپ سے مقامات حریری پڑھی، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں کچھ دنوں تک استاذ الادب والتاریخ تھے جبکہ وہاں شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار صاحب معروفی متوفی ۱۴۰۹ھ اور مولانا اسلام الحق صاحب کو پا گنجی، متوفی ۱۳۹۲ھ بھی مدرس تھے۔ممبئی میں بھی آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں۔دیوبند میں سال میں چند مرتبہ،دو،دو ہفتہ کیلئے جاتے تھے تو طلبۂ دارالعلوم آپ سے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے،احقر محرم ۱۴۱۱ھ میں دیوبند گیا تو مہمان خانہ کے ایک کمرہ میں طلبہ کو پڑھاتے ہوئے دیکھا،درس و تدریس میں آپ روحانی سکون پاتے تھے۔ مبارک پور میں الجامعة الحجازیه قائم کیا جس کے بانی و مہتمم آپ ہی تھے۔

وعظ وخطابت

اصلاحی تحریکات، دینی اجلاس، سیاسی اسٹیج اور مدارس اسلامیہ کے جلسوں میں سیر

حاصل تقریریں کیا کرتے تھے۔ جلدی جلدی بولتے تھے۔ آواز بھی پست تھی اس لئے بعض الفاظ دب جاتے تھے۔ مگر بیان مؤثر اور دلنشیں ہوتا تھا، تقسیم سے پہلے جمعیۃ العلماء کے اسٹیج سے انگریزوں کے خلاف بہت گرم تقریریں کیا کرتے تھے۔

تصنیف وتالیف

۱۔ تصنیفی وتالیفی کارنامے نے آپ کی شہرت ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں پھیلادی۔ آپ کے علمی مقام کی بلندیوں کی طرف سر اٹھانے میں بڑے بڑے اہل علم کی ٹوپیاں گر جاتی ہیں، متعلمی کے دور ہی میں آپ نے پانچ کتابیں لکھیں، فراغت کے چار سال پہلے ۱۳۵۵ھ میں سب سے پہلی کتاب عربی زبان میں قصیدہ بانت سعاد کی شرح **خیر الزادفی شرح بانت سعاد** لکھی، جو غیر مطبوعہ آپ کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۔ دوسری کتاب بھی عربی میں **مر آۃ العلم** نامی لکھی جو غیر مطبوعہ موجود ہے۔

۳۔ ائمہ اربعہ کے نام سے ایک مختصر جامع کتاب لکھی جسے شائع کرنے کیلئے سلطان کمپنی ممبئ نے لیا پھر اس کا مالک پاکستان چلا گیا۔ اس کا مسودہ بھی گم ہوگیا۔ بعد میں اسے دوبارہ لکھا جسے شیخ الہند اکیڈمی نے شائع کیا۔

۴۔ صحابیات کے سبق آموز واقعات الصالحات کے نام سے مرتب کیا، ملک دین محمد کشمیری بازار لاہور کو چھاپنے کو دیا۔ اسکا مسودہ بھی گم ہوگیا۔

۵۔ اصحاب صفہ کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی، شباب کمپنی ممبئ نے اسے بھی ضائع کردیا، یہ پانچ کتابیں پڑھنے کے زمانہ میں لکھیں۔

۶۔ **رجال السند والهند** (عربی)

۷۔ **العقد الثمین** فی فتوح الہند ومن وردفیھا من الصحابۃ والتابعین (عربی)

۸۔ شرح وتعلیق **جواهر الاصول** فی علم حدیث الرسول (عربی)

۹۔ **الهند فی عهد العباسین** (عربی)

۱۰۔ عرب وہند عہد رسالت میں، اس کا عربی میں ترجمہ کرکے **العرب والهند فی**

عهدالرسالة کے نام سے مصر کے مشہور عالم عبدالعزیز عبدالجلیل عزت نے شائع کیا۔

۱۱۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری نے اس کا بھی عربی میں ترجمہ کر کے **الحکومات العربیة فی الهند** کے نام سے طبع کیا ۶، ۷، ۸، ۹ کتابیں بھی مصر میں طبع ہو کر عالم اسلام، اور بلاد یورپ میں پہونچیں۔

۱۲۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ

۱۳۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۴۔ خلافت بنی امیہ اور ہندوستان

۱۵۔ مآثر ومعارف

۱۶۔ تعلیمی وتبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں

۱۷۔ علی وحسین

۱۸۔ اسلامی نظام زندگی

۱۹۔ مسلمان

۲۰۔ طبقات الحجاج

۲۱۔ حج کے بعد

۲۲۔ معارف القران

۲۳۔ افادات حسن بصریؒ

۲۴۔ تذکرۂ علماء مبارک پور

۲۵۔ ائمہ اربعہ

۲۶۔ بنات الاسلام

۲۷۔ خیر القرون کی درس گاہیں

۲۸۔ خلافت عباسیہ اور ہندوستان

۲۹۔ تدوین سیر ومغازی

۳۰۔ اسلامی شادی

پاکستان میں

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ آپ کی پانچ کتابیں مصر میں طبع ہوئیں۔اسی طرح پاکستان کے نیم سرکاری ادارہ تنظیم فکر ونظر سندھ نے ۱۹۸۶ء میں آپ کی پانچ کتابیں اعلیٰ پیمانہ پر شائع کرکے ان کی افتتاحی تقریب میں آپ کو بلایا، زیر صدارت وزیراعلیٰ سندھ عظیم الشان اجلاس ہوا، پاکستان کے بڑے بڑے دانشوروں اور ریسرچ اسکالروں نے آپ کی علمی وتحقیقی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو ''محسن سندھ'' کے خطاب سے نوازا۔آپ پاکستان کی علمی ودینی تقریبات میں بار بار شریک ہوچکے ہیں صدر پاکستان نے بھی آپ کی علمی خدمات کا اعتراف تحائف وہدایا کے ساتھ کیا اس وقت آپ کی تصنیف ہندو پاک اور ممالک عرب کے تعلقات کے سلسلہ میں مستند مآخذ ہیں جن کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔

حکومت ہند کا اعزاز

۱۶؍مارچ ۱۹۸۵ء میں حکومت ہند کی طرف سے صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے آپ کی علمی وتاریخی تصانیف پر اعزازی ایوارڈ عطا کیا۔احقر نے اس کی منظوم تاریخ لکھ کر آپ کے بھیج دی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم المجید المتین
۱۴۰۵ھ

قاضی اطہر تو اک بحر ہے بیکراں !
اھل علم وحکومت کو تسلیم ہیں !
تیرا موضوع ہندوعرب رابطہ
ہو مبارک حکومت کا ایوارڈ
جشن ایوارڈ کا لکھ دے عثمان سنہ

بہ جشن زیبا قاضی اطہر مبارک پوری
۱۹۸۵ء

تیری خدمات علمی بروں از بیاں
تیری تصنیف وتالیف کی خوبیاں
تو مؤرّخ ہے اسلام کا نوجواں !
تمغہء علم وعزت کا روشن نشاں
وسعت کلک کا تو ہے سیل رواں

۱۴۰۵ھ

کتب خانہ قاضی

آپ نے لکھا ہے کہ ''تحصیل علم کی دھن کا یہ حال تھا کہ جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم

حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسہ کو جامع ازہر، جامع زیتون، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ مدرسہ مستنصریہ بنا لیا، ہر وقت بغداد و بخارا، اندلس وغرناطہ، اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہیں اور ان کے اساتذہ وتلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کے حسنات وبرکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا'' چنانچہ اردو پڑھنے کے وقت سے ہی آپ نے کتابوں کی فراہمی شروع کردی، خود لکھتے ہیں کہ کتابوں کے ذوق وشوق کی وجہ سے بعد میں میرے پاس امہات کتب کا ایک عظیم الشان ذاتی کتب خانہ بن گیا۔ جس میں عربی زبان کی نادر و نایاب مطبوعات ومخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اب اس کے رکھنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ اسی کتب خانہ میں بیٹھ کر آپ نے وہ شاہکار تصنیفی کام کیا جو دنیا کے سامنے نمایاں ہے، قلمی کتابوں میں بہت سی کتابیں خود آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ احقر نے آپ کے کتب خانہ کی بعض کتابوں، طبقات ابن سعد وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔

تنگی وفراخی

آپ کی ابتدائی زندگی نہایت عسرت وتنگی میں گزری، ابھی آپ اٹھارہ برس کے تھے۔ کافیہ پڑھ رہے تھے کہ والدہ محترمہ رحلت کر گئیں، تین بھائی ایک بہن میں بڑے آپ ہی تھے۔ کسب معاش میں والد محترم باہر جانے لگے، بات یہ ہونے لگی کہ آپ کی تعلیم بند کر کے ذریعہ معاش میں آپ کو بھی لگا یا جائے مگر آپ نے بڑے عزم واستقلال سے تعلیم بھی جاری رکھی اور خانگی امور بھی خوب جانفشانی سے انجام دیئے۔ کتابوں کی فراہمی کیلئے جلد سازی شروع کردی، تجلید کا سامان پاپیادہ شہر اعظم گڈھ سے لاتے، آمد و رفت بارہ میل کی مسافت چند گھنٹوں میں طے کر لیتے، اس طرح پیسہ جمع کر کے آہستہ آہستہ کتابیں خریدیں، اسی تنگدستی کی وجہ سے تحصیل علم کے لئے باہر نہ جا سکے، دورہ حدیث کے لئے صرف ایک سال ۱۳۵۹ھ میں مراد آباد گئے تو پورے سال میں صرف پچاس روپئے گھر کے خرچ کئے۔ اسی عسرت بھری زندگی میں عمر کا بیشتر حصہ گزرا، صحافت واخبار نویسی کو ذریعہ

معاش بنا کر علمی و تحقیقی تصنیف و تالیف کرتے رہے، پھر خدا نے فراخی بخشی کئی حج کئے اور قصبہ میں صاحب ثروت وحیثیت شمار ہونے لگے۔

ضعف بصر

بچپن میں آپ آشوب چشم میں مبتلا ہوئے۔ نگاہ کمزور ہوگئی، چشمہ لگانے کے عادی ہوگئے۔ کتب بینی نہایت کثرت سے کیا کرتے تھے، کتاب نظر کے بالکل قریب کر کے پڑھتے تھے، آپ کے چشمہ کا پاور بھی بہت زیادہ ہوتا تھا، باوجودان دشواریوں کے لکھنے پڑھنے میں کوئی کمی نہیں کی۔

خوش خلقی وسادگی

آپ ہر شخص سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے، ہر چھوٹے بڑے سے اس کے مرتبہ کے مطابق پیش آتے، وقت ناوقت جب بھی کوئی آپ کے مکان پر جاتا، فوراً چائے ناشتہ اس کے سامنے پیش کرتے، اور تاکید کرتے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ ہمیشہ سادگی کے ساتھ صفائی و ستھرائی کا خیال رکھتے، کتابیں اور ہر ایک سامان نہایت ترتیب اور سلیقہ سے رکھتے۔

دائرہ ملیہ

آپ نے تصنیف و تالیف کے لئے مبارکپور میں ایک ادارہ بنام دائرہ ملیہ قائم کیا، اس ادارہ سے آپ کی چند کتابیں شائع ہویں، ندوۃ المصنفین دہلی اور شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے بھی آپ کی کئی کتابیں شائع کیں، مصر سے بھی پانچ کتابیں آپ کی طبع ہوئیں۔ طبقات الحجاج وغیرہ کئی کتابیں بمبئی سے شائع ہوئیں۔

جمعیۃ علماء

جمعیۃ علماء ہند سے ہمیشہ آپ کا گہرا تعلق رہا، جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے نیز ریاستی دینی تعلیمی بورڈ کے صدر رہے، اکابر دارالعلوم دیوبند سے ہمیشہ گہرا رابطہ رکھا۔

مرض الوفات

ناک کے اندر کوئی زخم تھا۔ اعظم گڈھ میں اس کا آپریشن کرایا، کافی مقدار میں خون

نکلا، ضعف بہت بڑھ گیا، بخار آتا جاتا رہا، علاج جاری تھا، غالباً جمادی الاخریٰ ۱۴۱۶ھ
پھر ۹؍شعبان کو، اس کے بعد ۲۲؍محرم ۱۴۱۷ھ کو احقر آپ سے ملنے کے لئے حاضر ہوا، ہر
بار پورے نشاط سے دیر تک باتیں کیں، الماری سے کئی کتابیں نکال کر دکھائیں، میں نے
عرض کیا کہ اب میں آپ کی سوانح مرتب کروں گا؟ فرمایا کہ میرے حالات کچھ لکھے ہوئے
ہیں۔ لیکن مصر وغیرہ کے میرے نام عربی میں کئی اہم خطوط ہیں، ان کو مرتب کرنا ہے۔ میں
جوں ہی کچھ صحتمند ہوا، ان کو مرتب کرنے کیلئے خط لکھ کر چندروز کے لئے تم کو مبارکپور بلاؤں
گا، میں نے "سیرت الرسول" نامی ایک کتاب مرتب کی ہے، اس پر تقریظ لکھنے کی
درخواست کی، کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے، تقریظ لکھنے کا وعدہ کیا، میں نے اس کی یاد
دہانی کا ایک خط لکھا تو اسکے جواب میں ۲۴؍رمضان ۱۴۱۶ھ کو آپ کا مکتوب موصول ہوا۔

"عزیز گرامی! السلام علیکم ورحمة الله و برکاتهٗ!

کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے وعدہ کیا ہے، اس کو کیسے پورا کروں، اسی
درمیان میں پرسوں آپ کا خط ملا، افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ اب تک میں لکھنے پڑھنے
کے لائق نہیں ہوسکا ہوں، اس لئے اب کے بار آپ کی کتاب پر کچھ لکھنے سے معذور ہوں،
حالانکہ اس پر کچھ لکھنا سعادت مندی کی بات تھی۔ میری صحت کے لئے دعاء کی درخواست
ہے۔

والسلام
قاضی اطہر مبارکپوری

وفات حسرت آیات

یکشنبہ ۲۷؍صفر ۱۴۱۷ھ ۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء کا دن گزار کر شب میں دس بجے جوارِ
رحمت میں پہنچے دوسرے روز دوشنبہ کو ۳؍بجے دن میں میں مفتی ابوالقاسم صاحب شیخ
الحدیث جامعہ اسلامیہ بنارس و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی، بنارس
، جونپور، اعظم گڈھ، مئو، غازیپور، گورکھپور، وغیرہ کے علماء کرام وفضلاء عظام کے عظیم مجمع
میں نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی۔ ☆☆☆☆☆☆☆☆

اہل حرمین سے ملاقاتیں

ہندوستانی علماء کرام جو زندگی بھر علوم دینیہ کو عربی زبان میں پڑھتے پڑھاتے ہیں، چونکہ انھیں عربی میں گفتگو کرنے کی مزاولت نہیں ہوتی، اس لئے حج کے موقع پر گو کہ ان کی ملاقاتیں عرب علماء سے ہوتی ہیں، لیکن عربی گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار خیال نہیں کر پاتے، اوران کا علم اوران کی ذہانت ''کنز مخفی'' بن کررہ جاتی ہے، اس بات کا احساس اکثر وبیشتر علماء کو رہا کرتا تھا۔

اسی تأثر کا اظہار محترم احمد غریب صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا تھا، قاضی صاحب جب حج کو گئے، تو وہ عرب علماء سے بے تکلفانہ ملے، ان سے کھل کر اظہار خیال کیا، کیونکہ عربی لکھنے اور بولنے کا انھیں ملکہ تھا۔ اس سے عرب علماء متأثر ہوئے، قاضی صاحب نے اپنے اس مضمون میں اسی کی داستان بیان فرمائی ہے۔

فروری کے ''البلاغ'' میں محترم احمد بھائی صاحب کا ایک خط ''مکتوب مکہ مکرمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے ہند و پاکستان کے علماء کے عربی میں بات چیت نہ کرنے پر اظہار خیال فرمایا ہے(۱)، ان کی علمی و دینی حمیت

(۱) بہت دنوں سے قاضی اطہر صاحب کی کچھ خبر نہیں، دو ہفتہ قبل مدینہ منورہ میں ان کے صاحبزادے مولوی خالد کمال سے ملاقات ہوئی تھی، ماشاء اللہ دینی معلومات میں کافی ترقی کرلی ہے اور ہمارے یہاں کے علمائے کرام وفضلائے عظام میں عربی بول چال کی جو کمی محسوس کر رہا تھا، انھوں نے وہ کمی بہت اچھی طرح پوری کرلی ہے، عربی میں گفتگو بہت اچھی طرح کرلیتے ہیں اور اس چیز کی مجھ جیسے خادم علماء کو کھٹک رہتی تھی، ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے یہاں ایک دعوت کی، جس میں چار پانچ ہندوستان و پاکستان کے علماء کو مدعو کیا، اسی موقع پر یہاں کے علماء کو بھی دعوت دی، عربی وعجمی دونوں پارٹیاں علٰیحدہ علٰیحدہ معلوم ہوتی تھیں، کیونکہ اپنے علماء عربی میں گفتگو پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مولانا علی میاں اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں، اسی طرح پاکستان کے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی عربی میں گفتگو پر قدرت رکھتے ہیں۔

نے ہمیشہ یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی ہے کہ ہمارے علماء عربی زبان حاصل کرنے اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مدت العمر رہنے کے باوجود اس پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے عرب علماء کے سامنے بے زبان بن جاتے ہیں، جس کی وجہ سے بڑی حد تک دیار عرب کے علماء ہندوستانی علماء کو کچھ یوں ہی سا سمجھتے ہیں، جو شخص کسی زبان کو زندگی بھر پڑھے پڑھائے وہ بہر حال اس میں بات چیت کرنے پر کچھ نہ کچھ قدرت رکھتا ہوگا، اگر نہیں رکھتا تو اسے رکھنا چاہئے، موصوف نے جب اپنے حلقہ کے ایک طالب علم (عزیزم خالد کمال مبارکپوری) کو اس معاملہ میں چند ہی سالوں میں مدینہ منورہ میں رہ کر بہت آگے پایا تو اپنے ذوق میں ایک اہتزاز اور نشاط محسوس کرتے ہوئے اس کا نہایت اچھے انداز میں اظہار فرمایا، اور ہمت افزائی کی، محترم احمد بھائی صاحب کی ان ہی چند سطروں پر تعلیق کے طور پر یہ معروضات پیش کی جارہی ہیں ،اس میں گزشتہ سال کے سفر حج کے کچھ سفر پارے بھی ہیں اور عربی زبان میں بات چیت کرنے کے تجربات بھی۔

ہندوستان کے عام علماء کی عربی گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول میں اس کو رواج نہیں دیتے اور عمر بھر پڑھنے پڑھانے کے بعد بھی جب عربی میں گفتگو کی بحث آتی ہے تو ''هٰذا شئٌ دیگرٌ '' کہہ دیتے ہیں، ورنہ ان ہی عالموں میں جن کو تھوڑا بہت سابقہ پڑجاتا ہے، وہ چند ہی دنوں میں اس پر قادر ہو جاتے ہیں اور ہر موضوع پر نہایت بے تکلفی سے عربی میں بات چیت کرتے ہیں۔

راقم کو نہ عربیت کا دعویٰ ہے، نہ عربی دانی کا زعم ہے اور نہ ہی عربی زبان میں زیادہ گفتگو کرنے کا سابقہ ہی پڑا ہے، مگر بمبئی میں رہ کر مختلف عرب ممالک کے علماء، ادباء، قراء، ارباب حکومت، اہل دُول اور تجار وعوام کے ساتھ بسا اوقات عربی میں گفتگو کرنے کا سابقہ پڑا، ابتداء میں جھجک اور جھینپ محسوس ہوتی تھی اور میں نیک

صورت بن کر نــعــم کہہ دیا کرتا تھا، مگر آخر کب تک یہ بات باقی رہتی، علمی، سیاسی، تاریخی ہر قسم کی باتیں نکلتی تھیں، اور ان میں حصہ لینا پڑتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ’’کام چلاؤ‘‘ عربی گفتگو پر قدرت ہوگئی، اور الٹے سیدھے بحث ومباحثہ میں حصہ لینا شروع کردیا جس کی وجہ سے جھجک ختم ہوگئی اور زبان بہر حال چلنے لگی۔

پہلی بار ۱۳۷۴ھ میں حج وزیارت کی دولت نصیب ہوئی تھی، اس زمانہ میں بھی علمی اور دینی طبقہ سے بات چیت میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی، اور ہر جگہ کام چلتا رہا، اور گذشتہ سال ۱۳۸۵ھ میں حاضری ہوئی تو گویا کوئی بات ہی نہیں تھی، جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کہیں بھی کسی حلقہ میں ایسا نہیں ہوا کہ گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے خاموشی رہی ہو، یہ دوسری بات ہے کہ برمحل اور برجستہ گفتگو میں عربیت کے ابرو پر بل آجاتا رہا ہو، اس کی نفسیاتی وجہ یہ تھی کہ اب کے بار عزیزم خالد کمال سلمہٗ متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے تعارف وتعلق اور ’’رجال السند والہند‘‘ کے مطالعہ کی وجہ سے اکثر مشائخ اور علماء پہلے ہی سے یاد فرماتے تھے اور ملنے کے خواہشمند تھے، ان سے زیادہ راقم اپنے ان نادیدہ بزرگوں اور حسن ظن رکھنے والے ارباب صفا سے نیاز حاصل کرنے کی تیاری کرکے گیا تھا، نیز راقم کا ایک مقالہ عربی زبان میں ’’مــن النــار جيل إلى النخيل ‘‘حکومت ہند کے عربی سہ ماہی مجلّہ ’’ثقافة الهند‘‘ میں تین قسطوں میں چھپ چکا تھا جس کی زائد کاپیاں جدہ کے ہندوستانی سفارت خانہ کے آفیسروں نے طلب کرکے سعودی عرب کے صحافیوں، ادیبوں اور عالموں کو پیش کیا تھا، اس مقالہ میں عرب اور ہندوستان کے ابتدائی اسلامی تعلقات کو جغرافیہ، رحلات اور تاریخ کی کتابوں سے بیان کیا گیا تھا، یہ مقالہ سعودی عرب کے علمی اور تحقیقی حلقہ میں بہت زیادہ پسند کیا گیا، بلکہ سعودی عرب کے سب سے مشہور اور قدیم صحافی ومؤرخ الاستاذ عبدالقدوس الانصاری نے پورا مقالہ چار قسطوں میں اپنے

مجلّہ ''المنہل'' جدہ میں نہ صرف شائع کیا بلکہ اس پر جگہ جگہ تعلیقات لکھیں، نیز ہندوستانی سفیر محترم کامل قدوائی صاحب، فرسٹ سیکریٹری محترم سید شہاب الدین صاحب، محترم مولانا خالد صاحب اور عزیز گرامی فضل الرحمٰن صاحب نے وہاں کے ادیبوں اور صحافیوں سے تذکرہ کیا کہ اس سال فلاں آدمی آرہا ہے، وہ سب حضرات ملاقات کے خواہش مند تھے، راقم کو ہندوستان ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ سفارت خانہ کے ارکان اس مقالہ کی وجہ سے، نیز عزیزم خالد کمال سے تعلق وتعارف کی وجہ سے میری حاضری کے منتظر ہیں، ان باتوں کی وجہ سے راقم کو ضغطہ اور احساس کمتری کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے تشکر وامتنان کی فضا میں ادھر بھی امنگ اور خواہش تھی کہ اب کے حجاز مقدس کے علماء، مشائخ اور ارباب علم سے کھل کر تبادلۂ خیالات کرنا چاہئے، چنانچہ اس انشراح وانشباط نے اور بھی ہمت افزائی کی، اور جدہ اترتے ہی اس کا سلسلہ شروع ہوگیا، میں ابھی کسٹم ہاؤس کے باہر ہی تھا کہ جناب خالد صاحب ملے اور انداز سے پہچان کر نام دریافت کیا میں نے بتایا تو بڑی محبت سے لپٹ گئے اور انتظار کا تذکرہ کیا، اتنے میں کامل قدوائی صاحب تشریف لائے اور تعارف ہوتے ہی پان پیش فرمایا، اور نہایت حسن خلق سے ملے، ادھر خالد صاحب نے محترم سید شہاب الدین صاحب سے جاکر کہا کہ میں ایک خاص آدمی سے مل کر آیا ہوں انھوں نے جھٹ میرا نام لے کر پوچھا کہ فلاں صاحب ہونگے، پھر وہ بھی فوراً تشریف لائے، اور بڑی محبت سے ملے، تقریباً ان سب حضرات نے ''من النار جیل الی النخیل'' والے مقالے کا تذکرہ کیا، اور یہ کہ یہاں کے اہل علم آپ سے ملنا چاہتے ہیں، یہ باتیں بالکل ہنگامی تھیں، رات بھر جدہ میں رہکر کل مکہ مکرمہ جانا تھا، پھر خالد کمال کی والدہ کی وجہ سے ایک گونہ پابندی بھی تھی، وہ بھی ایک دو دن پہلے مدینہ منورہ سے جدہ آگئے تھے۔

چونکہ آخری جہاز مظفری سے روانگی ہوئی تھی اور ایام حج قریب تھے، اس لئے اصل کام میں مصروفیت رہی جس کیلئے حاضری ہوئی تھی، اس درمیان میں مختلف ممالک کے اہل علم اور مشائخ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، عزیزم خالد کمال حج کے بعد دس بارہ روز تک ساتھ رہے، ان کے ہمراہ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے دفتر میں آتا جاتا رہا، نیز شیخ سید علوی مالکی اور دوسرے مشائخ سے ملاقات ہوتی رہی، ان کے مدینہ منورہ چلے جانے کے بعد قیام مکہ مکرمہ کے زمانہ میں بارہا ''رابطۃ العالم الاسلامی'' میں حاضری ہوئی، تنہا بھی اور بعض دوسرے ہندوستانی احباب کے ساتھ بھی، عام طور سے مجلّہ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے ایڈیٹر شیخ محمد سعید العامودی اور ان کے دفتر کے دوسرے عملہ سے بات چیت رہا کرتی تھی، رُخ سیاسی اور ملکی ہوا کرتا تھا، اکثر دیگر ممالک سے آئے ہوئے صحافی اور اہل علم بھی رہا کرتے تھے اور سیاسیات پر بحث چھڑ جاتی تھی، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بات میں تیزی آجاتی، راقم کھل کر پورے طور سے ان مباحث میں حصہ لیتا تھا، اور آخر میں ٹیپ کا بند یہ ہوتا کہ یہ باتیں ذاتی اور شخصی ہیں، جب بھی شیخ محمد سعید عامودی کی مجلس سے چلا تو موصوف نے فرمایا کہ پھر کب آئیں گے؟ ہم پھر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ راقم کو بھی جب موقع ملتا پہونچ جاتا، اس مدت میں وہاں کے کئی حضرات سے اچھی خاصی اُنسیت پیدا ہوگئی تھی، رابطہ کے دفتر میں ہندوستان کے بعض حضرات کی ترجمانی بھی کی اور فیجی مسلم لیگ کے سکریٹری جناب بہادر علی صاحب کو ساتھ لے جاکر رابطہ کی طرف سے فیجی میں اسلام اور مسلمانوں کی ضرورت کیلئے ہر قسم کے تعاون کی بات چیت کرائی، اس مدت میں متعدد بار شیخ سید علوی مالکی کے مکان (قرارہ میں) حاضری ہوئی تھی، وہ مکہ مکرمہ کے نہایت ذی علم حضرات میں سے ہیں۔ اور ہر وقت باغ و بہار رہتے ہیں، پہلے سفر حج میں بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی، اب کے بار تو نہایت گہری ملاقاتیں رہیں، آخر میں مدینہ منورہ

روانگی کے وقت ملاقات نہ ہوسکی، جس کی شکایت ان کے صاحبزادے نے مدینہ منورہ میں خالد کمال سے کی کہ والد محترم ان کا انتظار کررہے تھے اور تصانیف ہدیہ دینے کیلئے رکھا تھا، نیز مکہ مکرمہ میں مکتبہ الحرم میں جانا ہوا تھا، جب مکتبہ الحرم پہونچا تو اس کے مدیر و شیخ سے بات چیت ہونے لگی موضوع ہندوستان کی وہ علمی و تاریخی کتابیں تھیں جو عہد قدیم سے لے کر آج تک حرمین شریفین کی تاریخ پر لکھی گئیں ہیں، احقر نے بتایا کہ فلاں تاریخیں ہندوستانی علماء کی مطبوعہ ہیں اور فلاں فلاں غیر مطبوعہ ہیں، جن میں سے بعض کا قلمی نسخہ ہمارے پاس ابتک محفوظ ہے، انھوں نے اس گفتگو کی بڑی قدر کی اور فرمایا کہ یہ باتیں عام ہونی چاہئیں، پھر انھوں نے ایک عربی روزنامہ کے مدیر کو فون کیا کہ فلاں کو میں روانہ کرتا ہوں آپ ان سے انٹریو لے کر کل کے اخبار میں شائع کردیں، مگر اتفاق سے ایڈیٹر صاحب موجود نہیں تھے، اور انھوں نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے عصر کے بعد بلایا کہ میں آپ کے ساتھ اپنا آدمی کردوں گا، آپ یہ باتیں ایڈیٹر سے کرلیں تاکہ ان معلومات سے یہاں کے اہل علم بھی واقف ہوں، میں ان کے وعدہ پر گیا مگر وہ اتفاق سے اس وقت نہیں مل سکے، پھر نہیں جاسکا، حالانکہ اس کیلئے بہت سے حضرات کوشش کرتے ہیں کہ عربی اخبارات میں ان کا انٹریو اور بیان آجائے۔ مدرسہ صولتیہ میں بار بار حاضری ہوتی تھی جہاں ہندوستانی اور عرب علماء سب ہی ہوتے تھے، مولانا محمد سلیم صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد شمیم صاحب بہت زیادہ خیال فرماتے تھے۔

۸/محرم ۱۳۸۶ھ کو مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی اور ایک ماہ تک یہاں قیام کی سعادت نصیب ہوئی، مدینہ منورہ گویا گھر تھا، ہر وقت جامعہ کے ہندوستانی پاکستانی طلباء، وہاں کے اہل علم اور مشائخ سے ملاقاتیں کتب خانہ شیخ الاسلام میں حاضری نماز اور صلوٰۃ وسلام کے بعد کے مشاغل تھے، عزیزم خالد کمال سلمہٗ نے مدینہ منورہ کے ہر

دینی و علمی حلقہ میں تعلق پیدا کر رکھا ہے، اور ہر کوچہ وگلی کے حضرات ان سے آشنا و مانوس ہیں اس لئے شہر کے بہت سے اہل علم سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، ۱۴ر محرم کو الشیخ محمد بن ابراہیم العبودی امین عام جامعہ اسلامیہ نے رات کو کھانے پر بلایا، جہاں الشیخ عمر افریقی اور دوسرے بعض مشائخ بھی مدعو تھے، کھانے کے بعد تین گھنٹہ تک مجلس جمی رہی اور مختلف علمی و دینی موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی، یہ محفل بہت ہی دلچسپ اور علمی و معلوماتی تھی، شیخ عبودی نے دریافت فرمایا کہ آپ نے یہ عربی کہاں سیکھی ہے؟ میں نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان اور اسلامی علوم بڑے اہتمام سے پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ وہاں باہمی گفتگو کا موقع نہیں ملتا اس لئے وہاں کے علماء آپ لوگوں کے سامنے گونگے بہرے بنے رہتے ہیں، اور آپ حضرات خیال کرتے ہیں کہ یہ بولی سے ناواقف مذہبی علماء ہیں، بات یہ ہے کہ میں نے بمبئی میں عربوں سے ملنے جلنے کیوجہ سے تھوڑا بہت عربی بولنا سیکھ لیا ہے، جس کی وجہ افہام و تفہیم میں دقت نہیں ہوتی، ۱۷ر محرم کو استاذ شیخ عمر افریقی مساعد امین عام جامعہ اسلامیہ نے عشاء کے بعد کھانے کی دعوت دی، ان کے یہاں افریقہ اور سوڈان وغیرہ کے دو تین علماء تھے، یہاں دو گھنٹہ سے زائد مجلس رہی اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، ان حضرات کی مجلس میں کھل کر نہایت بے تکلفی سے دوستانہ انداز میں گفتگو رہی، ۱۶ر محرم کو جمعہ کی نماز کے بعد حضرت الشیخ عبدالعزیز بن باز نائب الرئیس جامعہ اسلامیہ نے کھانے پر بلایا، یہاں بھی گھنٹوں گفتگو رہی، شیخ نے یہاں کے علماء کا علمی اور دینی حال دریافت کیا، سلسلۂ کلام میں بعض تاریخی مباحث پر گفتگو نکلی اور بعض کتابوں کے بارے میں بات چیت رہی، شیخ ابن باز پوری مملکت میں بڑے معزز و محترم مانے جاتے ہیں اور بڑے باوقار ہیں، مگر نجی مجلسوں میں بے تکلف نظر آتے ہیں، یہاں بھی شیخ عبودی اور کئی مشائخ شریک تھے، محترم الشیخ سید محمود

الطرازی مدنی سے پرانی ملاقات تھی ، ایک دن ان کے یہاں ناشتہ کی دعوت رہی ، ہندوستان کے طلباء نے بڑے ذوق وشوق اوراخلاص سے دعوتیں کیں، عزیزان مولوی امیر احمد صاحب رامپوری، مولوی ہلال احمد مبارکپوری، مولوی نعمان صاحب بہاری، مولوی جمیل احمد صاحب بہاری، مولوی سعود صاحب، شیخ سعدالدین صاحب ملیباری ، استاذ جامعہ اسلامیہ وغیرہ نے کھانے ، ناشتے اور چائے کی دعوتیں کیں ، جامعہ اسلامیہ میں شیخ عبدالقادر سیبۃ الحمد کے درس میں شرکت رہی، بعد میں تقریباً روزانہ ہی ان سے مسجد نبوی میں مختلف موضوعات پر گفتگو رہا کرتی تھی، ان مواقع پر اکثر جامعہ کے ہندستانی اور پاکستانی طلباء بھی رہا کرتے تھے، اخوان المسلمین کے کئی سرگرم حضرات سے اکثر گھنٹوں گھنٹوں مسجد نبوی میں اخوان اور حکومت مصر کے موضوع پر بات چیت ہوا کرتی تھی، میں جامعہ اسلامیہ کے کتب خانہ میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا، کئی اساتذہ بھی تھے، ایک عرب استاذ نے باتوں باتوں میں فقہی مسلک کے متعلق کہہ دیا کہ احناف حدیث کے مقابلہ میں رائے پر عمل کرتے ہیں اس پر راقم نے جم کران سے گفتگو کی اور کہا کہ میں حنفی ہوں کوئی ایک مسئلہ ایسا بتائیے کہ جن میں میں حدیث کے مقابلہ میں رائے پر عمل کرتا ہوں، یہ گفتگو مناظرانہ انداز کی تھی، دوسرے اساتذہ خاموش مسکرا رہے تھے، اور دونوں کی گفتگوئیں سن رہے تھے، اسی طرح ایک ملیباری صاحب جو جامعہ میں کسی شعبہ سے متعلق ہیں، ان سے میں نے کہا کہ آپ عربی یا ملیباری زبان جانتے ہیں، افسوس کہ آپ ہندستانی ہیں مگر اردو نہیں جانتے، اس پر انھوں نے کہا کہ ہم کو اردو زبان کی ضرورت ہی نہیں ہے، دینی زبان عربی ہے، دنیاوی زبان ملیباری ہے، اردو کی ضرورت ہی کیا ہے، اس وقت موقع نہیں تھا میں خاموش رہا، مگر کتب خانہ میں جب وہ ملے تو پھر ان سے کھل کر بات چیت ہوئی، اوران کو اپنی اس بات کے بے تکے پن کا احساس ہوا، مسجد نبوی میں ایک روز

مغرب بعد حسب معمول تبلیغی اجتماع ہورہا تھا، میں بھی پاس ہی الگ بیٹھا ہوا تھا، ایک مولوی صاحب ایک عرب طالب علم کو لیکر آئے کہ یہ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں، آپ ان کو سمجھا بتا دیں، میں نے اس کو بٹھایا اور کہا کہ پوچھو کیا پوچھتے ہو، اس عزیز نے انسان کے چاند پر جانے کے بارے میں قرآن وحدیث کی رو سے سوالات کئے، میں نے اسے سمجھانا شروع کیا تو اور لوگ بھی ہندستانی پاکستانی اور عرب حضرات آگئے میں نے اپنی وقتی یادداشت کے مطابق اسے قدیم وجدید انداز میں سمجھایا، آخر میں وہ میرا شکریہ ادا کرتا ہوا یہ کہکر اٹھا کہ اب اس بارے میں میرے شبہات دور ہو گئے۔ دوسرے حضرات بھی اس بحث سے محظوظ ہوئے اور انشراح کا اظہار کیا۔

مولانا سعد الدین صاحب ملیباری استاذ جامعہ اور بعض دوسرے حضرات کی رائے ہوئی کہ میں جامعہ کے طلبہ کے سامنے ہندستان اور عرب کے علمی تعلقات پر کوئی مقالہ پڑھوں یا تقریر کروں، میں اس کے لئے تیار بھی ہو گیا، مگر معلوم ہوا کہ دو ایک دن میں جامعہ کی چھٹی ہونے والی ہے تاکہ طلباء اختبار کی تیاری کریں لہٰذا اگر ایسا ہوتا ہے تو کل پرسوں تک ہو جانا چاہئے کیوں کہ وقت نہیں ہے، اس صورت کی وجہ سے میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر کوئی چیز پیش کی جائے تو ہر اعتبار سے معیاری ہونی چاہئے، یہ نہیں کہ جیسے تیسے ایک مقالہ تیار کر کے سنا دیا جائے، میں سفر میں ہوں مراجعت کے لئے کتابیں نہیں ہیں پھر جلدی میں مقالہ کی تیاری کچھ یوں ہی سہی ہوگی اور اصل موضوع کئی پہلو سے تشنہ رہ جائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ خیال ہی ترک کر دیا جائے، کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ اس قسم کے مقالات کے لئے اچھے اچھے اہل علم وتحقیق مہینوں پہلے سے تیاری کرتے ہیں، معلومات جمع کرتے ہیں، اور الفاظ وعبارت میں تراش خراش کرتے ہیں، تب جا کر ایک معیاری مقالہ تیار ہوتا ہے (چاہے وہ بعد میں ظاہر کریں کہ یہ مقالہ بہت عجلت میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ اس کا رواج بھی ہے)

ایسی حالت میں الٹا سیدھا مقالہ تیار کر کے پیش کر دینا نہ جامعہ کے طلباء کے لئے مفید ہوگا اور نہ اپنے لئے بہتر ہوگا۔ چنانچہ یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس میں اپنی کوئی ہتک نہیں محسوس کی اور نہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوا، کتب خانہ شیخ الاسلام میں تقریباً روزانہ حاضری ہوتی اور مخطوطات ونوادرات سے استفادہ کا موقع ملتا، وہاں مختلف بلاد ومصار کے اور خود مدینہ منورہ کے اہل علم وتحقیق آتے جاتے، ان سے ان کے خصوصی فن اور موضوع پر بات چیت ہوتی، تقریباً روزانہ ہی یہاں کسی نہ کسی نئے صاحب علم سے ملنے کا موقع ملتا۔ ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں کئی اہل علم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور علمی گفتگو کا موقع ملتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ ہندو پاکستان کے چند طلبہ مسجد نبوی میں کہنے لگے کہ ہمارے یہاں کے علماء جب یہاں آتے ہیں اور ہمارے جامعہ کے شیوخ واساتذہ سے ملتے ہیں تو عربی گفتگو پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے تبرک بن کر رہ جاتے ہیں، نہ وہ شیوخ واساتذہ سے تبادلۂ خیال کر پاتے ہیں اور نہ وہ ہمارے علماء سے زیادہ گفتگو کر سکتے ہیں، بلکہ جانبین ایک دوسرے کی برکت حاصل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، صرف مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ان حضرات سے کھل کر ملتے جلتے ہیں اور ہر موضوع پر نہایت واضح انداز میں معاصرانہ گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اس سال آپ یہاں کے اہل علم سے کھل کر ہر موضوع پر بات چیت کرتے ہیں، اور ہر قسم کی بحث اور موضوع میں حصہ لیتے ہیں، پھر اس گفتگو میں مرعوبیت اور جھجک نہیں ہوتی اور یہاں کے اہلِ علم کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان وپاکستان کے اہل علم بھی علم اور مطالعہ رکھتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے یہاں بھی معلومات ہوتی ہیں، اور ان کی اپنی رائے بھی ہوتی ہے جس کے لئے وہ دلائل رکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے معلوم ہوا کہ ہندستانی سفارت خانہ کے عملہ میں محترم سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سکریٹری نے بغیر کسی سابقہ ملاقات یا تعارف کے اور بغیر کسی مقصد کے صرف اخلاص اور محبت کی وجہ سے میری بہت زیادہ آؤ بھگت کی، وہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بار بار ان سے ملاقات رہی۔ اور جب انھوں نے ایک پرتکلف دعوت کی اور مدینہ منورہ کے اعیان حکومت اور اعیان شہر کو بلایا تو راقم کو بھی خاص طور سے دعوت دی، جہاں بہت سے حضرات سے ملاقات اور دیر تک مجلس رہی۔ قیام کے مدینہ منورہ کے دوران میں مولانا انعام کریم صاحب مدرسہ شرعیہ کی خدمت میں بار بار حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ وہ بھی بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے رہے، یہیں پر بخاری شریف کے اس نسخہ کو دیکھا جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے پڑھا تھا اور جگہ جگہ تھوڑے تھوڑے حواشی لکھے تھے، جنۃ البقیع کے قریب رباط مجددیہ میں بھی جانا ہوا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلسلہ کے بزرگوں کی ہے، اس میں حضرت مظہر جان جاناں وغیرہ کے ملفوظات ومکاتیب کے نادر قلمی نسخے دیکھنے میں آئے۔ نیز ایک قرآن شریف دیکھا جو اسی سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، بارہا ایسا ہوا کہ مدینہ منورہ کی ان علمی مجلسوں میں عزیزم خالد کمال ساتھ رہے، اور اساتذہ وشیوخ سے گفتگو کے درمیان کہیں کوئی لفظ بروقت یاد نہیں آیا اور مطلب کی ادائیگی میں دقت محسوس ہوئی تو وہیں باپ نے بیٹے کی طرف مراجعت کرلیا، اور یہ بات بھی ان شیوخ واساتذہ کے نزدیک علمی شان کی ایک ادا بن گئی، اگر دل ودماغ میں معلومات ہوں تو زبان کسی نہ کسی طرح ان کو ادا کر ہی دیتی ہے، اور سننے والے اس کی قدر کرتے ہیں طرز ادا پر نہیں جاتے کیوں کہ مادری زبان کے مقابلہ میں کوئی زبان مافی الضمیر کے ادا کرنے پر کماحقہٗ قادر نہیں ہوسکتی۔

واپسی کے موقع پر جدہ میں راقم کے اعزاز میں ۳ر جون ۶۶ء کو محترم سید شہاب

الدین صاحب نے ایک پر تکلف اور شاندار دعوت اپنی قیام گاہ پر دی، جس میں جدہ اور مکہ مکرمہ کے اکثر صحافی، مدیران جرائد ومجلّات اور ادباء ومصنفین تھے، ان میں شیخ حسین سراج امین رابطہ عالم اسلامی، الاستاذ عبدالقدوس انصاری مدیر مجلّہ ''المنہل''، شیخ محمد احمد جمال مشہور انشاء پرداز ومصنف، شیخ محمد حسین مدیر جریدہ عکاظ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک دن پہلے ہی عربی اخبارات میں اس دعوت کا اور اس میں شرکاء کا اعلان آگیا تھا، عرب کے ان صحافیوں اور ادیبوں کی راقم سے دلچسپی کی بڑی وجہ مقالہ ''من النار جیل الی النخیل'' تھا جسے انھوں نے ''ثقافۃ الہند'' دہلی اور ''المنہل'' جدہ میں پڑھا تھا، مجھے جہاز سے اترتے ہی جدہ میں معلوم ہو چکا تھا کہ استاذ عبد القدوس انصاری میری ملاقات کے بیحد شائق ہیں اور بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں، مگر چونکہ حج کا زمانہ تھا اور مصروفیات غیر معمولی تھیں، اس لئے ان سے اسی دن ملاقات ہوئی، وہ نہایت پرتپاک طریقہ سے پیش آئے، مختلف موضوعات پر ہماری ان کی گفتگو ہوتی رہی، خاص طور سے عرب اور ہندستان کے علمی، دینی تعلقات اور ہندستان کے رجال اشخاص پر جو عرب میں گذرے ہیں، انھوں نے بیحد اصرار کیا کہ آپ دو تین ماہ کے لئے رک جائیں، ہم تمام انتظام کر دیں گے اور آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، مگر چونکہ خالد کمال کی والدہ ساتھ تھیں اس لئے ایسا نہ ہوسکا، انھوں نے اصرار کیا کہ آپ کی جس قدر تصنیفات ہیں عربی یا اردو میں سب کی سب میرے پاس خالد کمال کے ذریعہ بھیجوائیں، میں اپنی تصنیفات اور ''المنہل'' پیش کروں گا۔ چنانچہ راقم کی تمام کتابیں خالد کمال کے ذریعہ پہونچ گئیں، استاذ محمد احمد جمال غزوات نبوی کے سلسلے کے مصنف ہیں، وہ اس بارے میں مؤثر اسلوب نگارش رکھتے ہیں، ان کے مقالات ومضامین سے پہلے سے واقف تھا، قیام مدینہ منورہ کے دوران میں ان کی بعض تصنیفات کے مطالعہ کا موقع ملا، ان سے اسی موضوع پر گفتگو رہی، شیخ حسین

سراج امین عام رابطہ عالم اسلامی چونکہ عالم اسلام کے ایک اہم ادارہ کے ذمہ دار ہیں، اس لئے میں نے ان سے کہا کہ آپ حضرات ایک طرف عالم اسلام کے ربط و تعلق کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے جان و مال کی بازی لگادی ہے جو فی نفسہٖ نہایت مفید اور ضروری کام ہے، مگر دوسری طرف حال یہ ہے کہ حرم محترم میں ہندوستان پاکستان کے بعض اہلحدیث علماء اُردو میں نہایت اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہیں، مقلدین خاص طور سے احناف کے بارے میں نہایت برے الفاظ استعمال کرتے ہیں ان کے ائمہ کو نازیبا اور دلآزار لہجہ میں یاد کرتے ہیں، اور ہر تقریر میں تنگ نظری اور تنگ دلی کا مظاہرہ کر کے نہایت گستاخانہ انداز میں سبُّ و شتم تک کا انداز اختیار کرتے ہیں، جسے ہندوستان کے مرنجان مرنج اہل علم بھی سن کر شدید کوفت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ، مولانا سید عبد الوہاب صاحب بخاری مدراسی اور افضل العلماء مولانا عبدالباری مدراسی اور دیگر علماء ان کی تقریروں کو سن سن کر سخت کوفت محسوس کرتے ہیں۔ آپ عالم اسلام کے ربط واتحاد کے داعی ہیں اور دوسری طرف ہندوستان و پاکستان کے ان تنگ نظر اور مفاد پرست مولویوں کو مسلمانان عالم کے مرکز میں ان کو برا بھلا کہنے اور ان کے خلاف نفرت پھیلانے کی اجازت دیتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جو اپنے کو حکومت اور شیوخ کی نظر میں اچھا ثابت کرنا چاہتے ہیں، کوئی اقامہ چاہتا ہے، کوئی تابعیہ کے چکر میں ہے، کوئی کسی ادارہ میں ملازمت کے حصول کیلئے سرگرداں ہے اور ان کی حرکتوں کو ذمہ دار حضرات ہرگز پسند نہیں کرتے، چنانچہ خود نجد و ریاض کے علماء اہلحدیث اس حرکت کو ناپسند کرتے ہیں، حرم محترم مقلد اور غیر مقلد کا اکھاڑہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ اس طرح کسی مسلک کے خلاف نفرت وحقارت کا مظاہرہ ہونا چاہئے، یہ مسلمانان عالم کو خدا کے گھر میں پا کر برا بھلا کہنا ہوا، ہمارے ان

تأثرات کو شیخ حسین سراج نے سن کر فرمایا کہ فلاں شیخ سے آپ نے اس کا تذکرہ کیا یا نہیں؟ اس کے بعد بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا کہ چونکہ میری والدہ سندھ کے قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتی تھیں، اور ہندوستان وعرب آپ کا خاص موضوع ہے اس لئے قبیلہ کے بارے میں مجھے معلومات دیں کہ تاریخ میں ان کے کن کن افراد کا تذکرہ ملتا ہے، اس دعوت میں ایک پُر لطف بات یہ رہی کہ مغربی طرز پر کھانے کا انتظام تھا، مگر راقم نے بھرے مجمع میں کہا کہ میں تو اسلامی تعلیم کے مطابق کھانا کھاؤں گا یہ کہہ کر پلیٹ میں کھانا لیا اور دوسرے کمرے کی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا شروع کیا، اس کے بعد تمام حاضرین نے ایسے ہی کھایا، کھانے کی پوری مدت تقریباً اسلامی دسترخوان ہی موضوع سخن بنا رہا، بعد میں یہ مجلس دو گھنٹے سے زائد تک رہی، اور مختلف سیاسی، ملکی اور علمی وتاریخی موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

دعوتوں کے سلسلے میں جدہ کی ایک دعوت کا ذکر ضروری ہے، ہمارے بمبئی کے پرانے دوست جناب الحاج عبدالرحیم صاحب انصاری کئی سال سے جدہ میں مقیم ہیں اور وہاں کے ہندوستان و پاکستان کے لوگوں میں کافی مقبول ومحبوب ہیں، وہ اردو شعر وادب سے اچھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایام حج میں ملتے رہے، جب جدہ پہونچا تو انھوں نے دوستوں سے تعارف اور ملاقات کیلئے ایک خاص دعوت کا انتظام کیا جو جناب محترم محمد احمد صاحب (لکھنؤ) کے دولت کدہ پر رکھی گئی تھی، اس پر تکلف دعوت میں ان کے حلقۂ احباب کے تمام ادب نواز شعراء وادباء شریک تھے، عشاء کے بعد کھانا کھایا گیا پھر بارہ بجے رات تک شعر وادب کی نہایت لطیف وسنجیدہ محفل رہی۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد نہ اپنی علمیت وقابلیت دکھانا مقصود ہے اور نہ اپنی عربیت اور عربی دانی کا اشتہار دینا ہے، راقم نے جو لکھا پڑھا تھا بمبئی کے تجارتی اور ہنگامی شہر میں اس کا باقی رکھنا مشکل ہے، پھر بھی الحمدللہ کہ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تاہنوز

باقی ہے، یہاں بتانا یہ ہے کہ ہمارے علماء مدارس کی فضا میں وہی پرانی عربی استعمال کرتے رہیں تو ان کو اچھا خاصا ملکہ ہو جائے اور عرب ممالک میں یا عرب علماء سے بات چیت اور تبادلہ خیالات میں کوئی دقت اور الجھن نہ ہو، اگر راقم یہاں تھوڑی بہت عربی کلام پر قدرت نہ رکھتا تو شرم اور جھجھک کی وجہ سے ہر عالم اور ہر محفل سے جی چراتا، اور مختلف قسم کے وجوہ تلاش کر کے اپنے کو تسلی دے لیتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے علم اور ذات پر اعتماد کرے، اور ہر موضوع پر اپنے فی الجملہ تیار پائے، ہمارے علماء علوم و معلومات میں دوسرے ممالک کے علماء سے کم نہیں ہیں، مگر صرف عربی میں تھوڑی بہت قدرت نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں، اِدھر پچھلے چند سالوں سے یہ خاموشی ٹوٹ رہی ہے، مگر اس میں تیزی کی ضرورت ہے، ہمارے مدارس عربیہ کے اساتذہ کو چاہئے کہ وہ اپنے طلبا سے عربی ہی میں گفتگو کریں، پہلے تو استاذ شاگرد دونوں ہی ضیق محسوس کریں گے، مگر چند دنوں کے بعد بے تکلف فصیح و بلیغ عربی بولنے لگیں گے، جسے عرب علماء سن کر محسوس کریں گے کہ ہم ان کے مقابلہ میں غیر صحیح بولتے ہیں۔

دوسرے ممالک میں جانا ہو یا نہ ہو خود اپنے ملک میں رہ کر عربی زبان بولنا، عربی میں خط و کتابت کرنا اور عربی زبان کو اپنی دینی زبان سمجھ کر زندہ رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

مکتوبات حجاز (روداد سفرِ حج)

مرتب:۔مولانا اسیر ادروی صاحب

مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ نے چار حج کئے۔دوسرا حج ۱۹۶۵ء میں کیا ''مکتوبات حجاز'' کا تعلق اسی سفرحج سے ہے۔کاغذ کی دو انچ چوڑی متعدد سلپوں پر یہ تحریر باریک قلم سے لکھی ہوئی ایک لفافہ میں ملی، روشنائی ہلکی پڑگئی ہے، حروف مٹے مٹے سے ہیں۔جب ان سلپوں کو مرتب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اسی سفرحج کا روزنامچہ ہے۔زبان بہت سادہ، انداز بیان سلیس، کسی طرح کی عبارت آرائی کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی جو کچھ اس سفر میں گزرا اس کو سادہ لفظوں میں لکھتے گئے۔آخر کا حصہ اس وقت لکھا گیا جب وہ سفر سے بمبئی واپس آگئے تھے۔پانی کے جہاز سے سفر کرنے کے دوران جو دشواریاں اور مشکلات حجاج کو پیش آتی تھیں اور دوران سفر جس طرح کی مصروفیات ہوتی تھیں اس کی پوری جھلک اس تحریر میں بھی ملتی ہے۔جن اکابر اہل علم سے انکی ملاقاتیں ہوئیں ان کا بھی ذکر ہے۔(اسیر ادروی)

مکتوب حجاز (۱)

آج ۱۷؍ مارچ ۱۹۶۵ء کا دن میری زندگی کا دوسرا تاریخی دن ہے۔اب سے دس سال پہلے ۱۹۵۵ء میں پہلی بار حج وزیارت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دوسرے حج کی باری ہے۔اب کے خالد وظفر کی والدہ بھی ساتھ ہے چونکہ درخواست حیص بیص میں تھی اور یکبارگی ۱۰؍ مارچ کو جانا یقینی ہوگیا، اس لئے فوراً ایکسپریس ٹیلی گرام دیا۔جو راستہ ہی میں ڈاک کی نذر ہوگیا اور دوسرا ایکسپریس ٹیلیگرام جو احتیاطاً دیا تھا وہ تیسرے دن مبارکپور پہونچا، اگر یہ بھی نہ پہونچتا تو ہم محکمہ ڈاک کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔۱۴؍ مارچ کو رات میں عزیزم ظفر مسعود اپنی والدہ کو لوا کر بمبئی پہونچ گئے، صبح کو مولانا محمد عثمان صاحب مبارکپوری صدر

مدرس مدرسہ سراج العلوم دھولیہ بھی ملاقات کے لئے آگئے، بمبئی کے دوسرے چند اصحاب بھی آتے رہے، میں نے دیدہ ودانستہ اخبار انقلاب میں اس کی خبر نہیں دی ۔البتہ ۱۷؍مارچ کے انقلاب میں مختصر سی خبر ناظرین کی اطلاع کیلئے دیدی، جسے دیکھ کر عزیزی محمد شمیم اور ان کی والدہ محترمہ وغیرہ والدہ ظفر مسعود سے ملاقات کیلئے آئیں نیز بھیمڑی سے محترم مولانا محمد افتخار صاحب اور مولانا محمد عارف صاحب اور الحاج عبدالغنی سیٹھ صاحب اور ان کے گھر کی عورتیں ملاقات کے لئے آئیں ۔اور دوپہر کا کھانا ساتھ لائے جسے کمرہ کے تمام حاضرین نے دوپہر کو تناول کیا چونکہ آج آخری جہاز مظفری تھا اور ویٹنگ لسٹ کے حجاج آخری وقت تک آتے رہے اس لئے بہت دیر میں روانگی ہوئی اور دو بجے کے قریب ظہر پڑھ کر ہم لوگ گودی آئے، ساتھ مولوی محمد عثمان صاحب، مولوی محمد افتخار صاحب اعظمی اور مولوی محمد عارف صاحب اعظمی ...... مدرسہ مفتاح العلوم بھیمڑی اور ظفر مسعود بھی گودی تک آئے مگر نئی پابندی کی وجہ سے اندر نہ آسکے، جہاز پر محترم الحاج سیٹھ محی الدین صاحب ان کو لیکر ہم دونوں نے تمام قانونی مراحل طے کئے ۔اور ساڑھے تین بجے شب کو خدا حافظ کہہ کر جہاز پر سوار ہوگئے ۔سامان پہلے ہی عزیزم جلال الدین اور منور خاں نے ہی سیٹ پر لاکر رکھ دیا تھا، اس لئے کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں ہوئی، نیز محترم الحاج محی الدین صاحب منیری اور فون ڈیانی صاحب اور دوسرے احباب کرام نے سب کچھ کراکر مطمئن کردیا۔ جہاز پر آنے کے بعد ایک حاجی صاحب جورانچی بہار کے رہنے والے تھے، پاگل ہوگئے ان کو مجبوراً اتارنا پڑا یہ منظر بڑا اندوہناک تھا کہ ایک شخص حج کیلئے جہاز پر سوار ہوکر اتار دیا جائے اس کی قسمت میں یہ حج نہیں تھا۔ ورنہ جہاز پر سوار ہوکر اترنے کا کوئی سوال نہیں ۔محبّ محترم منیری صاحب اور گرامی قدر ماسٹر محی الدین صاحب وغیرہ آخر وقت تک جہاز پر ساتھ ساتھ رہے ۔ جہاز چھ بجے شام کو

روانہ ہوا، چونکہ یہ اس موسم کا آخری جہاز تھا اس لئے بمبئی والے اپنی قدیم عادت کے مطابق آج بہت زیادہ آگئے تھے اور آخر مین گودی کے اندر آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس لئے الوداع کا منظر بڑا دلچسپ رہا۔ نعرہ تکبیر کی گونج ساحل اور جہاز سے اٹھ رہی تھی اور دیر تک اللہ کی پاکیزگی کا کلمہ دونوں طرف سے بلند ہو رہا تھا، عصر کی نماز جہاز پر سوار ہونے کے بعد پڑھ لی تھی، مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا تقسیم ہوا اور عشاء کے بعد چونکہ سب لوگ دن بھر کے تھکے ماندے تھے اس لئے اپنے اپنے بستروں پر پہونچ گئے۔ اس جہاز میں ہر طبقہ کے اچھے لوگ تھے، علماء میں مولانا ابوالحسن صاحب حیدری غازیپوری، مولانا محمد سعید صاحب راندیری، مولانا محمد عثمان صاحب جونپوری، مولانا شبیر احمد صاحب جونپوری اور ان کے ساتھی علماء مولانا عبدالوہاب صاحب بخاری مدراسی، مولانا حامد صدیقی حیدرآبادی اور حیدرآباد کے کئی مشائخ مسلم یونیورسٹی کے فارسی کے لکچرر جناب مختار علی خانصاحب (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نواسے) اس طرح اور بھی علماء اور مشائخ، شعرا، پروفیسر، مدرس، آفیسرس اور صاحب حیثیت افراد تھے۔ ۱۸/ مارچ کی صبح کو ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا صبح ہی ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کے کوئی پروفیسر مجھے رات ہی سے تلاش کر رہے ہیں، میں صبح کو فرسٹ کلاس کی نشست گاہ میں گیا تو وہ صاحب خود ہی پتہ چلا کر اپنے کمرے سے تشریف لائے۔ یہی جناب مختار علی خانصاحب تھے جنھوں نے گذشتہ سال تیرہویں صدی میں ہندوستان کی فارسی تصنیفات پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اور اب مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرار ہیں، صالح جوان ہیں، شکل وصورت سے پکے مسلمان اور افکار وخیالات میں نہایت روشن خیال ہیں اور چہرے بشرے سے خاندانی شرافت، دیانت کا ظہور ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں بمبئی ہی سے آپ کی تلاش میں تھا کیوں کہ میں نے اپنے

ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں آپ کے علمی وتحقیقی مقالات وکتب سے کام لیا اوران کے حوالے بھی دیئے ہیں، جب میری کتاب چھپے گی تو آپ دیکھ کوخوش ہوں گے۔ان کی اس سعادت مندی پر رشک ہوا اوران کے مطالعہ کیلئے میں نے اپنی کتاب ’[عرب و ہند عہد رسالت میں‘‘ دی اس کے بعد ان سے بار بار ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

یوں سمندر بالکل خاموش، جوتے ہوئے کھیت کے مانند ہے مگر آج ہوا تیز رہی جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو دوران سر کی شکایت رہی اور بعض معمولی طور سے بیمار بھی پڑے۔اچھی خاصی ٹھنڈی ہے، ڈیک کلاس کے مسافر اپنی جگہوں پر نہایت آرام سے سوتے ہیں۔انٹر کام پر حیدرآباد والوں کا قبضہ ہے، مشاعرہ وغیرہ ترتیب دیا جاتا ہےاور مخصوص رنگ کی تقریر کی جاتی ہے،

مکتوب حجاز (۲)

آج ۱۹/ مارچ ہے، افغانستان کی پارلیمنٹ کے ممبر عالی جناب محمد اسلم کریمی بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے ہیں، بڑے خلیق سیدھے سادے مسلمان آدمی ہیں اور اس تواضع وفروتنی سے پیش آتے ہیں کہ ندامت ہوتی ہے، ان کی خواہش پر سب نے حج ومناسک کے چند ضروری مسائل کو فارسی زبان میں بیان کیا جب کہ انھوں نے لکھ لیا وہ اردو نہیں جانتے اس لئے ان سے ساری گفتگو فارسی ہی میں ہوا کرتی ہے، انہوں نے مسلمانان ہند اور اہل بمبئی کو دیکھ کر اپنی بے انتہا مسرت کا اظہار کیا، میں نے ان کو پورے سفر میں اور جدہ وغیرہ میں اپنے ذرائع سے آرام پہونچانے اور ضروری امور میں رہنمائی کرنے کا وعدہ کرلیا ہے جس سے انکو بڑا اطمینان ہے۔ خدا کرے میں ان کی خدمت کرسکوں۔

آج صبح صبح مغل لائن کے اسٹنٹ منیجر عالیجناب............صاحب محترم موسیٰ

قتال صاحب جو امیر الحجاج ہیں اور بعض دوسرے حضرات میری تلاش میں آئے اور کہا آپ ہمارے یہاں آ کر حج و مناسک کے مسائل بتائیے اور اپنا وقت اسی طرف گزاریئے۔ محترم ہاشم دادا نائب صدر انجمن خدام النبی کے ساتھ جہاز کے اسپتال کے ڈاکٹر جناب زری والا کے کمرہ میں گیا وہ جوان ہونے کے باوجود بہت شریف اور بامروت معلوم ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ سرکاری ملازمت سے وقت نکال کر اس سال حج و زیارت کی سعادت حاصل کریں۔ چونکہ وقت کم ملے گا، اس لئے چند ضروری مسائل دریافت کرنے کی اجازت چاہی، میں نے کتابوں کو دیکھ کر ان کو مسائل بتا دیئے، جن کی روشنی میں اگر موقعہ ملا تو وہ اس سال حج و زیارت کا انتظام کریں گے۔

فرسٹ کلاس کے حجاج جو زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ ہیں اور مالدار لوگ ہیں، چاہتے ہیں کہ میں ان کے پاس زیادہ آیا جایا کروں مگر یہ صورت اہل علم کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کتراتا رہتا ہوں، پھر بھی آنا جانا رہتا ہے اور جہاں تک ہوسکتا ہے ان کو مسائل سے واقف کرتا ہوں ویسے کچھ لوگ اسے اعزاز سمجھتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ علم دین کی توہین ہے کہ علماء کو بلا کر ان سے مسئلہ پوچھا جائے، یہ دوسری بات ہے کہ اہل علم ان لوگوں کو صحیح مسئلہ بتانے کی خدمت اپنے ذمہ لیں اور ان کی رہنمائی کر کے اپنی ذمہ داری پوری کریں اسی وجہ سے میں بھی گاہے گاہے جاتا رہتا ہوں۔

محترم منیری صاحب نے بار بار تاکید فرمائی تھی کہ تمہارے لئے اونچے درجے کے کھانے کا انتظام کرا دیا ہے۔ آپ اسے منظور کرلیں، میں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے آپ فرمائیں تو میں اس کا پیسہ ادا کردوں مگر انھوں نے منظور کرنے سے انکار کر دیا، اس کے باوجود میں نے اس سے بچنا چاہا، جہاز کے

اسسٹنٹ منیجر نے جہاز میں کہا مگر میں نے انکار کر دیا البتہ جناب مجید کشمیری صاحب (جو جہاز کے مطبخ کے ذمہ دار ہیں) کے بے تکلفانہ اصرار بلکہ پرخلوص جبر کی وجہ سے مجھے مجبور ہونا پڑا، وہ برابر اونچے درجہ کا کھانا دونوں وقت مع چائے اور ناشتہ کے بھجواتے رہتے ہیں۔

۲۰ر مارچ کا دن بھی معمول کے مطابق نہایت اچھا گذرا، پورے جہاز میں سب خیریت ہے، تبلیغی جماعت والے فضائل کے ساتھ بعض اوقات مسائل بھی بیان کر دیتے ہیں اس لئے دوسرے علماء کو جو اونچے قسم کے ہیں ہم سفر ہیں، کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اپنے اصول کے مطابق یا غلطی سے کسی دوسرے عالم کو اس کا موقعہ ہی نہیں دیتے ہیں۔

امیر حجاج موسیٰ قتال صاحب اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ دس بجے دن میں جہاز کے عملہ کے ساتھ گشت لگاتے ہیں۔ پھر بارہ بجے تک اپنے طور پر حجاج کی خبر گیری کرتے ہیں، ویسے زبان خلق سے کون بچ سکتا ہے۔ محترم ہاشم دادا صاحب انجمن خدام النبی کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے بڑی تندہی سے حجاج کی خدمت کرتے ہیں اور جب دیکھو کسی نہ کسی کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ ویسے خادم الحجاج کا بیج لگا کر بہت سے لوگ گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ کھانا مناسب ہوتا ہے مگر بعض لوگ شکایت کرتے رہتے ہیں اور کھانے سے زیادہ کھانے کی شکایت میں لذت پاتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہونی چاہئے۔ دوپہر کو عام طور سے صرف چاول دیا جاتا ہے، اچھا خراب کی بحث سے اٹھ کر صرف چاول دینا ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔ صرف چاول کھانا بہت سے لوگوں کی عادت میں نہیں ہے۔ بلکہ یا تو وہ روٹی کے عادی ہیں یا چاول کے ساتھ روٹی کے بھی عادی ہیں۔ اس لئے ایسے لوگوں کو ایک وقت صرف

چاول کھانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صبح کوناشتہ میں عام طور سے صرف ایک توس سینکا ہوا دیا جاتا ہے۔ یہ ناشتہ بقدر بادام عام حجاج کیلئے بہت ناکافی ہے۔ تیسرے درجے کے حجاج عام طور پر محنت کش اور کام دھندے والے ہوتے ہیں۔ وہ صبح کوناشتہ کے نام پر اچھی خاصی غذا کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کو روٹی کا ایک ٹکڑا بالکل ناکافی ہے۔ دونوں کھانوں میں جو سخاوت کی جاتی ہے اس کا ایک حصہ بچا کر ناشتہ میں زیادہ دیدیا جائے تو اچھا ہو۔

امیر الحجاج اگر مذہبی امور کی براہ راست معلومات زیادہ نہیں رکھتا تو اسے چاہیئے کہ جہاز میں سفر کرنے والے ہر خطہ کے علماء کو جمع کر کے ان سے دینی خدمت لے اور ان کے لئے حلقہ مقرر کرائے۔ اسی طرح نماز وغیرہ کے انتظام میں ان سے کام لے، جہاز کا عملہ ملازمین حجاج کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آتے ہیں۔

مکتوب حجاز (۳)

۲۰/ مارچ افغانستان کے دو حاجیوں کے علاوہ اسی جہاز سے نیپال کے ۴۹ حاجی جا رہے ہیں جن کو پہونچانے کے لئے نیپال پارلیمنٹ کے ایک مسلمان ممبر بمبئی آئے ہوئے تھے، ان میں بعض لوگ اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں، آج ان سے ملاقات ہوئی تو باتوں بات میں معلوم ہوا کہ نیپال کے مسلمان ادھر دس بارہ سال سے تعلیمی اور اقتصادی وثقافتی معاملات میں ترقی کر رہے ہیں اور کئی مسلمان طالب علم امریکہ، روس، چین اور ہندوستان وغیرہ میں حکومت نیپال کی طرف سے اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں اور حکومت میں ملازم بھی ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نیپال میں قصاب ہندو ہی ہوتے ہیں۔ البتہ اب کچھ مسلمان قصاب ہندوستان سے جا کر آباد ہوگئے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے غیر مسلم بھینس بھینسا کا گوشت عام طور سے کھاتے ہیں، دسہرے پر مندروں میں لاکر جانور (سوائے بیل گائے کے) ذبح کئے

جاتے ہیں ۔اس دن بھینس اور بھینسے کا گوشت سڑکوں پر اس طرح بکتا ہے جیسے بھاجی ترکاری کا ٹھیلہ ہوتا ہے۔اور غیر مسلم اپنی اپنی استطاعت بھر خوب خریدتے اور کھاتے ہیں، مسلمانوں کو بھی گائے اور بیل کے علاوہ ہر قسم کے جانور کی قربانی اور ذبیحہ کی اجازت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں پر یورپ و ایشیاء کے مختلف ممالک کے سامان بکثرت وبکفایت آتے ہیں اور سستے بکتے ہیں، نیپال کے مسلمان مجموعی طور سے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پسماندہ ہیں الا کہ اپنے لئے کچھ کرتے ہیں یا کر رہے ہیں۔

۲۱/ مارچ کو امیر الحجاج جناب قتال صاحب نے جہاز کے کپتان اور افسران کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی دی جس میں تقریباً پچاس ہزار افراد شریک ہوئے۔ان میں پروفیسر، انجینئر، تاجر، تعلیم یافتہ زیادہ تھے۔شام کو ساڑھے پانچ بجے یہ تقریب منعقد ہوئی، خورد ونوش کے پہلے قتال صاحب نے کپتان کی خدمت حجاج اور ہر قسم کے تعاون پر اظہار وتشکر کیا اور مختصر سی تقریر میں بتایا کہ موصوف اوران کے عملہ نے ہمارا پورا تعاون کیا اور اپنی ہر قسم کی خدمت پیش کی ۔اس کے جواب میں کپتان نے بھی تقریر کیا وران کی اس قدر دانی اور ہمت افزائی کا شکریہ ادا کیا، نیز امیر الحجاج صاحب نے چند حضرات کی طرف سے مغل لائن کو بمبئی ایک ٹیلی گرام روانہ کیا جس میں جہاز کے عملہ کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ یہ جلسہ بہت خوب تھا جو امیر الحجاج کی طرف سے جہاز کے عملہ و افسران کی خدمات کو سراہنے کیلئے کیا گیا۔

۲۲/ مارچ کو جہاز عدن میں رکا، کئی دنوں کے بعد خشکی نظر آئی، پہلے ہی سے تیل بردار جہاز نظر آنے لگے، حجاج ذوق وشوق میں ادھر ادھر جانے لگے، دیار پاک کے آثار نظر آنے لگے اور عرب کا ملک شروع ہوگیا، جہاز دن مین ۲/ بجے عدن کے ساحل سے کچھ دور کھڑا ہوا۔تیل اور پانی اور دوسری ضروری اشیاء لینی ہیں، ابھی جہاز

دور ہی تھا کہ ساحل عدن سے ایک لانچ پر سوار ہو کر وہاں کا افسر آیا اور لکڑی اور اس سے بنی ہوئی معمولی سیڑھی کے ذریعہ جو پہلے سے لٹکادی گئی تھی نہایت صفائی سے اوپر چڑھ آیا۔

عدن تاریخ کے قدیم زمانہ سے یورپ اور ایشیاء کے درمیان بہت بڑا تجارتی مرکز رہا ہے۔ ہندوستان اور چین کے ساتھ مشرق کے سامان یہاں لائے جاتے تھے اور پھر یہاں سے عرب ہو کر خشکی یا بحری راستہ سے یورپ تک جاتے تھے، اس کے باوجود یہ مقام بہت ہی مختصر بظاہر بے حیثیت اور غیر آباد رہا، مگر انگریزوں نے اس کو ترقی دے کر بڑا اہم مقام بنادیا ہے، عدن کے کئی نواحی ہیں نواحی شیخ غسان اور عدن گریٹر وغیرہ ساحل سے متصل ہیں۔ عدن بالکل جدید طرز کا شہر ہے جس میں دنیا بھر کی قومیں آباد ہیں۔ برطانوی پالیسی نے اس علاقہ کو بالکل غیر عرب بنانے کی کوشش کی تھی۔ آس پاس کے امراء وشیوخ کو لیکر ایک اتحاد الجنوبی العربی کے نام سے ایک پارلیمنٹ بنائی ہے۔ مگر اب یہ جادو بھی ٹوٹ رہا ہے اور آزادی کی تحریک کا زور ہے۔ چنانچہ اس وقت عدن میں شدید نگرانی ہے اور جگہ جگہ پولیس کا سخت پہرہ ہے، عدن کے پیچھے پہاڑوں اور صحراؤں میں قدیم قبائل آباد ہیں، قوم عاد اس نواحی میں تھی جس میں شداد نامی بہت بڑا نافرمان ظالم اور صاحب اقتدار گذرا ہے۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے یہاں کے پہاڑوں میں اپنی جنت بنائی تھی ساحل کے قریب انگریزوں نے شداد کی جنت بنادی ہے۔ جہاز رات کے ایک بجے کے بعد وہاں سے نکلا تو یہاں کے شہر اور ساحل کی قسم قسم اور رنگ بہ رنگ کی روشنیاں عجب نظر نواز منظر پیش کر رہی تھیں۔ بہت دیر تک یہ منظر دیدنی تھا۔ دو ایک کشتی والے سامان فروخت کرنے آئے مگر زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ کیوں کہ اب ہندوستانی حجاج کے پاس روپیہ پیسہ بہت کم ہوتا ہے۔ ورنہ پہلے یہاں جب جہاز ٹھہرتا تھا تو خوب

خرید وفروخت ہوتی تھی ،۔ جب جہاز ساحل عدن سے نکل کر کچھ دور گیا تو پھر اسی سیڑھی سے عدن والا افسر بڑی صفائی سے اتر کر ساحل سے آکر جہاز میں لگ جانے والی موٹر کشتی میں بیٹھ گیا۔

عام خیال تھا کہ بحر احمر میں جہاز داخل ہونے کے بعد گرمی زیادہ ہوگی، مگر معاملہ الٹا ہوگیا، سردی، ہوا اور جہاز کی حرکت زیادہ ہوگئی۔ جو ۲۳ر کی صبح تک باقی رہی، پوری رات تند وتیز ہوا چلتی رہی اور جہاز ہچکولے کھاتا رہا۔ بہت سے حجاج جو اب تک خوش وخرم چلتے پھرتے تھے بستر پر سر رکھنے پر مجبور ہوگئے مگر مجموعی اعتبار سے یہ زیادہ پریشانی نہیں ہے۔

مکتوب حجاز (۴)

۲۳ر مارچ کو جہاز بحر احمر میں چل رہا ہے اور خلاف معمول اس سال اس سمندر میں سردی، ہوا اور موج زیادہ ہے۔ حالانکہ اس میں ہر طرف سکون اور گرمی ہوتی ہے، عورتوں کو عام طور سے دوران سر کی شکایت پیدا ہوگئی ہے، کچھ کمزور دماغ مرد بھی اس میں مبتلا ہیں۔ خالد وظفر کی والدہ آج بستر پر رہی حالانکہ بمبئی سے اب تک کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اور نہایت صحت مندی کے ساتھ ہر طرف آنا جانا تھا مگر یہ صورت حال وقتی ہے۔ صرف دوران سر ہے۔ رات ایک حاجی صاحب جو پہلی مرتبہ حج کو جارہے ہیں اور معمر ہیں اپنے ملاقاتی کو اس طرح ہدایت دے رہے تھے جیسے انھوں نے بار بار حج فرمایا ہے اور وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی گفتگو ہدایات لئے ہوئے تھی مگر شکایات سے پر تھیں۔ معلم ایسا کرتے ہیں، یوں لوٹتے ہیں، قربانی کا جانور پیسہ لے کر نہیں دیتے۔ دلالی کرتے ہیں۔ اور جہاز پر تیسرے درجہ کا کھانا نہایت خراب ملتا ہے۔ اور مغل لائن کمپنی ان سے روپیہ لے کر اچھا کھانا نہیں دیتی۔ میں ایک طرف بیٹھا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا، انھوں نے

شاید مجھے دیکھا نہیں تھا۔اس لئے کہنے لگے کہ ہمارے قریب ہی ایک مولوی صاحب ہیں جن کا کھانا فرسٹ کلاس سے دونوں وقت آتا رہتا ہے۔اور ناشتہ چائے الگ سے آتا ہے۔وہ ٹھاٹ سے کھاتے پیتے ہیں۔اس پر دونوں نے کہا کہ یہ مولوی صاحب مغل لائن اور جہاز والوں سے کھانے کی شکایت کیسے کر سکتے ہیں جبکہ ان کو وہاں سے کھانا مل رہا ہے۔اس قسم کے لوگ اپنا فائدہ کر کے حجاج کی تکلیف کا باعث بنتے ہیں وغیرہ وغیرہ زبان خلق کو کوئی روک نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بدگمانی سے بچالے۔اس سفر میں میرے لئے بڑی بے سروسامانی رہی بروقت منظوری کی وجہ سے ساتھی بھی نہ مل سکے مگر جناب فتح محمد خانصاحب ضلع گونڈہ والے کا ساتھ رہا جن کی وجہ سے مجھے کافی آرام رہا۔یہ صاحب بڑی عقیدت سے ہم لوگوں کی خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

ایک تکلیف بڑی شدید یہ رہی کہ حاجی اپنے ہمراہ عام ہندوستانی نوٹ نہیں لا سکتے بلکہ اگر کچھ ملتا ہے تو حج نوٹ کی شکل میں، تاکہ جہاز پر اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔مگر جہاز پر صورت یہ ہے کہ عام ہندوستانی نوٹ لیا نہیں جاتا اور حج نوٹ کیلئے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ دس روپیہ جمع کر کے آخر تک اس کا سودا خرید کر ختم کر دیں یہ نہیں کہ اسے بھنا کر دو چار روپے کی چائے وغیرہ پی سکیں۔اس لئے یا تو حج نوٹ ویسا ہی رکھے رہیئے، یا پھر اس طرح خرچ کیجئے کہ سب کا سب جہاز کی دکان پر ختم ہو جائے۔اس وجہ سے سخت پریشانی رہی اور حج نوٹ لینا بالکل بیکار ثابت ہوا حالانکہ حجاج کو ان کے حساب میں اگر دس پانچ روپیہ چاہیں تو عام ہندوستانی نوٹ دینا چاہیئے، مغل لائن ہندوستانی کمپنی ہے۔اس میں غیر ملکی زرمبادلہ کا چلن خلاف اصول ہے بلکہ ایک ہزار کے علاوہ دس پانچ روپیہ جہاز میں خرچ کرنے کے لئے دینا چاہیئے کیونکہ یہ رقم باہر نہیں جاتی۔جس طرح کہ غلہ کپڑے کی رقم ہندوستان میں رہ

جاتی ہے اس طرح یہ رقم ہندوستانی جہاز میں رہ جاتی ہے۔ آئندہ اس طرف خصوصی اور فوری توجہ کی ضرورت ہے، حاجی جہاز میں یا تو دس روپیہ خرچ کردیں یا ایک پیسہ بھی نہ خرچ کریں، یہ طریقہ نہایت پریشان کن اور غلط ہے یا پھر جہاز میں کسی قسم کی خرید وفروخت کا معمول ختم کردیا جائے۔

۲۴/ مارچ کی صبح کو ناشتہ کے بعد جہاز کے وقت سے ساڑھے سات بجے میری تقریر جہاز کے انٹرکام سے ہوئی، مائک پر ایک خاص حلقہ کا قبضہ ہے، حالانکہ اور بھی بہت سے اچھے اچھے اہل علم اس جہاز میں چل رہے ہیں مگران کی خدمت نہیں حاصل کی جارہی ہے۔ البتہ دو تقریریں مولانا سید عبدالوھاب بخاری اور آج ایک میری تقریر ہوئی۔ چونکہ آج احرام بندھنے والا ہے اس لئے میں احرام کے مسائل پر زور دیا ویسے ہفتہ بھر سے مسائل بیان کئے جاتے تھے اور مسائل پر توجہ کم تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ فضائل کے بجائے مسائل بیان کئے جائیں، چونکہ گذشتہ تقریریں ایک خاص طبقہ مشائخ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور زبان ومحاورہ کے لحاظ سے مخصوص رنگ کی تھیں۔ اس لئے میری تقریر میں لوگوں کو نیاپن محسوس ہوا اور زبان کے اعتبار سے بھی تبدیلی محسوس ہوئی۔ پھر بروقت مسائل تھے۔ اس لئے الحمدللہ مجموعی طور سے اچھی رہی اور حجاج سے مسرت آمیز تاثر معلوم ہورہا تھا۔ سطور ہذا کی تحریر کے وقت دنیا میں جہاز کے وقت سے ساڑھے دس کا وقت ہے، ہندوستان میں تو ۱۲ سے زیادہ ہوگیا ہوگا۔ آج سویرے کھانا تقسیم ہورہا تھا اور لوگ کھانے پینے میں مصروف ہیں تاکہ جلد فارغ ہوکر نہانے دھونے اور احرام باندھنے میں لگ جائیں۔ آج شام کو پانچ بجے تک یلملم کا سامنا ہوگا اس سے پہلے احرام بندھ جائے گا۔ میں نے صبح چار بجے ہی اٹھ کر کھاری پانی ہی سے غسل کرلیا ہے کیوں کہ دن میں میٹھے پانی پر بڑی بھیڑ رہے گی حالانکہ فرسٹ کلاس والے متعارف اور قدرداں حضرات بار بار کہہ چکے ہیں

کہ آپ دونوں ہمارے یہاں آکر غسل کرلیں مگر وہاں دن میں بھیڑ بھاڑ ہے اس لئے ان کے شکریہ کے ساتھ وہاں نہیں گیا۔

مکتوب حجاز (۵)

جہاز مظفری تقریباً دس گھنٹے تک عدن میں رکا رہا جس کی وجہ سے جدہ دیر میں پہونچا ۲۵/ مارچ جمعہ کو دس بجے کے قریب جدہ کے سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کی چھوٹی سی گودی پر دونوں طرف دو جہاز لنگر انداز ہیں جن میں سے ایک اسلامی تھا جو ۱۲/ مارچ کو بمبئی سے چلا تھا قاعدہ سے اسے دو روز پہلے پہونچنا چاہئے تھا، کچھ عدن کے بعد بحر احمر میں تموج کی وجہ سے لیٹ ہوگیا۔ مظفری جہاز کو گودی خالی ہونے کے انتظار میں ساحل سے دور ٹھہرایا یہاں تک کہ تقریباً تین بجے اسلامی جہاز اپنے حجاج کو اتار کر باہر نکلا تو مظفری داخل ہوا اور چار بجے کے قریب تمام مسافر اترے، معمولی اور مختصر سامان تو خود اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑے بڑے سامان جہاز ہی پر چھوڑ دیا تاکہ سعودی عرب کے قلی ان کو اتار کر کسٹم میں پہونچا دیں۔ یہاں کے اصول کے مطابق حجاج اترتے ہی موٹر پر سوار کئے جاتے اور کسٹم ہاؤس سے متصل نقابہ میں پہونچا دیئے جاتے ان کے پیچھے لاری میں ان کے سامان پہونچائے جاتے تھے۔ اس طرح حجاج اور ان کے سامان الگ الگ جاتے تھے، نقابہ میں پاسپورٹ کی جانچ اور معلم کی تعیین ہوگئی ہے۔ اس سے باہر متصل ہی کسٹم ہاؤس ایک وسیع وعریض ہال کی شکل میں ہے جس میں چبوترے بنے ہوئے ہیں۔، انہیں پر حجاج کے سامان اس طرح ایک ساتھ رکھ دیئے گئے کہ نہ حجاج کا پتہ چلتا ہے اور نہ سامان کی خبر لگتی ہے۔ پہلے سے بتایا گیا کہ جہاز کے فلاں نمبر کے درجہ یا ڈیک کا سامان کسٹم ہاؤس کے فلاں حصہ مین رکھا جائے گا تو حاجیوں کو اپنا سامان تلاش کرنے میں مشکل نہ ہوتی۔ مگر ایسا نہ ہوا بلکہ ایک طرف سے موٹریں گودی سے سامان لاد لاد کر یہاں گراتی جاتی تھیں،

تمام سامان کسٹم ہاؤس میں بکھرا ہوا تھا، کسی حاجی کا دو سامان ایک جگہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ رات کے آٹھ بجے تک سامان آتے رہے اسی میں حجاج سامان اور کسٹم افسران سب کے سب ایک رنگ میں نظر آنے لگے۔ عرب کے قلی الڑھ قسم کے ہوتے ہیں اور زبان نہیں سمجھتے، غیر حاجی کو اندر جانا ممنوع ہوتا ہے یہ وقت بڑی پریشانی کا ہوتا ہے۔ دس سال پہلے جو پریشانی اس موقع پر ہوتی تھی اس میں ذرا بھی کمی نہیں آئی حالانکہ کسٹم ہاؤس میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ اگر سعودی حکام اس کی طرف معمولی توجہ کردیں تو حجاج کو سرزمین حجاز پر اترتے ہی پریشان کن بدنظمی سے نجات مل جائے اور سعودی حکام کو بھی اطمینان حاصل ہو۔

عزیزم مولوی خالد کمال مبارکپوری سلّمہٗ دو دن پہلے جدہ آگئے تھے بلکہ معلم زین العابدین کالو اور عزیزی مختار احمد جاوید کو بھی میرے آنے کی ٹیلی گرام سے اطلاع دے چکے تھے چونکہ وہ کسٹم آفس سے باہر تھے اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔ عزیزی مختار احمد جاوید سے ملاقات ہوئی جو جدہ میں وکیل حسن نظار کے معتمد ہیں اور اسی حیثیت سے کسٹم ہاؤس کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے خالد کمال کو خبروں نیز جامعہ اسلامیہ کے بعض طلبہ سے یہیں ملاقات ہوئی اور اس پریشانی کے ہنگامہ میں بڑا سکون حاصل ہوا۔ اسی دوران میں ہندوستانی سفیر محترم مدحت کامل قدوائی صاحب سے ملاقات ہوئی اور بغیر کسی سابقہ تعارف و تعلق کے بڑی خندی پیشانی اور اخلاق سے ملے، انھوں نے رک کر باتیں کیں اور پان پیش کیا پھر رات میں کافی دیر تک مدینۃ الحجاج میں ان سے گفتگو رہی۔ بڑے شریف النفس آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اور اپنے فرائض کے ساتھ حجاج کی خدمت حتی الامکان کرتے ہیں، اسی نقابہ میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب (فاضل دیوبند) سے ملاقات ہوئی جو ہندوستانی سفارت خانے میں مترجم کی حیثیت سے رہتے ہیں، معارف، البلاغ

،ثقافۃ الہند اور میری تصنیفات کے ذریعہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور ملاقات کے متمنی تھے، بڑے تپاک اور اخلاق سے ملے اور اسی نقابہ میں علمی و تحقیقی گفتگو ہونے لگی ''رجال الہند والسند'' اور ''ہند و عرب عہد رسالت میں'' کا تذکرہ آیا اور اس کے بعض مباحث کا عربی ترجمہ جو ثقافۃ الہند ''حکومت ہند کے سرکاری پرچے'' میں چھپا وہ اس کی افادیت واہمیت پر گفتگو کرتے رہے اور بتایا کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر حکومت ہند سے مزید پرچے طلب کئے گئے ہیں۔

عصر کی نماز کسٹم ہاؤس میں پڑھی گئی اور چار بجے دن سے لے کر دس بجے رات تک اسی جنجال میں رہے۔ خدا کے فضل سے سب سامان مل گئے، مگر نئے بکس کا کچومر اس طرح نکل گیا کہ اس کی صورت نہیں دیکھی جاتی تھی۔ حالانکہ جہاز سے آتے وقت اصلی حالت میں حفاظت سے رکھ دیا تھا مگر جہاز سے کسٹم ہاؤس تک ہی آنے میں اس کا حلیہ بگڑ گیا۔ اب رہی سہی کسر مکہ میں پوری ہوگی۔ دس بجے رات میں جدہ مدینۃ الحجاج پہونچے جو آفاقیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب اس میں زیادہ توسیع اور تعمیر ہوگئی ہے، کمرے نہایت آرام دہ، پانی بہ افراط، پیشاب خانہ اور پاخانہ کا بہترین انتظام ہوگیا ہے، روشنی اور پنکھے بھی ہیں۔ الغرض مدینۃ الحجاج کی عمارتیں بہترین اقامت گاہ بن گئی ہیں۔ یہاں آنے پر بمبئ کے پرانے مخلص رفیق مسٹر عبدالرحیم انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی جو پہلے ہندوستانی سفارت خانے سے وابستہ تھے۔ اور اب ایک اور ادارہ سے وابستہ ہیں۔ الحمد للہ کہ عبدالرحیم انصاری بہت مطمئن ہیں اور اخلاق و شرافت میں اپنا وہی پرانا معیار قائم کئے ہوئے ہیں۔ عزیزی مختار احمد جاوید تو کہنا چاہئے کہ میرے گھر کے ایک فرد ہی ہیں۔ انھوں نے بہت آرام پہونچایا۔ خالد کمال اور مختار احمد جاوید دونوں ہماری خدمت میں یکساں تھے۔ تکلیف اور پریشانی سے بچنے کیلئے جدہ سے مکہ کا بس کا عام کرایہ بھر کر واپس لے

کر دوسرے دن تیس ریال پر ٹیکسی کر کے مکہ مکرمہ آئے اور مغرب کی نماز پڑھ کر طواف وسعی کر کے عمرہ ادا کیا۔

مکتوب حجاز (۶)

دن میں شہر جدہ میں جانا ہوا، دس سال پہلے ہی جدہ جدید طرز کا خوبصورت شہر بن چکا تھا اس مدت میں اس کی ترقی کہیں سے کہیں پہونچ گئی، تاریخوں اور سفر ناموں میں جدہ کے بارے میں جو پڑھا تھا افسانہ معلوم ہو رہا تھا۔ اب اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی، سر بفلک عمارتیں یعنی چوڑی سڑکیں اور غیر ملکی سامان تجارت سے پٹے ہوئے بڑے بڑے بازار اور دکانیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی افسانوی شہر ہے غیر ملکی کمپنیوں کے دفاتر اور شہر کی چہل پہل قابل دید ہے۔ اور اس میں خاص بات یہ ہے کہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں کے درمیان ہرے بھرے درخت اور پھول پتے ہر طرف نظر آتے ہیں جگہ جگہ پارک ہیں قیمتی موٹریں سنکتی پھرتی ہیں اور لوگوں کے چہروں پر بڑی بے نیازی، اطمینان اور سکون کی لہر دوڑتی ہے، دولت وثروت کی بہتات کا عالم یہ ہے کہ جس دکان اور سامان کو دیکھئے تو جی چاہتا ہے کہ دیکھتے رہے یہ بات ضرور ہے کہ سارا کھیل غیر ممالک کا مرہون منت ہے اور عربوں کی دولت ایک طرف سے آتی ہے تو دوسری طرف چلی جاتی ہے۔ مگر سکون واطمینان میں یہ تصور ذرا بھی مخل نہیں ہے۔ جو ممالک اسی چکر میں ہیں ان میں سے اکثر کا حال نہایت خراب وخستہ رہتا ہے اور وہ ضروریات زندگی تک کو ترستے رہتے ہیں۔ تواریخ ورحلات کی کتابوں میں جدہ میں حضرت حوا کے مزار کا تذکرہ ملتا ہے مگر تاریخی اعتبار سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ حضرت آدم وحوا کی تاریخ قرآن وحدیث میں جو کچھ ہے اس کے علاوہ ظن وتخمین کی بات ہے۔ بہر حال ہم لوگ بھی حضرت حوا کے مزار کی جگہ گئے جو شہر جدہ کے کنارے ایک گھیرے ہوئے

علاقہ میں ہے، دروازہ بند تھا۔ باہر نذرانہ یا بخشش وصول کرنیوالے بیٹھے تھے، مصری مرد اور عورتیں باہر سے جھانک کر دیکھتے تھے اور نذرانہ پیش کرتے تھے۔

ہمیں محافظ نے دروازہ کے سوراخ سے قریب کی جگہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس جگہ حوا کی قبر تھی۔ اب وہاں کوئی علامت نہیں بلکہ میدان ہے، ہم نے ایک نظر ڈالی اور بغیر کچھ نذرانہ دیئے اپنی راہ لی، ترکوں کے دور کو بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ ہر متبرک مقام کو محفوظ کر کے نذر و نیاز وصول کراتے تھے اور وہاں کے نگران اس مقام کی فضیلت اور اہمیت بیان کر کے زائرین کو زیارت کراتے اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ مگر آج بھی تقریباً یہ عمل جاری ہے۔ ایسے تمام آثار کو ختم کر کے ان کی جگہ پولیس متعین کر دی گئی ہے تاکہ کوئی شرک و کفر نہ کرنے پائے۔ مگر یہ پولیس والے عام طور سے رشوت اور بخشش کے نام پر پیسہ وصول کرتے ہیں اور زیارت کا خصوصی موقعہ دیتے ہیں حتی کہ حجر اسود کے استلام کے لئے بھی اب یہ طریقہ کھلم کھلا جاری ہو گیا ہے۔ ایک دو ریال لے کر سروں کو پکڑ پکڑ کر بوسہ دلایا جاتا ہے جبکہ عام لوگوں کے اژدحام کو بے دردی سے ہٹایا جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ:۔ دس سال کے بعد مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا تو پورا شہر بدلا ہوا نظر آیا اور یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی مکہ مکرمہ ہے جو وادی غیر ذی زرع کے نام سے موسوم ہے، کئی میل تک شہر پھیل گیا ہے، کئی کئی طبقہ کی شاندار جدید طرز کی عمارتوں کا سلسلہ یعنی چوڑی سڑکوں کا جال چوڑی خوبصورت فٹ پاتھ دورویہ آمد و رفت کا انتظام، جگہ جگہ حسین و جمیل ہرے بھرے پارک، پانی کے فوارے قسم قسم کے پھول پتے، الغرض شہر کا نشیب و فراز اپنے اندر جدت پسندی کا پورا سامان لئے ہوئے ہے مکہ کی آبادی پہاڑیوں پر زیادہ ہے۔ راتوں کو رنگ برنگ کی روشنیاں عجیب معلوم ہوتی ہیں

۔ان دنوں سارا مکہ انسانوں کیلیئے گود بنا ہوا ہے، کئی لاکھ کی اس کی آبادی کے ساتھ ساتھ کئی لاکھ انسان باہر سے آگئے ہیں۔ حالانکہ حکومت نے ترکی، شام، اردن، اور دوسرے قرب وجوار کے ممالک کے موٹروں پر آنے والے حجاج کے لئے شہر کے باہر قیام کا انتظام کیا ہے، جہاں وہ اپنی سیکڑوں، ہزاروں موٹروں پر رہتے ہیں، اور شہر میں نماز وطواف کے لئے آتے ہیں، پھر بھی بھیڑ کا یہ حال ہے کہ ہفتوں تک گلی کوچوں کی تمیز نہیں ہوسکی، ہر مکان اور ہر میدان صحن معلوم ہوتا تھا۔

جدید حرم:۔ حرم محترم کی جدید توسیع وتعمیر کا کام بغیر دیکھے ہوئے صحیح طور سے نہیں سمجھا جاسکتا، پوری دنیا میں اب کوئی عبادت خانہ اس سے بڑا نہیں رہ گیا ہے، حکومت سعودیہ نے پچاس کروڑ ریال سے زائد صرفہ کر کے اسلامی تاریخ میں اپنا الگ باب ثبت کر دیا ہے، عقل ونظر دونوں اس عمارت کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتی ہیں۔ پرانے حرم کا اکثر حصہ باقی ہے اس کے بعد سے حرم کی تعمیر ہوئی ہے، کام جاری ہے اس کے بارے میں ارباب دل کا کہنا ہے کہ ترکوں کے قدیم حرم میں جو جاذبیت اور روحانیت نماز میں محسوس ہوتی ہے وہ بات جدید حرم میں نہیں ہے۔ حرم کی تیسری منزل پر نماز پڑھتے وقت کعبہ شریف اس کے نیچے معلوم ہونے لگتا ہے جو بجائے خود نا مناسب بات ہے۔ چنانچہ راقم الحروف ایک مرتبہ سب سے اوپر کی منزل میں نماز پڑھنے گیا تھا پھر اسکے بعد نہیں گیا۔ بہر حال حرم اور مسلم سلاطین کی تاریخ میں حرمین شریفین کی تعمیر وتوسیع اور تجدید کا یہ کارنامہ صرف حکومت سعودیہ ہی کا حق ہے۔

عمرہ کی ادائیگی:۔ جیسا کہ کہا گیا، ہم لوگ اپنے طور پر شام کو مکہ مکرمہ پہونچے اور مغرب پڑھ کر عمرہ ادا کیا گیا اللہ اکبر! انسانوں کے سمندر میں اپنا گذر بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ دو ڈھائی ہزار میل پانی کا سفر طے کر کے نہایت آسانی سے یہاں آگئے تھے۔ مگر یہ انسانی سمندر اتھاہ معلوم ہوتا تھا خدا خدا کر کے بیت اللہ شریف کا طواف

کیا اور بڑی مشکل سے زمزم شریف پی سکے اور جب مسعیٰ میں پہونچے تو وہاں اس سمندر میں شدید روانی تھی۔ دنیا بھر کے مختلف ممالک کے مسلمان طواف اور سعی میں دوش بدوش مصروف عبارت تھے۔اور بلاکسی تمیز کے تمام چھوٹے بڑے امیر وغریب حاکم ومحکوم اور عالم وجاہل عبدیت وبندگی کے اظہار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جارہے تھے۔ جوں ہی صفا سے سعی شروع کی تو معلوم ہوا کہ پیچھے کا ریلا ہمیں چور چور کردیگا اس وقت اپنے کو خوب سنبھالا اور دھکا سہہ گئے۔اس کے بعد پھر ایسے شدید جھٹکے سے واسطہ نہیں پڑا، سعی کا پورا وقت بچنے بچانے میں گذرا مگران حالات میں نہ تکلیف معلوم ہوتی تھی، ناگواری کا احساس ہوتا، نہ دھکا دینے والے کے خلاف جذبہ پیدا ہوتا تھا بلکہ ایک خاص مزا ملتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ اس طرح لوگ ایک دوسرے پر گرتے رہیں۔ یہ دھکم دھکا بالکل بے اختیار اور اضطراری ہوتا تھا کون کسی کو جان بوجھ کر زحمت میں مبتلا کرتا، اس مقام کی عظمت اور عبادت کے خلاف سمجھتا تھا۔

مدینہ منورہ کے شب و روز:۔ راقم ۲۳ر ذوقعدہ (۱۳ر اپریل) سے ۲۱ر صفر (۱۱ر جون) تک حج وزیارت کے سفر میں رہا دیار مقدس میں پہلی حاضری ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی اس وقت جذبات واحساسات کا معاملہ کچھ اور تھا اور اب کی بار کچھ اور ہی بات تھی، ہر مقام روشناس، ہر منزل متعارف، ہر معاملہ جانا پہچانا تھا البتہ مکہ مکرمہ میں تعمیری تبدیلیاں بالکل نئی تھیں حرم محترم کی توسیع وتعمیر، نئے طرز کی سر بفلک عمارتوں یعنی چوڑی سڑکیں، ہرے بھرے پارک اور فوارے، دور جدید کے تمدن کی فراوانیاں حیرت ناک تھیں حرم شریف کے آس پاس کے علاقے پہچانے نہیں جاتے تھے، عزیزم مولوی خالد کمال مبارک پوری سلمہ اللہ تعالیٰ متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ مسلسل چار سال سے حجاز مقدس میں رہ کر حج وزیارت کی تمام راہوں سے اور

آسانیوں سے واقف ہو گئے ہیں اس لئے انھوں نے اپنے والدین کی خدمت بڑے اچھے انداز میں کی اور دیارِ مقدس کے یہ تین ماہ بڑی عافیت و آرام سے گذرے۔ ۹؍محرم سے ۱۰؍صفر تک مدینہ منورہ میں قیام نصیب ہوا، سابقہ تعارف و تعلق کے ساتھ ان کی موجودگی نے اس میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔

مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے عہدیداران میں شیخ حسین سراج مدیر عام شیخ عامودی مدیر مجلّہ رابطہ عالم اسلامی اور دوسرے اہل علم سے مسلسل ملاقاتیں اور تبادلہ خیالات کے مواقع کھل کر بے تکلفی کے ساتھ ملے اور تنقید و احتساب کے انداز میں گفتگوئیں رہیں، بار بار رابطہ عالم اسلامی میں آنا جانا ہوا اور اس کے اجلاس میں شرکت ہوئی، اپنے سلسلۂ علمی و روحانی کے مکی مرکز مدرسہ صولتیہ میں بار بار آنا جانا ہوا اور اس کے ارباب کار سے مخلصانہ ملاقاتیں رہیں، مکہ مکرمہ کے علماء و مشائخ خصوصاً شیخ سید علوی مالکی اور الاستاذ عبدالعال عقبادی سے ملنا جلنا رہا، مدینہ منورہ تو کہنا چاہئے کہ بالکل گھر بن گیا تھا شاید ہی کوئی علمی و دینی حلقہ ہو جس میں گذر نہ ہوا ہو، اور مختلف موضوعات پر بات چیت نہ ہوئی ہو جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ و شیوخ بڑے خلوص و محبت سے پیش آئے حضرت شیخ عبدالقادر سیبۃ الحمد استاذ جامعہ محترم ڈاکٹر عنتر، استاذ جامعہ شیخ سعدالدین ملباری مدرس جامعہ اور دوسرے حضرات نہ صرف محبت و اخلاص سے ملتے رہے بلکہ اپنے حسن اخلاق سے بڑے کریمانہ انداز میں پیش آتے رہے مذکورۃ الصدر تین حضرات نے بڑے اعزاز کے ساتھ کھانے پر بلایا اور کئی کئی گھنٹوں تک علمی و دینی مجلسیں رہیں مسجد نبوی میں مغرب کی نماز سے پہلے اور بعد ان میں اکثر حضرات کے ساتھ علمی مجلسیں ہوا کرتھیں اسی طرح ہندو پاک کے طلبہ نے اپنے اخلاص اور محبت کا اظہار کیا بڑی عقیدت سے ملتے تھے اور ساتھ بیٹھتے تھے ان میں اکثر نے باصرار انکار کے باوجود کھانے، ناشتے اور چائے

کی دعوتیں کیں۔ان سب میں سنجیدگی شرافت اور ذمہ داری کا احساس بدرجہ اتم مو
جود ہے اللہ تعالیٰ ان کو اسلام اور علوم اسلام کی سچی تڑپ دے اور مدینہ منورہ کے یہ طا
لبعلم مدینہ کی برکتوں سے مالا مال ہوں، مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت کے محترم ارا
کین اور مکتبہ محمودیہ کے مدیر ذاتی طور سے بڑے خلوص و محبت سے پیش آتے
تھے، مطالعہ، کتب بینی کے کافی اوقات ان بزرگوں سے تبادلۂ خیالات میں گذر جا
تے، جامعہ اسلامیہ متعدد بار جانا ہوا، اسباق میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا اس کے مختصر مگر
گراں قدر کتب خانے سے استفادہ کا موقعہ ملا، یہاں کے اساتذہ کا طرز تعلیم
ہمارے یہاں سے بالکل مختلف ہے، ہمارے یہاں عموماً کتابیں پڑھائی جاتی ہیں
اور یہاں پر فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اور کتاب سامنے رکھ کر فن سمجھایا جاتا ہے، اس
لئے باشعور طلبہ کیلئے یہ تعلیم بہت ہی مفید ہے، وہ کسی ایک فن کی ایک کتاب پڑھ کر
اس فن کو سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی حقیقت ان پر منکشف ہوجاتی ہے، اس لئے یہاں
کے تعلیمی معیار میں بعض لوگوں کے کلام کرنے کے باوجود بڑی افادیت ہے اس کا
صحیح اندازہ درس میں بیٹھنے اور طرز تعلیم پر غور کرنے سے ہوا، واپسی کے موقع پر جدہ
میں تین دن قیام رہا اس مدت میں جدہ میں مقیم ہندوستان کے نوجوان، ارباب ذوق
کے ساتھ بڑی پر لطف مجلس رہی، جناب عبدالرحیم انصاری (بمبئی) نے بڑے خلوص
ومحبت کا اظہار فرمایا اور اپنے حلقہ شعر وادب میں بڑے پر تکلف انداز میں پہونچایا۔
ایک رات کھانے کے بعد کئی گھنٹے تک پر لطف علمی وادبی محفل رہی اور آخر میں محترم
سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سکریٹری ہندوستانی سفارت خانہ جدہ نے اپنے
مکان پر نہایت پر تکلف عشائیہ کا انتظام کیا اور سعودی عرب کے جرائد ومجلّات کے
ایڈیٹروں، ادیبوں اور مصنفوں کو بھی مدعو کیا یہ تعارفی محفل بہت اہم اور مفید رہی۔
خاص طور سے شیخ حسین سراج، شیخ محمد احمد باشمیل اور سب سے بڑھ کر الاستاذ

عبدالقدوس انصاری مدیر مجلۃ **المنہل** بڑے خلوص ومحبت سے پیش آئے انھوں نے فرمایا کہ وہ بہت پہلے سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ مدرسہ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ کے طالب علم رہ چکے ہیں اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اوران کے بھائی مولانا سید احمد صاحب سے شرف تلمذ رکھتے تھے اس لئے ان کو اپنے سلسلہ علم کے علماء سے جذباتی تعلق ہے۔ دوسرے راقم کے عربی تاریخی مقالہ "**من النارجیل الی النخیل**" کوانہوں نے اپنے جریدہ المنھل میں مسلسل چار نمبروں میں شائع کیا تھا۔اورراقم کی کتاب "**رجال السند والھند**" پڑھی تھی۔ ان علمی وجوہ سے ان کا جذبہ خلوص بہت ہی نمایاں اورفراواں تھا، وہ تو چاہتے تھے بلکہ اصرار کرتے تھے کہ میں کل ۳۰ رجون کے آخری جہاز سے نہ جاؤں بلکہ ماہ دوماہ کے بعد کسی جہاز سے واپس ہوں۔

ان تمام علمی ودینی ملاقاتوں، محفلوں اور گفتگوؤں کی سب سے بڑی وجہ عربی زبان میں بات چیت تھی کئی مشائخ اور علماء نے حیرت سے بار بار دریافت فرمایا کہ عربی زبان آپ نے کہاں سے سیکھی ہے؟ راقم نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ میں پورے طور پر صحیح عربی زبان میں بات چیت نہیں کررہاہوں کیونکہ ہمارے یہاں اس کا موقع نہیں ملتا، پھر بھی کچھ کچھ زبان کھل گئی ہے، ہمارے ہندوستانی علماء وفضلاء اگر ذراسی جرأت دکھا کر اپنی زبان لکھا کریں تو عرب علماء کی محفلوں میں بہت جلد اپنا لوہا منوا سکتے ہیں کیونکہ وہ اہل علم کے بہت قدرداں ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں بڑا سلجھاؤ ہوتا ہے، چنانچہ بعض ہندوستانی علماء عربی میں بات چیت اور تقریر کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہیں جب کہ ان سے اونچے حضرات اپنی خاموشی کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور وہاں کے اہل علم سے ملنے جلنے سے کتراتے ہیں۔

×××××××××

ایک ہفتہ قاہرہ میں (جنوری ۱۹۷۸ء)

قاضی صاحب نے اپنے چوتھے حج کے بعد چھ ماہ تک بلاد عربیہ اور افریقہ کا دورہ کیا اس دورے میں مصر بھی شامل تھا، اسے قاضی صاحب نے ''البلاغ'' میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا، اس کے علاوہ اجمالی طور پر قاضی صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح (قاعدہ بغدادی......) میں اس سفر کی روداد لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

چوتھے حج ۱۳۹۷ھ (۱۹۷۶ء) کے بعد عزیزم خالد کمال سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاد عرب وافریقہ کا چھ ماہ تک ذاتی سفر کیا، اور جن مقامات میں گیا وہاں کے اہل علم اور کتب خانوں سے استفادہ کرتا رہا اس سفر میں سعودی عرب میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، طائف، الخبر، دمّام، ریاض، اور درعیّہ گیا، دمام سے ریاض تک ریل سے سفر کیا، یہاں سے کویت گئے جو ملک بھی ہے اور شہر بھی، قیام مرکز دعوت الارشاد میں تھا، امیر کویت کے انتقال کی وجہ سے عام بندی تھی، بعض اہل علم سے ملاقات ہوئی اور بعض کتب خانوں میں جانا ہوا، ادارۂ التراث العربی میں نہیں جاسکا جس کا میں مشیر علمی تھا۔ دو دن کے بعد دمشق گئے مگر وہاں کے حکام نے ہوائی اڈہ سے باہر نہیں جانے دیا، اور شام سے مصر کیلئے روانہ ہو گئے، وہاں قاہرہ کے میدان عتبہ میں کرنک ہوٹل میں کئی دن قیام رہا، جامع ازہر اور وہاں کے علماء، اساتذہ اور تلامذہ سے ملاقاتیں رہیں، قاہرہ سے متصل فسطاط اور جیزہ کے علاوہ حلوان اور اسکندریہ بھی جانا ہوا، پورا شہر قاہرہ دارالعلم اور دارالکتب معلوم ہوتا تھا، متحف قبطی (قبطی عجائب خانہ) کی کئی منزلہ شاندار عمارت میں فراعنۂ مصر کے مجسمے، ان کے استعمالی سامان اور حنوط کی ہوئی ان کی لاشیں رکھی ہوئی ہیں، اوپر کی منزل میں چودہ فرعونوں کی لاشیں صندوقوں میں قطار سے پڑی ہوئی ہیں جن میں فرعونِ موسیٰ کی لاش بھی ہے، اہرام اور ابوالہول عبرت گاہ ہیں۔

فسطاط کی جامع عمرو بن عاصؓ میں نماز پڑھی، اس کے ایک گوشہ میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا مزار لکڑی کے حظیرے میں ہے، اسی علاقہ میں امام شافعیؒ کا بھی مزار ہے، کشتی میں بیٹھ کر دریائے نیل پار کیا، مصر سے گھانا (مغربی افریقہ) کا سفر ہوا جہاں عزیز مولوی خالد کمال دارالافتاء کی طرف سے مبعوث تھے، اس کے دارالحکومت ''اکرا'' میں کئی ماہ قیام رہا اور وہاں کی بام یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبۂ عربی سے خوب خوب استفادہ کیا، امام سمعانیؒ کی کتاب'' الاملاء والاستملاء'' نقل کی، ابن حوقل کی کتاب ''صورالارض'' ابن اخوہ کی کتاب ''معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ'' وغیرہ سے اقتباسات نقل کئے، علمائے اندلس کی کئی کتابوں کے عکسی فوٹو کی زیارت کی، مشہور ماہر بحریات ماجد نجدی کی متعدد کتابیں یہاں موجود ہیں، کوماسی، کیپ، کوسٹ، تمالے اور شمالی علاقوں کا ہفتوں تک دورہ کیا، اسی سے متصل ٹوجو (لومی) کی سیاحت کی، واپس قاہرہ آکر رجال السند والہند کی طباعت کا معاملہ دارالانصار سے طے کیا، ہوٹل لوسکی میں کئی دن قیام رہا، طبقات المفسرین داؤدی، کتاب البرہان والعمیان جاحظ، اور بعض دوسری کتابیں خریدیں، قاہرہ میں الاستاذ عبدالمنعم النمر، شیخ صلاح ابو اسمٰعیل مصری اور ڈاکٹر عبدالعزیز عزت سے بار بار ملنا جلنا ہوتا تھا، اکثر وقت جامع ازہر کے اداروں اور کتب خانوں میں گذرتا تھا، قاہرہ سے اردن کیلئے روانہ ہوئے، دارالسلطنت عمان پہاڑوں کے نشیب وفراز میں آباد ہے، یہاں فندق ابراہیم میں قیام رہا، یہاں سے ملک شام کیلئے کوشش کی مگر ناکامی رہی، حکومت اردن کی اجازت سے بیت المقدس میں حاضری کا ارادہ کیا اور ارضِ محتلہ میں داخل ہوگئے، مگر اسرائیل نے واپس کردیا، اردن یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی، ادارۂ شؤونِ اسلامیہ واوقاف نے اپنی مطبوعات دیں، ایک دن زرقاء جانا ہوا، وہاں کوئی مسجد نظر نہیں آئی اور کئی گرجے دیکھے، اردن میں رومیوں کے قدیم مدرج اور آثار بہت زیادہ ہیں، عجائب خانہ میں اموی خلفاء وامراء کے لباس اور استعمالی ظروف موجود ہیں۔

یہاں سے بذریعہ ٹیکسی سعودی عرب کیلئے روانہ ہوئے، راستہ میں معان، قلعہ کرک وغیرہ آئے، عصر اور مغرب کے درمیان مقامِ حجر سے گذرے جو قومِ ثمود کا مسکن تھا، سلسلہ کوہ دور تک چلا گیا ہے۔

درمیان میں سڑک ہے پہاڑوں میں قومِ ثمود کے مساکن کے آثار نظر آتے تھے، رِمالِ متحرکہ جگہ جگہ تودے کی شکل میں تھے، سرِ شام سعودی عرب کی سرحد حالۃ عمار سے گذرے، تبوک سے دوسری ٹیکسی پر چلے، رات میں مقام العلاء سے گذرے جو بارونق شہر ہے، اس علاقہ کو کتابوں میں ''قریٰ عربیہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، خیبر سے گذرتے ہوئے مدینہ منورہ پہونچے، دوچار دن قیام کر کے مکہ مکرمہ اور وہاں سے جدّہ آئے، استاذ عبدالقدوس انصاری مرحوم مدیر مجلّہ ''المنہل'' نے اپنی جملہ تصانیف ہدیہ میں عنایت کیں، ریاض پہونچ کر فندق التاج الجدید میں دارالافتاء کی طرف سے قیام ہوا، مؤرخ الجزیرہ استاذ احمد الجاسر نے دار الیمامہ کی مطبوعات ومنشورات ہدیۃً دیں، دار عبدالعزیز کے مدیر محترم نے اس کی مطبوعات پیش کیں، اور فضیلۃ الشیخ عبد الفتاح ابوغدہ نے اپنی تصانیف ومطبوعات کا ایک معتد بہ حصہ عنایت فرمایا، وہاں کے بعض کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

۲۵؍محرم تا ۷؍صفر ۱۳۹۸ھ (۳؍تا۱۵؍جنوری ۱۹۷۸ء) قاہرہ میں قیام رہا، اس سفر میں حرمین شریفین کے بعد سب سے زیادہ وابستگی اور دلچسپی قاہرہ اور مصر میں رہی اور بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہوئی۔ قاہرہ واقعی **بلد الکتب والکتاب** اور **دار العلم والعلماء** ہے۔ اسی دوران میں حُلوان اور اسکندریہ بھی جانا ہوا۔ جامعہ ازہر کے شیوخ واساتذہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہاں زیر تعلیم ہندوستانی طلبہ سے ملنا جلنا رہا۔ مساجد وجوامع کے جلال وجمال کو بھی دیکھا اور ائمہ ومشائخ کے مزارات پر حاضری اور فاتحہ خوانی بھی ہوئی، اپنے خاص ذوق کے مطابق اہل علم اور کتب خانوں سے دلچسپی نسبۃً زیادہ رہی۔ تجارتی کتب خانوں میں اپنی عربی دونوں تصنیفات

''رجال السند والهند ''اور''العقد الثمين ''دیکھیں،ضرورت منداہل علم خریدتے ہیں۔ پاکستان کے ایک طالب علم ملے جو جامعہ قاہرہ میں عرب وہند کے تعلقات پر ڈاکٹریٹ کررہے ہیں۔ بڑی بے صبری سے ملاقات کیلئے آئے اور بتایا کہ میں نے دہلی، بمبئی اور کراچی میں آپ کی تصنیفات کیلئے لکھا بلکہ آپ کو بھی لکھا مگر اب تک مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔''رجال السند والهند '' کیلئے برٹش لائبریری کیلئے لکھا تو وہاں سے جواب آیا کہ کتاب موجود ہے مگر اس کا اجراء نہیں ہوسکتا موصوف اس موضوع پر مذاکرہ کرتے رہے اور اس دوران میں جو کتابیں میرے پاس تھیں ان سے مطلب کی بات حاصل کی بلکہ ایک کتاب یہ کہہ کر رکھ لی کہ تین ماہ بعد اس کو ڈاکٹر عبدالعزیز عزت کے حوالہ کردوں گا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری علماء میں ہمارے پرانے علمی دوست اور نہایت مخلص انسان ہیں، پہلے بمبئی میں مبعوث الازہر تھے پھر پاکستان گئے اور اب جامعہ ازہر میں وکیل شئون البعثات ہیں، موصوف نے میری کتاب ''عرب وہند عہد رسالت میں'' کا عربی میں ترجمہ "العرب والهند فی عهد الرسالة" کے نام سے کیا، جسے جامعہ ازہر کے مجمع البحوث الاسلامیه نے طبع کرکے شائع کیا ہے، موصوف نے بتایا کہ چھ سو کتابوں میں صرف چھ کتابوں کو مجمع البحوث الاسلامیہ نے ترجمہ کیلئے منتخب کیا، جس میں یہ کتاب بھی شامل تھی، پھر ان چھ کتابوں سے تین کتابوں کا انتخاب عمل میں آیا، ان میں یہ کتاب تھی، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کی کس قدر اہمیت وضرورت محسوس کی جارہی تھی۔

موصوف نے میری ایک اور کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا عربی ترجمہ "حكومات العرب فی الهند والسند" کے نام سے کرکے اسلام آباد کے ادارہ مجمع البحوث الاسلامیہ کے عربی مجلّہ "الدراسات الاسلامیه"میں قسط

وار شائع کرایا ہے، جس کی کاپی موصوف نے مطالعہ کیلئے دی، وہ اب ہر کتاب کو قاہرہ سے شائع کرنے کا انتظام کررہے ہیں ۔ نیز وہ میری کتاب ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' کے ترجمہ کی تیاری کررہے ہیں، اس سلسلہ میں یہ اہل علم کیلئے دلچسپی کا باعث ہے کہ میری کتاب ''رجال السند والهند ''بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی اوراب بالکل نادرونایاب ہوچکی ہےاورعرب ممالک میں خاص طور سے اس کی تلاش رہا کرتی ہے نیز اس درمیان میں راقم نے بہت سے نئے تراجم کا اضافہ کیا ہے اور کتاب کو نئے سرے سے مرتب کر کےاس کی القسم الثانی (۱) بھی تیار کرلی ہے، اس طرح یہ کتاب مزید اہمیت کی حامل ہوگئی ہے،اس سفر میں اس کا مسودہ ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ کسی عرب ملک میں اس کی اشاعت کا انتظام ہوجائے، چنانچہ قاہرہ کے ایک ادارہ سے اس کی طباعت واشاعت کی بات چیت تقریباً مکمل ہوچکی ہےاورانشاءاللہ یہ کتاب مزید تحقیق وتنقیح اورا ضافہ کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہوگی ۔(یہ کتاب **دارالانصار قاهره** سے دوجلدوں میں شائع ہوچکی ہے)

☆☆☆☆☆☆☆

سرزمین مصر فراعنہ کے دور سے آج تک وقتاً فوقتاً ارباب دین ودیانت اور

---

(۱) رجال السند والهند کی دوسری طباعت میں قاضی صاحب نے ایک گرانقدر اضافہ ''القسم الثانی '' کا کیا ہے، جوایک مستقل تصنیف ہے، قسم اول میں صرف ان رجال کو شامل کیا گیا تھا جوسندھ وہند کے کسی حصہ میں پیدا ہوئے اوران کی زندگی یہیں گذری چاہے کسی وجہ سے ان کی وفات باہر کسی ملک میں ہوئی، یا ان رجال کو جن کی اصلیت سندوہند سے ثابت ہوگوان کی پیدائش وبودوباش کسی اورملک کی ہو، تیسری قسم ان رجال کی ہے جن کی اصلیت وپیدائش تو کسی اور ملک کی ہے لیکن سیاسی، اقتصادی یا تبلیغی اغراض سے آکر سندوہند کے کسی علاقہ میں آبسے، یا اپنی مہم پوری کر کے واپس چلے گئے، ان لوگوں کو بالقصد پہلی جلد میں شامل نہیں کیا گیا تھا، یہ قسم بلاشبہ سندھ وہند کی ثقافتی تاریخ کے تعلق سے ایک بے مثال کارنامہ ہے، جس کی ضخامت ۲۷۲ر صفحات اوردرج شدہ تراجم کی تعداد ۲۴۵ر ہے،

اہل علم وفضل کے حق میں فتنہ وفساد اور قتل وغارت کا مرکز رہی ہے، اسلامی دور میں فاطمیوں اور اسمٰعیلیوں نے مسلمانوں اور ان کے علماء کوظلم وستم کا نشانہ بنایا، اس کے بعد یورپ کی استبدادی طاقتوں نے اپنا کھیل کھیلا، آخر میں اخوان المسلمون پر قیامت توڑی گئی اور چند ماہ پہلے دینی طبقہ ایک بار پھر ایک سازش کے تحت ابتلاء میں ڈالا گیا اور وزیر اوقاف محمد حسین الذہبی مرحوم کے قتل کو بہانہ بنا کر دینی حلقہ کے چند افراد کو پھانسی دی گئی اور کئی کو جیل میں بھرا گیا اور ان کو ایک فرضی انجمن ”جماعة التکفیر والھجرة“ کا رکن بتایا گیا۔ یہاں آنے کے بعد وزیر اوقاف محمد حسین الذہبی نے ایک خاص اور صاحب اثر ورسوخ وزیر کے رشتہ دار کے ذمہ لاکھوں کا غبن نکالا اور اس مجرم کو بچانے کیلئے یہ کھیل کھیلا گیا کہ وزیر موصوف کو غائب کر کے قتل کرا دیا گیا پھر دینی طبقہ پر ان کے قتل کا الزام لگا کر پانچ کو پھانسی دی گئی، ۱۲؍کو جیل میں بھرا گیا حالانکہ ان کو اس قتل سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا اور حکومت نے اپنی طرف سے مشہور کیا کہ مصر میں ایک تشدد پسند نئی پارٹی ”جماعة التکفیر والھجرة“ کے نام سے پیدا ہوئی ہے، جس نے شیخ حسین الذہبی کو قتل کیا ہے، اس پارٹی کا مقصد ناپسند افراد کی تکفیر کرنا اور ان کے حلقہ اقتدار سے ہجرت کر جانا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں کی تبلیغی جماعت کو ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

افسوس کہ جامعہ ازہر کے ذمہ دار علماء اس دور میں حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کی پالیسی پر پوری طرح عمل کر رہے ہیں اور ان میں مصلحت بینی آ گئی ہے، ورنہ کیا مجال ہے کہ شیخ الازہر کے ہوتے ہوئے حکومت مصر ارباب دین ودیانت کا بال بیکا کر سکے۔

(ماہنامہ البلاغ بمبئی، مارچ ۱۹۷۸ء)

☆☆☆☆☆☆☆

بھوپال میں تبلیغی اجتماع (دسمبر ۱۹۵۶ء)

۱۵۔دسمبر کو بمبئی سے بھوپال جانے کا اتفاق ہوا اب بھوپال اگر چہ اپنی سابقہ روایات کو ختم کر چکا ہے مگراس کا نام آتے ہی حکمرانی سے زیادہ علم وفضل کی سرپرستی کا تصور پیدا ہوتا ہے، بھوپال ایک زمانہ میں ہندوستان کا وہ خوش نصیب خطہ رہ چکا ہے جہاں ملک وبیرون ملک کے بڑے بڑے ارباب علم وفن رہا کرتے تھے، اوراس مرکز سے ملک اور بیرون ملک کی علمی مجلسیں وابستہ رہا کرتی تھیں، مدتوں سے اس خطہ کو دیکھنے کا شوق دامنگیر تھا خاص طور سے اس لئے اور بھی اس سے وابستگی تھی کہ اعظم گڈھ کے علمی رجال اور بعض علمی اداروں کواس سے خاص تعلق رہا ہے، مرحوم نواب صدیق حسن خاں صاحب کے زمانے میں یہاں مولانا سلامت اللہ جیراج پوری محتسب وعظ تذکیر تھے، مرحومہ بیگم صاحبہ بھوپال نے علامہ شبلی نعمانی کو سیرت النبی کی تصنیف کے لئے گرانقدر رقم عنایت فرمائی تھی، اوردارالمصنفین اعظم گڈھ کواس سے کافی مدد ملتی تھی اسی طرح بعض دوسرے حضرات بھی اس سے وابستہ تھے۔

یہاں پر حسب معمول ۱۵۔۱۶۔اور ۱۷۔دسمبر کو تبلیغی جماعت ہند کا سالانہ اجتماع تھا، بمبئی سے جو لوگ اس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے ان میں جناب احمد غریب صاحب سکریٹری انجمن خدام النبی، جناب حاجی محمد عبداللہ صاحب، جناب حافظ محمد صدیق المیمنی، الحاج محمد یوسف صاحب، جناب اسماعیل ہاشم صاحب اورالحاج محی الدین منیری صاحب وابستگان واراکین انجمن خدام النبی بمبئی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، راقم الحروف بھی اسی قافلہ کی معیت میں اس سال بھوپال کے

سالانہ تبلیغی اجتماع میں شریک ہوا۔

بھوپال کی شاندار دینی اور مذہبی تعمیرات میں ''تاج المساجد'' کی نامکمل عمارت قرطبہ اور غرناطہ کے قصور و محلات کی ادھوری داستان سنا رہی ہے، اس کی سنگین عمارت وسیع و عریض صحن سہ طرفی حجرے اور زاویے آج بھی وہ تمام سماں پیش کر رہے ہیں، جو مسلمانوں کے دور اقبال میں بغداد و بصرہ اور دمشق و شام اور اندلس کی شاندار مسجدیں اور ان کی تعمیرات پیش کر رہی تھیں، تاج المساجد میں ایک شاندار مدرسہ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے نام سے قائم ہے جو چند ہی سالوں میں ترقی کر کے اچھے خاصے معیار پر پہونچ گیا ہے، بھوپال کی علمی شخصیتوں مین ہم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری کو متحرک ہستی سے تعبیر کر سکتے ہیں، مولانا ایک طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کی نگرانی کرتے ہیں اور دوسری طرف دینی کاموں کے ساتھ اس عظیم الشان ادارہ کو چلا رہے تھے دارلعلوم تاج المساجد کا کتب خانہ کتابوں کی کثرت حسن انتظام اور افادیت کے اعتبار سے ملک کے خاص کتب خانوں میں سے ایک ہے، دو دن کی ہماہمی میں ہم نے جو دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ دارالعلوم تاج المساجد مسلمانان ہند کے لئے ایک عظیم الشان دینی اور علمی مرکز بن سکتا ہے، افسوس کہ مولانا عمران خاں صاحب کے محبت آمیز اصرار کے باوجود راقم الحروف دو چار دن بھوپال میں ٹھہر نہ سکا، اور پورے طور پر بھوپال کی علمی اور دینی یادگاروں کی زیارت نہ کر سکا، اور ان کے حالات سے باخبر نہ ہو سکا، (انشاء اللہ پھر کبھی)

تاج المساجد کے تینوں طرف جو مدرسہ کے لئے سنگین حجرے بنوائے گئے ہیں ان پر بنوانے والوں کے نام اور حصول ثواب کی نوعیت درج کی گئی ہے، ان کتبوں میں اکثر و بیشتر نام اللہ کی ان بندیوں کے نظر آئے جنھوں نے اپنی جیب خاص سے حجرہ تعمیر کرایا ہے، ان مسلمان خواتین اور بیگمات کی دریا دلی کو دیکھ کر اندازہ

ہوا کہ عورتوں میں آج بھی دین کی تڑپ اور خدا کی راہ میں ایثار واخلاص کی مقدار بدرجہ اتم موجود ہے اوراس گئے گذرے زمانے میں بھی مسلمان مستورات دورا قبال کی یاد باقی رہنے میں پیش پیش ہیں۔

تاج المساجد بھوپال تین دن تک ہندوستان اور بیرون ہند کے دردمند مسلمانوں کی بستی بنی رہی ،جس میں جاہل گنوار سے لیکر بڑے بڑے علماء ،فضلاء، اطباء،ڈاکٹر،فوجی افسران،سرکاری ملازمین جدید تعلیم یافتہ اعلیٰ ڈگریوں کے مالک قدیم ذہن کے لوگ تاجر،کاریگر،مزدورغرضکہ ہرطبقہ اور ہر خطہ کے مسلمان ایک مقصد کے لئے جمع تھے جہاں نہ کسی میں اپنی بڑائی کا غرور تھا اور نہ کسی کو اپنی چھٹائی کا احساس تھا، بلکہ ہر شخص دوسرے کو اپنے سے بہتر سمجھنے میں سعادت مندی تصور کرتا تھا،کم سے کم دس ہزار مسلمان یہاں جمع تھے جوملک کے دوردراز حصوں سے انفرادی اوراجتماعی طور پر آئے تھے،کم سے کم پانچ ہزار آدمی تین دن تک دونوں وقت ناشتہ اور کھانا ساتھ کھاتے تھے اوران سب کے قیام وطعام کا انتظام تاج المساجد اوراس کے وسیع صحن کے خیموں اوراطراف کے حجروں میں تھا ان تمام لوگوں کے رہنے کھانے اور ٹھہرنے کا انتظام بہت ہی پرسکون باضابطہ اوراطمینان بخش تھا ہم نے اس سے پہلے کسی اتنے بڑے اجتماع میں ایسا انتظام نہیں دیکھا تھا، جوعلماء اس عظیم الشان اجتماع میں روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے ان میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ،حضرت مولانا محمد منظور نعمانی،حضرت مولانا محمد یوسف نظام الدین دہلی ،حضرت مولانا محمد عمران خاں ندوی،الاستاذ عبدالمنعم النمر ،الاستاذ عبدالعال العقباوی بعثۃ ازہر مصر برائے دارالعلوم دیوبند اورکئی دوسرے حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس اجتماع کی بدولت مصر کے دونوں فضلاء سے اچھی خاصی ملاقات رہی اور کئی علمی موضوعوں پر گفتگو رہی نیز آیندہ اس علمی علاقہ کے بقاء کا وعدہ ہوا،مولانا علی

میاں صاحب کی پرشفقت باتیں اور مشورے ہر طرح قابل احترام ہیں، مولانا عمران خاں صاحب بھی اپنی رات دن کی مصروفیت کے باوجود خصوصی توجہ فرماتے رہے۔

بھوپال کا یہ سہ روزہ تبلیغی اجتماع اپنی سادگی، باضابطگی اور کارکردگی کے اعتبار سے بہت ہی اہم اور نتیجہ بخش رہا ہے اس اجلاس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس وقت عام طور سے کانفرنسوں اور اجلاسوں کا اختتام ہوتا ہے اور تجاویز پاس کر کے ان پر عملدرآمد کرنے کے لئے کمٹیاں بنائی جاتی ہیں اس وقت یہاں کام شروع ہوتا ہے اور اس اجتماع کے خاتمے ہی سے اس کے کام کی ابتدا ہوتی ہے، چنانچہ اس سال بھی یہی صورت رہی کہ جب ہند اور بیرون ہند میں تبلیغی جماعتوں کے لئے تشکیل کا اعلان ہوا تو دوسرے ہی دن سات سو سے زیادہ لوگوں نے اپنی مصروفیت اور ضرورت کے پیش نظر جس قدر ہوسکا تبلیغی وفد میں شرکت کے لئے وقت دیا، کسی نے ایک ہفتہ دیا کسی نے ایک چلہ کی قربانی پیش کی اور کسی نے ماہ دو ماہ بلکہ سال دو سال دئے، ان میں ان پڑھ کسانوں مزدوروں سے لیکر تعلیم یافتہ لوگوں تک کی شرکت رہی یہ بات بہت ہی اہم اور خاص ہے کہ اس اجتماع کا خاتمہ ہی درحقیقت اس کے کام کی ابتداء ہوتا ہے، اور جس وقت اس کا انجام ہوتا ہے اسی وقت سے اس کا آغاز ہوتا ہے، یہ بات کسی کانفرنس یا اجتماع میں نظر نہیں آتی چنانچہ اجتماع کے ختم ہوتے ہی ''تاج المساجد'' سے بہت سی جماعتیں ملک کے مختلف حصوں میں تبلیغ کے لئے روانہ ہوئیں ان کی روانگی کا سماں بہت ہی پر کیف اور رقت انگیز ہوتا ہے اور جانے والوں اور پہونچانے والوں میں یکساں اخلاص وایثار کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔

مصر کے دو عالم الاستاذ عبدالمنعم النمر اور الاستاذ عبدالعال العقباوی سے اس طرز تبلیغ اور طریقۂ کار پر گھنٹوں گفتگو ہوئی ان حضرات نے برملا فرمایا کہ مصر میں یہ طریقہ بہت ہی مفید ہوسکتا ہے، اگر وہاں پر بھی اسی طرح مسلمانوں کی ٹولیاں دیہات

کے جاہل عوام کو دین کی باتیں بتاتے اوران میں دین وایمان کا شعور پیدا کرنے کے لئے نکلیں تو ہندوستان کی طرح وہاں بھی بڑا کام ہوسکتا ہے،انھوں نے کہا کہ یہ طرز تبلیغ ان مسلمانوں کے لئے بیحد مفید ہے جوشہروں سے دور دراز دیہاتوں میں رہتے ہیں، اور برسہابرس نہ وہ شہر میں آتے ہیں نہ مسلمانوں کی علمی اور دینی باتوں سے ان کو واقفیت ہوتی ہےاوراس طرح وہ اسلام کے صحیح عقائداوراعمال سے دور ہوجاتے ہیں ان مسلمانوں کی دینی تربیت اوراسلامی تعلیم کیلئے یہ طریقہ کارنہایت ہی مفید ہے۔

اس اجتماع کا یہ منظر بھی بہت ہی روح پرور اور خوش کن تھا، کہ تاج المساجد کی وسیع وعریض زمین تین دن تک وعظ وتذکیر، ذکروفکر، تعلیم وتربیت، نماز وتلاوت سے اس طرح آباد رہی کہ اس میں آنے والوں کے بستر پڑے ہوئے ہیں مختلف حلقوں میں خاص خاص علاقوں کے لوگ اپنے اطراف میں کام کرنے پر رائے مشورہ بھی کررہے ہیں، کوئی کھڑا ہوکر تقریر کررہا ہے،کوئی صاحب اپنے حلقے کو ذکروفکر کی تلقین کررہے ہیں، مسجد کے باہر میدان میں جگہ جگہ خیمے نصب ہیں جن میں آنے والے حضرات قیام پذیر بھی ہیں، اوران ہی میں وعظ وتذکیر کی محفل بھی برپا ہےاور جب نماز کاوقت ہوگیا توان ہی میں نماز کے لئے صف بھی بنادی گئی، اس طرح کم وبیش دس ہزار آدمی مسجد کے اندرونی حصوں میں صحن، خیموں میں، اطراف کے کمروں میں اور کھلے میدان میں رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کبھی وعظ سن رہے ہیں، کبھی نماز پڑھ رہے ہیں کبھی ذکر میں مشغول ہیں کبھی درس وتدریس کے حلقے میں ہیں اور کبھی عام وعظ میں موجود ہیں، غرض کہ اس مسجد میں تین دن کے لئے آنے کے بعد زندگی کے ۷۲ گھنٹے دین اورصرف دین کے کاموں اوراس کی خدمت کے تصور میں گذرتے ہیں، اور جب ۷۳واں گھنٹہ شروع ہوتا ہےتواس سہ روزہ اجتماع کا نتیجہ لیکر شروع ہوتا ہے، اکثر وبیشتر لوگ نیک اثرات، لطیف احساسات اور حسین جذبات

لے کر لوٹتے ہیں اور ان میں کتنے حضرات جماعت میں شامل ہو کر وہیں سے کسی مقام کے لئے نکل جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنی نوعیت اور آغاز و انجام کے اعتبار سے بھوپال کا یہ تبلیغی اجتماع بے نظیر رہا یہاں نہ مجلس مضامین کی ہما ہمی تھی نہ تجاویز پر جرح وقدح کا ہنگامہ تھا، نہ مختلف گروپ اپنی اپنی تجویز کے لئے کنونشن کر رہے تھے، نہ کسی میں کسی سے کسی قسم کی کوئی کھینچا تانی تھی، آدمیوں کی طرح ان کے اعلیٰ اور ادنیٰ سامان تاج المساجد کے کمپاؤنڈ میں پڑے ہوئے تھے، نہ کوئی چوری کرنے والا اور نہ ہی کوئی نگرانی کرنے والا، اگر کسی کا کوئی سامان ادھر سے ادھر ہو گیا تو وقتاً فوقتاً لاوڈ اسپیکر سے اعلان کیا جاتا کہ فلاں فلاں چیزیں ملی ہیں جن حضرات کی ہوں وہ مائک پر آکر لے لیں، نہ ٹھہرنے کے لئے جگہ کا سوال، نہ سامان کی نگرانی کا سوال، اور نہ ہی سونے، اٹھنے بیٹھنے کی کوئی فکر، موسم کے اعتبار سے ٹھنڈے پانی کے ساتھ گرم پانی کا نہایت معقول انتظام تھا، جگہ جگہ نل لگائے گئے تھے، سقاؤں اور حوضوں پر آدمی مقرر تھے، جو لوگوں کو پانی نکال نکال کر دیا کرتے تھے، اس طرح نہ پانی پر بھیڑ ہوتی تھی، نہ وہاں کیچڑ ہوتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی گندگی ہوتی تھی، اسی طرح جگہ جگہ منتظمین کی تعیناتی سے نظم وضبط کی نہایت خوشگوار طور پر بحالی رہی۔

بھوپال کا یہ اجتماع ہزاروں حضرات کی طرح ہماری نظر میں بھی مسلمانوں کیلئے حد درجہ مفید اور ضروری تھا، اور اس طریقۂ کار سے موجودہ دور میں بڑا کام ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی خدمت کی اہلیت عطا فرمائے اور دین پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین (البلاغ، بمبئی، جنوری ۱۹۵۷ء)

☆☆☆☆☆☆☆

بمبئی سے ایلورا تک (اکتوبر ۱۹۵۷ء)

یکم اور ۲؍ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو خلد آباد اورنگ آباد میں ایک کانفرنس ہوئی، جس کی صدارت جناب سید غیاث الدین قاضی وزیر سپلائی حکومت بمبئی نے فرمائی، جمعیۃ علماء بمبئی کے صدر محترم جناب مولانا حکیم اعظمی اور جنرل سکریٹری مولانا حامد الانصاری غازی کے ساتھ اس میں شرکت ہوئی، اور ''الثلاثۃ جماعۃ'' کے اصول پر یہ جماعت ۳۰؍ ستمبر کو بمبئی سے روانہ ہوئی۔

منماڑ کے بعد سفر ایس، ٹی کے ذریعہ ہوا، جوں جوں مرحوم ریاست حیدرآباد کی حد قریب ہوتی جاتی تھی، دل میں مختلف قسم کے مثبت و منفی خیالات آتے جاتے تھے، حتیٰ کہ اورنگ آباد کے قریب ایک ناکہ آیا جہاں بورڈ پر ''دولت آباد'' لکھا تھا، اس پر نظر جاتے ہی ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے کتنے ہی نقشے ذہن میں بننے اور بگڑنے لگے اور تھوڑی دیر کیلئے راقم اپنے ہم سفروں سے جدا ہو کر ابن بطوطہؒ، آزاد بلگرامیؒ، اور دوسرے مورخوں اور سیاحوں کے ساتھ ہو گیا۔

اس مقام پر بار بار خیال حضرت شیخ شہاب الدین دولت آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا آیا جو شیرازِ ہند جونپور میں اٹالہ کی مسجد کے سامنے آرام فرما ہیں، اور جن کے علم و فضل پر ان کی تصنیفات آج بھی شاہد ہیں، آپ سلطان ابراہیم شاہ شرقی بادشاہ جونپور کے مرشد و استاذ ہیں، ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو بادشاہ نے آپ کے گرد پانی سے بھرا ہوا پیالہ گھما کر دعا کہ کہ الٰہی! مولانا کی بلا مجھ پر آجائے اور ان کو شفائے کلی ہو جائے۔

یہاں سے دولت آباد کا وہ قلعہ نظر آیا جو کہ پہاڑ کی بلندی پر عظمت رفتہ کی پُر سکون داستان سنا رہا ہے، اور اپنے رہنے والوں اور آباد کرنے والوں کی ایمانی قوت

اور روحانی طاقت کا مظہر ہے۔

اورنگ آباد کی پن چکی:

ہم اورنگ آباد پہونچے، یہ وہی اورنگ آباد ہے جہاں سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے رُعب وجلال اور فضل وکمال کی پونجی دفن ہے، اور جہاں قدم قدم پر مغلوں کے آرٹ اور ثقافت کے نمونے آج بھی باحالِ زار وہ سب کچھ بتارہے ہیں جو سننے والے کانوں، دیکھنے والی آنکھوں اور سمجھنے والے دلوں کو عبرت وموعظت دے سکتے ہیں، اورنگ آباد کی ''پن چکی'' عجائباتِ عالم میں سے ایک ہے، اس پر دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، فن تعمیر کا جو کمال یہاں نظر آتا ہے وہ آج سائنسی اور ایٹمی دور میں کہیں نظر نہیں آتا، اور دنیا کے بڑے بڑے صناع وفنکار اس کے مبداء ومنتہا کے معلوم کرنے سے عاجز ہیں، پن چکی کے علاوہ یہاں کی مساجد، مزارات، قلعہ جات، فصیل، غرض کہ ایک ایک چیز ماضی کی بے پناہ عظمت لئے ہوئے ہے۔

اورنگ آباد کا محل وقوع تمدن وحضارت کے مزاج کی بلندی کی نشانی ہے۔ سرسبز وشاداب ہرے بھرے پہاڑوں کی وادی میں یہ خوبصورت سا شہر بحر اخضر کی ناہموار سطح میں گھرا ہوا ایک جزیرہ معلوم ہوتا ہے۔

افسوس کہ مصروفیات کی وجہ سے اورنگ آباد کی تفصیلی اور تاریخی سیر پورے طور سے نصیب نہ ہوسکی اور اس کام کو کسی دوسرے وقت کیلئے ہم نے اُٹھا رکھا۔

دولت آباد کا تاریخی پس منظر:

یکم/اکتوبر کو چار بجے ہم لوگ خلد آباد کیلئے روانہ ہوئے، معلوم ہوا کہ دولت آباد سے ہوکر جانا ہے، ہم نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے دولت آباد کی سرزمین پر اتر کر قدم رکھیں گے، جہاں کے ذرہ ذرہ پر عظمتِ رفتہ کی بے شمار

نشانیاں آج بھی دیدۂ عبرت کیلئے تاباں و درخشاں ہیں، تقریباً پون گھنٹہ میں ہم دولت آباد کی حدود میں داخل ہو گئے۔

یہ وہی مقام ہے جو پہلے دیوگیر کے نام سے مشہور تھا مگر محمد تغلق شاہ نے دہلی کے بجائے اس محفوظ پُر فضا پہاڑی مقام کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اور دولت آباد نام رکھا، سلطان محمد تغلق مورخوں کی نظر میں عجائباتِ دنیا میں ایک تھا، اس نے سوچا کہ دارالسلطنت ایسی جگہ ہونا چاہئے جو وسطِ ملک میں واقع ہو اور ہر جگہ کے حالات سے باخبر ہونے میں آسانی ہو، کچھ لوگوں نے اس کے لئے اُجّین کا انتخاب کیا اور بتایا کہ راجہ بکر ماجیت نے اس شہر کو اپنا مرکز بنایا تھا اور یہاں پر ہندوستان کی رصد گاہ بنوائی، مگر دربار کے سمجھ دار آدمیوں نے بتایا کہ دیوگیر وسطِ ہند میں واقع ہے، سلطان تغلق ملکی حالات اور ہمسایہ ممالک کی سیاست سے آنکھ بند کر کے دہلی کے بجائے دیوگیر (دولت آباد) کو دارالسلطنت بنایا، علامہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ دہلی جو رشکِ فردوس تھا اس طرح تباہ و برباد ہو گیا کہ اس کے گلی کوچوں میں دن کو گیدڑ، کتے اور دوسرے جنگلی جانور چلنے پھرنے لگے، اور وہاں کے تمام مرد، عورت، بچے، بوڑھے، دیوگیر چلے آئے، ہر آدمی کا سفر خرچ شاہی خزانہ سے ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہر منزل پر سرائے بنوائی گئی، سڑک پر دورویہ درخت لگوائے گئے، اور بادشاہ نے دیوگیر کا نام دولت آباد رکھ کر سر بفلک عمارتیں، قلعہ جات اور مساجد بنوائیں، دولت آباد کے گھاٹوں کے اوپر باغات اور حوض اور امرائے سلطنت اور شاہزادوں کے لئے مکانات بنوائے، اور دولت آباد سے دکن کے بعض علاقوں کو فتح کیا۔

مگر چند سالوں کے بعد خبر لگی کہ بادشاہ کے دہلی چھوڑنے کی خبر پا کر ملتان کے حاکم بہرام نے بغاوت کر دی ہے، محمد تغلق نے دولت آباد سے ملتان پر فوج کشی کی اور فتح یاب ہو کر دہلی واپس آیا۔ اس کے نتیجہ میں جو لوگ دہلی سے دولت آباد چلے گئے

تھے سخت پریشان ہوئے، اور ان کی زندگی تتر بتر ہوگئی۔

دوسری بار پھر سلطان ۷۴۲ھ میں دکن واپس آیا مگر اب کے بری طرح بیمار ہوا اور دولت آباد کی حکومت اپنے استاذ بقلغ خاں کو سپرد کر کے دہلی آیا۔

جب سلطان دہلی واپس آیا تو دہلی میں قحط اور گرانی کا یہ عالم تھا کہ ایک سیر غلہ ۱۷ درہم میں بھی نہیں ملتا تھا۔

مغربی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں دولت آباد کے بہت سے واقعات لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام اس کے زمانہ میں کس قدر مرکزیت حاصل کر چکا تھا ، ابن بطوطہ محمد تغلق کے زمانہ میں تقریباً نو سال تک ہندوستان میں رہا ہے۔

مینار، حمام، اور قلعہ وغیرہ:

دولت آباد جیسا کہ ہمیں بتایا گیا، سطحِ سمندر سے تقریباً دو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے، پورا علاقہ سرسبز و شاداب پہاڑوں سے معمور ہے، آس پاس کی پہاڑیوں پر مغلوں کے تاریخی آثار اور تعمیری شاہکار کس مپرسی کے عالم میں پڑے ہیں، اور اب تو دولت آباد ایک پہاڑی ویرانہ معلوم ہوتا ہے جہاں کے رہنے والے زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں۔

"ہم رہنے والے ہیں اِسی اُجڑے دیار کے"

یہاں پہاڑ پر ایک عظیم الشان مینار ہے جو غالباً دہلی کے قطب مینار کے بعد دوسرے نمبر پر ہے، یہ مینار بھی فن تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جو اب تک جنوبی ہند کے سنگین سینے پر مسلمانوں کی عظمت کی نشاندہی کر رہا ہے۔

پچھّم طرف یہ مینار ہے اور اسی کے بالمقابل پورب میں وہ عالیشان حمام ہے جس کی نظیر شاید دور دراز ملکوں میں نہیں مل سکے گی ، یہ حمام کیا ہے ایک مضبوط پہاڑی

قلعہ سمیت تہ خانہ ہے جس میں کئی کمرے اوران میں حوض بنے ہوئے ہیں ، ان کمروں اور حوضوں کی ساخت اور بناوٹ میں فن تعمیر کے کمالات دفن ہیں اور ماہرین فن کے لئے اب بھی ان میں کئی نئی باتیں ملتی ہیں۔اس حمام کے یکے بعد دیگرے تین درجے ہیں،اور ہر درجہ میں متعدد کمرے،کوٹھریاں اور حوض ہیں،ان کے دروازوں کی بناوٹ میں یہ کمال ہے کہ سب سے آخری دروازہ پر کھڑے ہوکر سامنے دور مینار کی طرف دیکھوتواس کا پہلا اوپری حصہ نظر آتا ہے،اوردوسرے دروازہ پرآ کر دیکھوتو مینار کا دوسرا حصہ نظر آتا ہے،اور جب تیسرے دروازہ پرآ کر دیکھوتو مینار کا آخری حصہ نظر آجاتا ہے۔

یہ فن تعمیر کا ایک معمولی تماشا تھا جسے ہم نے کھڑے کھڑے دیکھا، اس کے علاوہ اس حمام اور مینارہ میں کئی فنی کارنامے ثبت ہیں۔

پہاڑ پر ایک قلعہ ہے،اس قلعہ کی مسجد اپنی بناوٹ اور مضبوطی میں بے مثال ہے ہمیں قلعہ اور مسجد میں جانے کا موقع نہ مل سکا،مگر کتابوں سے اور مقامی لوگوں سے ان کی کیفیت معلوم ہوئی ، ان عمارتوں کے علاوہ دولت آباد کی پہاڑی ،فصیل ، مساجد، مقابر، مینارے ،حوض اور دوسرے تعمیری آثار گر پڑ جانے کے باوجود چشمِ بینا کیلئے اپنے اندر بہت کچھ سامانِ عبرت رکھتے ہیں۔

مگراب یہ تاریخی مقام اپنے کھنڈروں کے علاوہ اپنے اندراور کوئی خوبی ایسی نہیں رکھتا جواس کے لئے باعثِ فخر ہو،اس کے محل وقوع کا خوش منظران سمندروں میں کھوکر گم ہورہاہے جن کوزمانہ تیزی کے ساتھ مٹارہاہے۔

آب پاش تالاب،اور کاغذ کے کارخانے:

دولت آباد کے دہلی دروازہ سے نکلنے کے بعد ہی پہاڑ پر بائیں ہاتھ دو بلند ستون نظر آئے جن کے متعلق بتایا گیا کہ یہ حسن شاہ بہمنی کی فتح کا نشان ہیں،اس کے

آگے ایک وسیع وعریض تالاب ہے، تاریخوں میں غالباً اسی تالاب کو ''آب پاش'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس تالاب سے حیرت ناک طریقہ پر دور دور تک پانی پہونچایا گیا ہے، یہ چاروں طرف سے ہرے بھرے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، اس کے پوربی کنارے پر پہاڑ کے اوپر ایک خوش نما محل بنا ہوا ہے، معلوم ہوا کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق جب حیدرآباد تشریف لائے اور کوئی علمی کام کرنا ہوتا تو اسی پُر فضا اور پُرسکون مقام پر آکر ہفتوں اور مہینوں قیام کرتے۔

کچھ آگے چل کر معلوم ہوا کہ سامنے ''کاغذی محلّہ'' ہے جہاں پہلے زمانہ میں ہر قسم کے بہترین کاغذ بنتے تھے، آج کل بھی وہاں ایک خاص قسم کے موٹے کاغذ بنائے جاتے ہیں، اس بستی کے لوگ اس صنعت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، اور گھر گھر کاغذ بنانے کا دیسی کارخانہ ہے، جس میں عورتیں، بچے اور مرد کام کرتے ہیں۔

معلوم نہیں حکومت کو گھریلو صنعتوں کے ترقی دینے کے سلسلے میں یہاں کی کاغذ سازی کا خیال بھی ہے یا نہیں، بظاہر یہ بات نہیں ہے، اگر یہاں کی اس نادار اور اہم صنعت کی طرف حکومت توجہ کرے تو بہت سے گھرانوں کا شکم بھر سکتا ہے۔

ہم نے اپنے ہم سفر میزبانوں سے خواہش ظاہر کی کہ اپنے ملک کی اس نادر اور قدیم صنعت کو چل کر دیکھنا چاہیے، مگر وقت کی کمی پر ''وعدۂ فردا'' نے ہمیں کاغذ کے دیسی کارخانوں اور گھریلو کارگھوں کو دیکھنے سے محروم رکھا۔

افسوس کہ تفصیلی طور پر ہم دولت آباد کو نہ دیکھ سکے، اور خلدآباد میں ۵ر بجے شام کے جلسہ اور میٹنگ کی وجہ سے جلد جلد ان مقامات سے گزرنا پڑا۔

رَوضہ یعنی خلدآباد:

دولت آباد کے آگے پہاڑی راستہ نشیب وفراز لئے ہوئے خلدآباد تک چلا گیا ہے، سڑک بہت عمدہ ہے، چنانچہ تھوڑی دیر میں خلدآباد کی فصیل کا عالیشان دروازہ نظر

آنے لگا، اور ہم خلدآباد کی حدود میں داخل ہوگئے۔

ذیل میں ہم آزاد بلگرامیؒ (مدفون خلدآباد) کی کتاب روضۃ الاولیاء سے خلد آباد اور یہاں کے آسودۂ خواب علماء اور سلاطین کے مختصر احوال لکھتے ہیں، علامہ آزاد بلگرامیؒ فرماتے ہیں کہ اورنگ آباد سے آٹھ کروہ (کوس) پر قلعہ دولت آباد ہے، اور وہاں سے تین کروہ پر حضرت شیخ برہان الدین ''غریب'' اور حضرت امیر حسن دہلوی، اور دیگر بزرگان دین قدس اللہ اسرارھم کے مزارات ایک پہاڑی پر واقع ہیں اور اس مقامِ سعادت انجام میں مختلف طبقوں کے لوگ آباد ہیں۔ یہ آبادی خلدآباد روضہ کے نام سے مشہور ہے۔

جب سلطان اورنگ زیب عالم گیر أنار اللہ برھانه نے اس بقعہ بہشت میں سکونت اختیار فرمائی تو ان کے خلف ارجمند شاہ عالم بہادر شاہ نے اس قصبہ کے گرد نہایت ہی مضبوط اور سنگین حصار کھنچوائی اور شہر کے حسن اور اس کی رونق کو خوب اجاگر کیا۔ (روضۃ الاولیاء، ص:۵)

اس سے معلوم ہوا کہ شہنشاہ اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ نے خلدآباد کو اپنا مرکز بنایا، اور شمالی ہند سے ہٹ کر محمد تغلق شاہ کی طرح جنوبی ہند کی ان پُر کیف پہاڑیوں اور سرسبز و شاداب وادیوں کو اسلامی شان و شوکت کا گہوارہ بنایا، اور خلدآباد کا نام روضہ اب صرف کتابوں میں پایا جاتا ہے، یہ علاقہ اپنے باذوق آباد کرنے والوں کے نزدیک بقعہ بہشت تھا۔

علامہ آزاد بلگرامیؒ فرماتے ہیں:

الحاصل ایک کوہستان در جمیع مواسم خوش ہوا است، لاسیما ایام بَرشگال کہ کوہ و صحرا از وفورِ سیرابی و فیض و نشو و نما حکم فردوس بہم میرساند و نظارگیاں را بتازگیٔ دل و دماغ بہرہ مندمی سازد۔ (روضۃ الاولیاء، ص:٦)

الغرض یہ کوہستانی علاقہ ہر موسم میں بہترین آب وہوا رکھتا ہے، خاص طور سے برسات میں کوہ وصحرا، سیرابی وشادابی کی کثرت سے فردوس کا منظر پیش کرتے ہیں، اور نظارہ کرنے والوں کے دل ودماغ کو تازگی بخشتے ہیں۔

حاجی جان محمد نے دولت آباد اور خلد آباد پر ایک طویل نظم لکھی ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زِ دلہا صبا رفتہ گردِ ملال — ہوائے بہشت است یا بَرشگال
جوانند پرّانِ این سرزمین — نہ سرما نہ گرما بہشت است ایں
زِ رَشحِ ہوا پائے صحت بگل — طبیباں ز بیکاری ایں جا خجل
دل غنچہ اش نشکند اَز صبا — بایں تندرستی کہ دیدہ ہوا
دریں ملک مردم خوش آسودہ اند — ہوائیست گوئی کہ فرمودہ اند
زنم گشتہ بازارہا سبز پوش — دوکانہا دکانِ زبرجد فروش

یہ پورا قصیدہ اسی طرح حسین وجمیل مناظر کشی سے مرصع ہے۔

گیسٹ ہاؤس:

جب ہم خلد آباد کی پستی وبلندی سے گزرنے لگے تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ بستی مدتوں کی جانی پہچانی ہے، ہر ہر چیز سے ایک گونہ انسیت ٹپکتی تھی، اور اجنبیت کا وہ سماں نہیں تھا جو کسی نئی بستی میں جاتے وقت ایک نووارد کے لئے ہوا کرتا ہے۔ شاید اسی قدیم علمی ودینی، رُوحانی اور سیاسی تعلق کی بنا پر یہ بات تھی جس نے ہمارے اسلاف کو اسی سرزمین سے آج تک وابستہ رکھا ہے۔ اندرون حصار اور بیرون حصار بہت سے اہل اللہ اربابِ علم اور صاحب سیف وقلم حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں خاک کے بستر پر باہوں کا تکیہ لگائے ہوئے آج بھی یہاں پر آرام فرما رہے ہیں۔ بہرحال ہم ان آسودگانِ خواب کی بستیوں سے گزرتے ہوئے یہاں کی

سرکاری قیام گاہ پر پہونچے جو فصیل کے باہر پچھّم اُتر کے گوشہ پر ایک مرتفع پہاڑ پر واقع ہے، یہ سرکاری قیام گاہ سابق فرمانروائے حیدرآباد کے ٹھہرنے کی خاص جگہ تھی، اور ابتک تقریباً اسی حال میں ہے جس حال میں پہلے تھی، کمروں کی سجاوٹ، پارکوں کی دیکھ بھال اور صفائی کا انتظام شاید ابتک بہت اچھا ہے کہ اس کے ملازمین وہی پرانے لوگ ہیں اور انھوں نے اپنے ذوق سے کام لیکر بڑی حدتک اچھی حالت میں رکھا ہے، ورنہ ہندوستان میں بہت سی اس قسم کی عمارتیں اب بدذوقی و بدنظمی کی نظر ہوکر رہ گئی ہیں، اس گیسٹ ہاؤس کا محل وقوع اور منظر بڑا ہی دلفریب بلکہ روح فریب ہے۔ پچھّم کی طرف سامنے دور نشیب میں ایلورا کی بستی اور تالاب نظر آتا ہے اور جہاں تک نظر کام کرتی ہے سبزہ پوش نشیب، فرحت بخش ناہموار پہاڑی راستے، اور پانی کی حسین لہروں کے آئینے اپنے دیکھنے والوں کو اپنے اندر جذب کرلیتے ہیں، ان مناظر اور عمارات کو دیکھ کر قرآن حکیم کی وہ آیت یاد آگئی جس میں فرمایا گیا ہے کہ ’’انھوں نے کتنے ہی باغات اور پانی کے چشمے اور خزانے اور بہترین جگہیں چھوڑی ہیں۔‘‘

سابق حکمرانوں کا یہ ٹھاٹھ باٹھ اب پھیکا پھیکا سا نظر آنے لگا ہے اور ہر طرف ایک گونہ بے کسی و کسمپرسی کا عالم برپا ہے، زندگی میں پہلی مرتبہ یہاں پر چاندی کے بعض برتنوں کے استعمال کا موقعہ ملا، کیا بہتر ہوتا کہ اس کی باری نہ آئی ہوتی اور ہم بوریانشینوں کو قیصریت کی اس معمولی بات سے بھی سابقہ نہ پڑا ہوتا، تباہ و برباد افراد اور اقوام کے سامانِ حیات اور ان کے مکانات واشیاء کے استعمال سے بھی منع کیا گیا ہے اور ان کو دیکھ کر عبرت ونصیحت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

خلدآباد کے دو مخلص دوستوں سے بمبئی میں ہماری پرانی ملاقات رہی ہے، حسن اتفاق سے دونوں ہی صاحبان اپنے وطن میں مل گئے، چنانچہ جناب حاجی محمد صدیق پہونچنے کے بعد آگئے نیز جناب فریدالدین صاحب سلیم رکن ادارہ ماہنامہ ’’فیض‘‘

خلدآباد بھی اپنے وطن میں ملے اور دونوں صاحبان نے کمال محبت سے فرمایا کہ آپ کے آنے کی خبرسن کر ہم بھی آگئے ہیں۔ان دونوں حضرات کی معیت میں خلدآباد کے بزرگانِ دین کے مقدس مزارات کی زیارت ہوئی اور دوسرے تاریخی مقامات ایلورا کے غار وغیرہ دیکھنے میں آئے۔

حضرت زرزری زربخشؒ:

ہم نے سب سے پہلے حضرت شیخ منتخب الدین زرزری زربخش رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی ، ان دنوں عرس ہورہا تھا اور وہ سب کچھ بیہودگی جاہل مجاوروں اور جاہل لوگوں کی طرف سے ہورہی تھی، جوآج کل کے عرسوں میں ہوتی ہے۔

حضرت شیخ منتخب الدین زرزری زربخش ہندوستان کے مشاہیر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔حضرت برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے برادر حقیقی ہیں، (جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے) تاریخ فرشتہ، سیر الاولیاء اور معارج الولایت وغیرہ میں آپ کے حالات موجود ہیں، آزاد بلگرامیؒ نے ''روضۃ الاولیاء'' میں آپ کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے،اور لکھا ہے کہ جب آپ عبادت وریاضت کرتے کرتے وصال کو پہونچ گئے تو غیب سے دو خلعتِ زریں صبح وشام آیا کرتی تھی جن کو خود استعمال نہیں فرماتے تھے بلکہ فقراء ومساکین پر ان کی قیمت خرچ فرماتے تھے، اسی لئے ان کو زرزری زربخش کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ ہر رات تہجد کی نماز کے وقت ایک دُرجِ زریں غیب سے آتا، جسے علی الصباح فروخت کرکے درویشوں پر خرچ فرمایا کرتے تھے،ان کے بڑے مناقب وفضائل ہیں۔۷؍ربیع الاول ۷۰۵ھ کو فوت ہوئے،مزار حصار شہر کے باہر ایک عظیم الشان اور بلند مسجد کے صحن میں واقع ہے،اور عرس کے زمانے میں مسجد کا سارا احترام ختم کرکے جاہل مجاور اور عوام بھیڑ لگاتے ہیں اور اسلاف کے نام پر طرح

طرح کی غلط حرکتیں کرتے ہیں۔

جب ہم قریب ہی ایک اور مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے گئے تو مجاور نے ہمیں یہ کہہ کر روک دیا کہ چونکہ یہ بزرگ عورت ہیں اس لئے مرد لوگ ان کی زیارت نہیں کر سکتے، اس پر میں نے کہا کہ یہ نیا فتویٰ یہاں ہی سننے میں آرہا ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ازواجِ مطہرات، بنات رسول ﷺ اور دوسری خواتینِ اسلام کے مزاروں کی زیارت کی جاتی ہے، یہ فتویٰ شاید سارے ہندوستان میں صرف یہیں جاری ہے جس کے موجد یہ جاہل مجاور ہیں۔

حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ:

آسودگانِ خلد آباد میں حضرت شیخ برہان الدین محمد بن ناصر المعروف بہ غریب ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ بہت مشہور ہیں، آپ حضرت نظام الدین اولیاء کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں اور حضرت شیخ زرزری زربخش کے برادر ہیں۔ حضرت غریب ہانسوی ولایت دکن کے روحانی حکمراں ہیں، آپ بڑی عاشقانہ طبیعت اور والہانہ دل رکھتے تھے، پہلے دہلی میں رہا کرتے تھے، آپ کے ملفوظات کو ''احسن الاقوال'' کے نام سے شیخ حماد بن عماد متوفی ۷۶۱ھ نے جمع کیا۔

بہت بڑے عابد و زاہد تھے، خود فرماتے ہیں کہ ''جب میں چھ سات سال کا بچہ تھا تو کلمہ طیبہ کے ذکر مواظبت کرتا تھا اور ۱۳ر سال کی عمر میں صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اہل و عیال کی زندگی اختیار نہیں کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت میں زندگی بسر کروں گا، اس زمانہ میں اگر کسی رات مجھے احتلام ہو جاتا تو دن کو روزہ رکھتا تھا چند دنوں کے بعد میری والدہ کو شادی کی فکر ہوئی، میں نے بظاہر انکار نہیں کیا کہ اس میں ماں کی نافرمانی تھی مگر غذا کی مقدار کم کرنی شروع کر دی اور کم کرتے کرتے سات لقمہ تک کی باری آگئی، اب میرے ضعف کا یہ عالم ہو گیا کہ بارِ ناتوانی سے آسمان کی

طرف آنکھ اُٹھانا بھی مشکل ہوگیا، جب میری والدہ نے یہ حال دیکھا تو وہ اپنے ارادہ سے باز آ گئیں۔

آپ کا وصال چہار شنبہ ۱۱؍صفر ۷۳۸ھ میں ہوا۔ مزار حصار کے درمیان واقع ہے۔

حضرت راجو قتالؒ:

حضرت سید یوسف بن علی بن محمد حسنی دہلوی دولت آبادی المعروف بہ سید راجو قتال رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ حضرت سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم ہیں ، جب دہلی سے دولت آباد کی طرف محمد تغلق کے زمانہ میں مسلمانوں کا قافلہ چلا تو آپ بھی دولت آباد تشریف لے گئے اور مرتے دم تک دکن ہی میں رہے، ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

روئے کہ دیدہ ام من اندر عیاں نگنجد — حسن و جمال آں رُو اندر جہاں نگنجد
پروازِ مرغِ قدسی جز لامکاں نباشد — ایں مرغِ لامکانی اندر مکاں نگنجد

آپ نے ۵؍شوال ۷۳۱ھ کو داعی حق کو لبیک کہا، مزار فصیل خلد آباد کے باہر پچھّم کی طرف واقع ہے۔

مولانا فریدالدین ادیبؒ:

حضرت مولانا فریدالدین ادیب رحمۃ اللہ علیہ شیخ برہان الدین غریب کے خلفاء میں سے ہیں، اپنے شیخ سے ۱۳؍دن پہلے ہی فوت ہوگئے۔ شیخ نے جب آپ کو حلقۂ ارادت میں آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ:

”یہ جوان میرے سامنے اس انداز سے آرہا ہے، جیسے کوئی تیس سال کا مرید اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہورہا ہے۔“

نیز شیخ نے اپنے اس مرید کے بارے میں فرمایا ہے:

’’اگر فردا پُرسند کہ در حضرتِ ما چہ آوردی؟ گویم فریدرا آوردہ ام‘‘

اللہ اکبر! کس مرتبہ کے بزرگ تھے، ۲۹؍محرم ۷۳۰ھ کو فوت ہوئے، مزار آپ کے شیخ کے مزار کے مغربی جانب واقع ہے۔

حضرت خواجہ حسین شیرازیؒ:

حضرت خواجہ حسین رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت سید محمود شیراز کے اولیاء میں سے تھے، خواجہ حسین کی پیدائش شیراز میں ہوئی، وہ بہت بڑے تاجر تھے اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے تھے، جب آپ کے صاحبزادے مولانا داؤد حرمین شریفین سے واپسی پر ہندوستان میں مقیم ہوئے تو لڑکے کے دیکھنے کی تمنا پیدا ہوئی اور پورے خاندان سمیت ہندوستان آئے اور دہلی میں جگر گوشہ سے ملاقات کی، پھر دہلی سے دولت آباد کی طرف عام روانگی کے وقت اہل وعیال کولیکر دولت آباد آگئے، آپ کے بھائی خواجہ عمر بھی ہمراہ تھے اور دکن آنے کے بعد جلد ہی فوت ہوگئے، دونوں بھائی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مریدوں میں سے ہیں اور دونوں کے مزارات خلد آباد کی فصیل کے باہر ایک پہاڑی پر ایک ہی گنبد میں واقع ہیں۔

شیخ زین الدین داؤد شیرازیؒ:

جیسا کہ معلوم ہوا آپ حضرت خواجہ حسین شیرازی کے لڑکے ہیں، اور حرمین شریفین سے واپسی پر ہندوستان رہ گئے، بہت بڑے ولی اور کامل بزرگ اور علوم ظاہری اور علوم باطنی کے جامع ہیں۔ شریعت میں طریقت کے رنگ نے عجیب دلکشی پیدا کردی تھی، صاحب کشف وکرامت تھے، حضرت شیخ برہان الدین غریب کے بعد ان کے سجادہ کے وارث ہوئے، حدود ۷۰۱ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے، حج کے بعد حضرت برہان الدین غریب کی توجہ پر ہندوستان آئے اور دہلی میں رہ کر علم وفضل حاصل کیا، پھر اہل دہلی کے ساتھ دولت آباد تشریف لائے۔

آپ کے حالات تفصیل کے ساتھ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے روضۃ الاولیاء میں لکھے ہیں، بروز یکشنبہ ۲۵/ربیع الاول ۱۱۷۱ھ کو فوت ہوئے، مزار خلد آباد اندرون فصیل شیخ برہان الدین غریب کے مقبرے سے الگ واقع ہے۔

شاہ جلال گنج رواں:

حضرت شاہ جلال المعروف بہ گنج رواں رحمۃ اللہ علیہ اولیاء کبار میں سے ہیں، بزرگان چشتیہ میں بڑے مرتبہ کے مالک ہیں، آپ کے ملفوظات افسوس کہ ضائع ہوگئے، جس سے علوم وفنون کا ایک خزانہ گم ہوگیا۔ مزار بقول آزاد بلگرامی ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، جو چاروں طرف سے مضبوط دیواروں سے بنایا گیا ہے اور موسم برسات میں یہ جگہ بڑی دل فریب ہو جاتی ہے۔

حضرت شاہ خاکسارؒ:

حضرت شاہ خاکسار رحمۃ اللہ علیہ کی جائے پیدائش بیجاپور ہے، خاندان سادات سے ہیں، سلسلۂ بیعت وارادت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے۔ خلد آباد کی ایک پہاڑی میں رہا کرتے تھے، اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دورِ سلطنت کے درمیانی زمانہ میں فوت ہوئے اور اپنے تکیہ میں دفن ہوئے۔ بقول آزاد بلگرامی آپ کی آرام گاہ بہت ہی پاکیزہ اور پُر فضا مقام پر واقع ہے، اور برسات کے موسم میں اس علاقہ میں کوئی جگہ اس سے زیادہ بارونق نہیں ہوتی، اس جگہ پانی کا ایک بڑا چشمہ ہے۔ جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں، اس چشمہ سے نہر نکال کر خلد آباد لائی گئی تھی اور شہر کے اکثر حصہ کو اس سے پانی ملتا تھا۔

حضرت اورنگ زیب عالم گیر شہنشاہ ہندؒ:

حضرت خلد آشیاں محی الدین اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کا مزار

اندرون فصیل سڑک کے پورب جانب ایک عظیم ترین سنگین اور بلند قوی ہیکل عمارت میں واقع ہے، اس عمارت میں ایک عالیشان مسجد اور کئی مقبرے اور گنبد اور کمرے ہیں مسجد کے صحن میں قدیم زمانہ کا سنگین حوض ہے، جس میں اب بھی قدیم نہر سے پانی آتا ہے۔ حوض کے سامنے دکھن جانب کی عمارت میں پرانا مدرسہ ہے، جواب بھی کسی نہ کسی حال میں جاری ہے، اور وہاں کے چند باہمت حضرات کی سعی وکوشش سے اس کا نظم جاری ہے، گزشتہ دنوں صدر جمہوریہ ہند حیدرآباد کے علاقہ میں گئے تو حضرت عالم گیر کے مزار پر بھی حاضر ہوئے، ان کے استقبال وانتظام میں مدرسہ بند کردیا گیا تھا اور بچوں کو رُخصت دیدی گئی تھی، مگر صدر جمہوریہ نے خود پوچھا کہ یہاں کا مدرسہ اب جاری ہے یا نہیں؟ اور جب ان کو حقیقت حال کی خبر ہوئی تو مدرس کو بلوا کر ۲۰۰ر روپیہ کا چیک مدرسہ کیلئے عنایت کیا۔

مسجد کے شمالی جانب عالمگیر کا مزار واقع ہے، جس پر نہ کوئی عمارت ہے نہ گنبد اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی اہتمام ہے۔ اس شہنشاہ نے فقیری کی جو زندگی بسر کی تھی اس کا اثر آج بھی اس کے مرقد سے ظاہر ہو رہا ہے، سابق وزیر اعظم حیدرآباد مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی نے اپنی طرف سے اس کے چاروں طرف سنگ مرمر کی جالیاں بنوادی ہیں اور فرش پر بھی سنگ مرمر بچھا دیا ہے، ورنہ یہ قبر دوسری قبروں کے برخلاف کچی اور شریعت کے عین مطابق ہے۔ اور اپنے مدفون کی خدا پرستی اور دینداری کی یاد دنیا کو دلا رہی ہے۔ عالم گیرؒ کے مزار پر حاضری کے وقت وہ اطمینان وسکون محسوس ہو رہا تھا جو کسی اہل اللہ کی مجلس میں کسی جویائے حق کو حاصل ہوتا ہے۔

ہندوستان کا وہ عظیم تر شہنشاہ جس کی بزرگی اور پارسائی کا تذکرہ ہم نے نہ صرف ہندوستانی مصنفوں کی کتابوں میں پڑھا ہے بلکہ شام کے زبردست عالم اور مصنف علامہ فضل اللہ محبی نے ''خلاصة الاثر فی اعیان القرن الثانی عشر'' میں اس کا

ذکر کیا ہے اور نہایت شاندار طریقہ پر کیا ہے، اور فضائل ومناقب گنائے ہیں۔

آج وہ اس طرح آسودۂ خواب ہے، جیسے کچھ تھا ہی نہیں، بابر وہمایوں اور اکبر وجہانگیر کے مقبروں کو دیکھنے والے اس شہنشاہ کے مقبرے کو دیکھ کر اس کی خدا پرستی و خداترسی کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔

عالم گیرؒ کا وصال ۱۱۱۸ھ میں ہوا تھا، تاریخ وفات یہ ہے۔

''عالم گیر از جہاں رفت''

۱۱۱۸ھ

معلوم ہوا کہ عالمگیر کے مزار کی کچھ جالیاں اور کتبے آج کل ہل گئے ہوئے ہیں اور محکمہ آثارِ قدیمہ کی طرف سے ان کی مرمت ہو رہی ہے۔

پیراہن مبارک:

اس حظیرہ میں اور بھی بہت سی قبریں اور کئی ایک پر شاندار قبے بنے ہوئے ہیں جن میں عالمگیرؒ کے خاندان کے لوگ اور دوسرے اہل اللہ دفن ہیں، نیز ایک شاندار کمرے میں پیراہن مبارک بتایا جاتا ہے، مجاور نے ہمیں بتایا کہ ۱۲؍ربیع الاول کو اس کی زیارت کرائی جاتی ہے، اس پیراہن مبارک کی تاریخ اور سند بھی دو بڑے بڑے شیشے کے چوکھٹوں میں سامنے لکھی ہوئی رکھی ہے جو بغیر تحقیق کے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہی حال ہندوستان میں جگہ جگہ موئے مبارک کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پیراہن مبارک اور موئے مبارک کا بعد تک ہونا کتابوں سے ثابت ہے مگر اب یہ اصل تبرکات کہاں ہیں اور جو ان اطراف میں پائے جاتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔

یہ ضرور ہے کہ آخر دور میں دکن کی مسلم شاہیوں کے یہاں نے اس قسم کے تبرکات کیلئے بڑا اہتمام تھا، مگر معلوم نہیں عقیدت ومحبت کے ساتھ ساتھ تحقیق وصحت کا

معیار کیا تھا اور وہ صحیح طور پر ان چیزوں کو کہاں تک جمع کرسکیں۔ اس کمرے کے برآمدے میں ایک قلمی کلام پاک رکھا ہوا ہے جس کا طول وعرض اور حجم بہت زیادہ ہے۔ ہم نے اس کی زیارت کی، مگر اس میں نہ کاتب کا نام ہے اور نہ ہی سن کتابت ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ تبرک ہے مگر کاتب اور سن کتابت کا پتہ نہیں ہے، بین السطور فارسی زبان میں ترجمہ بھی درج ہے۔

نظام الملک بحری، والی بیجانگر:

اس جگہ نظام الملک برہان شاہ بحری، والی بیجانگر متوفی ۹۶۱ھ کا مدفن بھی ہے، اس بادشاہ کی ہڈیاں کربلا میں دفن ہیں، مگر جسم کا بقیہ حصہ یہیں دفن ہے۔ اس کے مدفن پر عالیشان گنبد بنا ہوا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ:

یہیں نظام الملک آصف جاہ بن غازی الدین خاں فیروز جنگ بن عابد خاں کا مدفن بھی ہے، نظام الملک آصف جاہ بڑے دبدبے کا حکمراں گزرا ہے، اس نے عہدِ عالمگیر سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ تک حکومت وسلطنت کے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں، اور تقریباً ۳۰؍سال تک دکن کے تمام صوبہ جات کا نظم وضبط سنبھالا ہے۔

اس نے دریائے نربدا سے لیکر دکن کے پورے علاقہ پر قبضہ کیا، اس حسن انتظام اور داد ودہش کی خبر نے عرب، ماوراء النہر، خراسان، عجم، عراق اور ہندوستان کے علماء ومشائخ اور دہلی کے اربابِ علم وفن کو دکن میں لاکر جمع کردیا۔ نظام الملک آصف جاہ شاعر بھی تھا اور واصف تخلص رکھتا تھا۔

۴؍جمادی الاخریٰ ۱۱۶۱ھ کو بروز یکشنبہ عصر کے بعد برہان پور کے علاقہ میں اس کا انتقال ہوا، اور خلد آباد میں اسے حضرت شیخ برہان الدین غریب کے مزار کے پاس مائل بجانب قبلہ سپردِ خاک کیا گیا۔

حضرت نجم الدین امیر حسن سنجری:

حضرت شیخ نجم الدین امیر حسن بن علائی سنجری دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار شہر پناہ کے باہر پچھّم دکھن کے رُخ پر تقریباً دو میل کی دوری پر سلسلہ کوہ کے دامن میں ایک پُر فضا میدان میں واقع ہے۔

آپ کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی ہے، حضرت نظام الدین اولیاء کے خاص مریدوں میں سے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاء کی ان پر بڑی نگاہِ کرم رہا کرتی تھی، دوسرے حضرات اس خصوصی توجہ سے محروم تھے، انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو ''فوائد الفواد'' کے نام سے جمع کیا ہے، لوحِ مزار پر مصنف ''فوائد الفواد'' کی حیثیت سے آپ کا تعارف درج ہے، ''سعدیٔ ہند'' کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، شعر وشاعری میں بہت آگے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن جامی نے آپ کی شاعری، خاص طور سے غزل کی بڑی تعریف کی ہے۔ فیضی ان کی شاعری کا معترف تھا، اس کا قول ہے۔

''امیر حسن آنے دارد کہ عاشق آں تواں شد''

دہلی سے دولت آباد اسی ہنگامہ میں آئے جس میں دہلی کو اُجاڑ کر دولت آباد کو بسایا گیا تھا۔ یہاں پر اس طرح رہ گئے کہ آج بھی آپ کا مزار آپ کے عزم وثبات کی گواہی دے رہا ہے۔ وفات ۱۹/صفر ۷۳۷ھ کو ہوئی۔

سحبان الہند علامہ آزاد بلگرامیؒ:

حضرت امیر حسن سنجری کے احاطہ کے مزار سے متصل ہی پچھّم کی طرف ایک معمولی سے احاطے میں سحبان الہند حضرت علامہ غلام علی آزاد بلگرامیؒ کا مزار ہے، آپ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی آرزو شدید تقاضا کر رہی تھی، جس وقت آپ کے مرقد پر حاضری ہوئی ایسا معلوم ہوا کہ کسی قدیم مشفق استاذ کی خدمت میں حاضری ہوئی ہے،

بچپن سے آپ کی کتابوں کو پڑھ پڑھ کر ہم نے بہت کچھ علمی فیض پایا ہے۔

سبحة المرجان فی آثار الهندوستان عربی میں آپ کی وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے، جو ہندوستان کے شعر وادب اور رجال کی صدہا کتابوں پر بھاری ہے، اسی طرح مآثر الکرام، سروِ آزاد اور روضۃ الاولیاء وہ کتابیں ہیں جن کے مطالعہ سے اسلامی ہند کی صحیح علمی، دینی اور ثقافتی تاریخ معلوم ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کرام کو کروٹ کروٹ رحمت سے نوازے اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔

اس احاطہ کے باہر پچھم سمت ایک اور قبر کسی زبردست عالم کی ہے جس پر کتبہ ہے، مگر خاردار جھاڑی کیوجہ سے ہم اسے پڑھ نہ سکے، نیز اسی کے پاس ایک عالیشان مسجد شکستہ حال میں ویران پڑی ہے اور اس کی چھت گر رہی ہے، اسی کے قریب ایک اور مرقد ہے، معلوم ہوا کہ یہ حضرت شیخ فریدالدین کی صاحبزادی کی قبر ہے۔

سلطان ترکی کا مقبرہ:

بستی کے باہر پچھم کی طرف پہاڑ کے دامن میں ایک نوساختہ سفید گنبد نظر آتا ہے، یہ وہی مقبرہ ہے جو سابق خلیفہ ترکی مرحوم سلطان عبدالحمید خاں کے لئے تعمیر کیا گیا تھا تاکہ فرانس سے ان کی لاش لاکر یہاں دفن کی جائے۔ تقسیم ہند کے بعد خبر آئی تھی کہ مرحوم کی لاش فرانس کے ایک مقام میں ابتک محفوظ رکھی ہوئی ہے، اور فرماں روائے حیدرآباد کے خلیفہ ترکی کے خاندان سے رشتہ داری کی وجہ سے مرحوم کی نعش خلد آباد میں جہاں اور کئی مسلم حکمراں آسودۂ خواب ہیں دفن کیا جائے گا مگر تقسیم ہند اور پولیس ایکشن کے بعد یہ ارادہ خود بخود ختم ہوگیا، اور اب یہ مقبرہ یوں ہی پڑا ہے۔

کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ سلطان ترکی کو نہ صرف اپنے تخت وتاج سے محروم ہونا پڑا بلکہ اپنے شاہی محل تو درکنار اپنے وطن کے کسی گوشہ میں زندگی کے باقی دن گزارنے کی فرصت نہیں ملی اور جب دیارِ غیر میں موت آئی تو ان کی لاش چھپانے

کے لئے دو گز زمین نہ مل سکی، اور ہندوستان میں اس کا انتظام کیا گیا تو حالات کی ناسازگاری نے اسے بھی درہم برہم کر دیا۔ ہمارے بہادر شاہ ظفر کو تو

"دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں"

اور ان کو رنگون کے ایک ویرانہ نے آغوش میں لیا، مگر غریب سلطان عبدالحمید کی غربت نے ان کیلئے ابتک دو گز زمین کا انتظام نہیں کیا۔

مساجد اور عمارات:

ان بزرگوں کے علاوہ اس خطہ میں اور بہت سے اہل دل اور اربابِ علم اور صاحب امارت آسودۂ خواب ہیں، اور جیسا کہ ہمیں بتایا گیا یہاں قدیم زمانہ میں ۱۰۲ مسجدیں تھیں، جن میں سے اب چند آباد ہیں وہ بھی تعمیری خرابیوں کا شکار ہو چکی ہیں، اور مشکل سے چار چھ مسجدیں رنگ وروغن اور مرمت کی وجہ سے اچھی خاصی حالت میں ہوں گی، عام طور پر ہر بڑے مقبرے کے پاس کوئی نہ کوئی مسجد ہے۔

جگہ جگہ حیدرآباد کے محکمہ آثارِ قدیمہ کی طرف سے بورڈ لگے ہوئے ہیں، مگر زمانہ کی دست بُرد سے ان عمارتوں کو کون بچا سکتا ہے؟ یہاں کی مسجدوں کی کمانیں اور گنبد جنوبی ہند میں مسلم فن تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ ستونوں کی ساخت اور تراش بھی جداگانہ خصوصیت رکھتی ہے۔

اکثر وبیشتر عمارتیں پتھر کی ہیں جو مسالہ کے ساتھ جوڑی گئی ہیں، اور پائیداری میں ابتک اپنا جواب آپ ہیں، مگر زمانہ کی طاقت کے مقابلہ میں ان کا بس نہیں چلتا۔

گری پڑی فصیل کے باہر بھی مساجد، مقابر، حوض، تالاب اور طرح طرح کی عمارتیں پہاڑوں کے دامن میں اپنے اپنے بنانے والوں کا افسانہ کہہ رہی ہیں۔

اور كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَان (روئے زمین کی ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے)

کا نقشہ پیش کر رہی ہیں۔

ایلورا کے غار:

خلدآباد پہاڑوں کی بلندی پر اور نیچے پچھم کی طرف پہاڑوں میں ایلورا کے غار تقریباً ڈھائی ہزار سال پیشتر کے ہیں، گیسٹ ہاؤس سے پچھم طرف نظر اُٹھانے سے وہ غار تو نظر نہیں آتے، مگران کے اوپر کے پہاڑ صاف نظر آتے ہیں۔

حسن اتفاق سے ایلورا کے غاروں کے دیکھنے میں ہمیں اپنے ایک نادیدہ قدرداں دوست ظہیر الدین صاحب کی خدمات نے بہت کچھ معلومات فراہم کیں، موصوف مقامی محکمہ تعمیرات میں کام کرتے ہیں اور ان غاروں کے آرٹ اور نوک پلک سے فنی طور سے واقف ہیں، یہ غار اَجَنتا کی طرح ہندوستان کے قدیم فن تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں جن کے دیکھنے کے لئے یورپ اور امریکہ تک کے لوگ ہر وقت پڑے رہتے ہیں۔ ایک نمبر سے دس نمبر تک کے غار بدھ آرٹ کی ترجمانی کررہے ہیں۔ گیارہ سے پندرہ تک کے غار، جین آرٹ کے ترجمان ہیں۔ اس کے بعد کے غار ہندو تہذیب کے قدیم ترین آئینے ہیں۔

عام طور سے ناواقف اور مرعوب ذہنیت رکھنے والے ان غاروں کی دریافت کا سہرا انگریزوں کے سر منڈھتے ہیں، حالانکہ یہ غار اجنتا کے غاروں کی طرح عہد عالگیری سے بہت پہلے معلوم ہو چکے تھے، مگر چونکہ ان کو آج کی طرح اہمیت حاصل نہ تھی اس لئے ان کے بارے میں وہ احساسات نہ تھے جو آج کی وطن پرستی، قدامت اور آرٹ پرستی میں پائے جاتے ہیں۔ علامہ آزاد بلگرامیؒ نے ان غاروں کا تذکرہ روضۃ الاولیاء کے شروع میں خلدآباد کے حالات میں کیا ہے، یہ کتاب انھوں نے ۱۱۶۱ھ میں لکھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف پر اب تک ۲۱۶ رسال گزر چکے ہیں، اس میں ایلورا کے غاروں کے بارے میں لکھا ہے:

’’ودریں کوہ معبدیست از ہنود ایلورا نام کہ درقرون ماضیہ بحکم فرمانروایانِ

صنم پرست، سنگ تراشانِ ہنرمند درطول نیم کردہ بت خانہائے عظیم الشان ورفیع الارکان بعض سہ آشیانہ وبعضے کم کندہ اند، ودرروئے دیوارہا سراسر تمثالہا تراشیدہ کارخانۂ حیرت جلوہ گر ساختہ اند، ودر محلے ازیں بت خانہ آبشارے، بمقدار صد گز بالائی کوہ میریزد ونہر عظیمے از آسمان برزمین نزول کند وطرفہ سیر گاہے است تماشا کردنی۔'' (روضۃ الاولیاء، ص:۵، ۶)

ایلورا کے غاروں کے بارے میں ۲۱۶ر سال پہلے کی شہادت جس اندازِ تحریر میں پائی جارہی ہیں وہ صاف بتارہا ہے کہ اس کی اہمیت وعظمت اوراس حیرت خانہ کی معلومات آزاد بلگرامی سے صدیوں پہلے سے تھی، اوران کے زمانہ میں یہ غار اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود تھے، اورلوگ ان کے دیکھنے اور یہاں پر سیر وتفریح کے لئے آتے جاتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ عجائب خانے اپنی مثال آپ ہیں، ایک مومن ومسلم کے لئے تو نہیں مگر آرٹسٹ، مصوّر اورفنکار کے لئے ان میں بڑی جاذبیت واہمیت ہے۔

ہم نے وہ تمام باریکیاں اور چیزیں ان میں دیکھیں جو دیکھنے کی ہیں، مگر ہم اپنے اسلامی مفاخر کے بیان میں شرک وکفر کی کہانی پسند نہیں کرتے ہیں۔ ورنہ ان غاروں کے آرٹ اورفن پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

مرہٹواڑہ کے مسلمانوں کے خصوصی مسائل:

جدید صوبہ بندی کے ماتحت سابق حیدرآباد کے کئی اضلاع جو مرہٹواڑہ میں تھے، بمبئی اسٹیٹ میں آگئے ہیں، یہ اضلاع چونکہ ایک ریاست سے تعلق رکھتے تھے، اسلئے ان کے مسائل ہمیشہ ہندوستان کے مسائل سے الگ رہا کئے ، اوران کے معاملات کو سمجھنے اوران کے مطابق کام کرنے کے لئے ہمیں بڑے غور سے وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنا ہوگا، اوروہاں کے باشندوں کی ایک ایک بات معلوم کرنے کی

کوشش کرنی ہوگی۔ خاص طور سے ان علاقوں کے مسلمانوں کے حالات ومعاملات کو سمجھنے اوران کو سلجھانے کیلئے بڑی دُوراَندیشی اور فراخدلی سے کام لینا پڑے گا، کیونکہ ایک تو یہ مسلمان عام باشندوں کی طرح ایک مسلم ریاست کے ماتحت تھے اور تمام باشندوں کی طرح ان حالات ومعاملات سے بالکل دور رہے ہیں جو ہندوستان میں رائج تھے، دوسرے پولیس ایکشن نے ان کا قیمہ کردیا ہے۔اور وہ اس لاش کی طرح ہیں جس کے تمام اعضاء کاٹ دیئے گئے ہوں۔اس حقیقت کو نہ ماننا آفتاب پر خاک اُڑانے کے مرادف ہے،اس المناک حقیقت اور وحشت ناک حرکت نے مسلمانوں کو زندگی کی تمام قدروں سے نہ صرف محروم کررکھا ہے بلکہ ان میں احساس وشعور کا بڑی حدتک فقدان ہوگیا ہے اور ابتک ان کے خلاف جو کچھ ہورہا ہے اس سے امید نہیں ہے کہ وہ خوداپنے معاملات کو سلجھانے کے قابل ہوجائیں گے۔

ہزاروں مسلمان بیوائیں نانِ شبینہ تک کی محتاج ہیں۔ہزاروں معصوم بچے گھر، غذا، تعلیم اور صحت سے محروم ہیں، ہزاروں بوڑھے بے سہارا ہوکر باقی زندگی سے مایوس ہیں، ذاتی املاک پر دوسروں کا قبضہ ہے، مساجد ومقابر کے اوقاف اور جائداد پر سلب وغصب دَورنا مارے ہوئے ہے، جاگیرداروں، مالداروں اور رئیسوں کی بے کسی اور محرومی نے ان کو کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔

ان حالات میں یہاں کے مسلمانوں کے معاملات کا سمجھنا اوران کے ساتھ مناسبِ حال برتاؤ کرنا ہمارے حکمرانوں کے لئے بڑا اہم کام ہےاور ہماری سیاسی اور سماجی جماعتوں کے اہم فرائض میں داخل ہے،ہمیں خوشی اوراطمینان ہے کہ حکومت بمبئی مرہٹواڑہ کے مسلمانوں کےان ناگفتہ بہ حالات سے ناواقف نہیں ہے بلکہ وہ ان کے حالات کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے ہروقت تیار ہےاوراسے اس کی فکر ہے، چنانچہ حکومت بمبئی کے وزیر مسٹر سید قاضی غیاث الدین صاحب کا دورۂ مرہٹواڑہ بڑی حد

تک اس تقاضا کو پورا کررہا ہے، شاید جلد ہی کوئی دوسرا وزیر بھی ان علاقوں کا دورہ کرنے والا ہے۔

قاضی صاحب سے خلد آباد میں عثمان آباد، ناڈیر، پربھنی، اورنگ آباد اور دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے ذمہ دار مسلمانوں نے اپنے یہاں کے جن معاملات ومسائل کو رکھا ان میں بیواؤں کا مسئلہ، یتیموں کا مسئلہ، اوقاف کا مرحلہ، جاگیروں پر غائبانہ قبضہ کا واقعہ خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے، اوران باتوں کی طرف خصوصی توجہ دینا حکومت بمبئی کے لئے ضروری ہے۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمعیۃ علماء یا جو جماعت بھی ان علاقوں میں کام کرنا چاہتی ہے، چند باتیں بطور مشورہ اور گزارش اس کے گوش گزار کردی جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد کے مسلمان انگریزی دورِ حکومت میں سیاسی شعور کی ان قدروں سے محروم تھے جو ہندوستان میں عام طور سے دیہات میں پائی جاتی تھیں، اور یہ صرف حیدرآباد کے مسلمانوں پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس بارے میں ہندوستان کی تمام ریاستوں کے باشندوں کا حال یکساں ہے، حیدرآباد کے مسلمانوں نے عام طور سے نہ تجارت کی اور نہ صنعت وحرفت کی طرف توجہ کی، بلکہ جاگیرداری اور شاہی نوکری کے مزاج نے ان کو آزاد جینے، آزاد سوچنے اور آزاد کام کرنے کی صلاحیت سے محروم رکھا تھا۔ وہ بڑی بےفکری سے زندگی بسر کررہے تھے کہ یکبارگی حالات نے ان کو پولیس ایکشن کے ایسے بدترین دور میں مبتلا کردیا، جس کے ظلم وستم اوروحشت وبربریت کے سامنے عزم وثبات کے پہاڑ اور عقل وخرد کے آہنی ستون بھی ناکام ہوجاتے ہیں چہ جائیکہ یہ مسلمان!

چنانچہ بے پناہ مظالم نے جن کا سلسلہ اب تک جائدادوں پر غاصبانہ قبضہ، اوقاف سے محرومی، وظائف کی بندش، بیواؤں کی کس مپرسی، یتیموں کی بے پناہی اور

عام تباہی کی صورت میں جاری ہے، ان مسلمانوں کو بڑی حد تک اپنے معاملات کے سمجھنے اور ان کیلئے کام کرنے تک کی سکت سے محروم کردیا ہے اور ان میں کام کرنے کا وہ جوش ولولہ نہیں پایا جارہا ہے جس کی سخت ضرورت ہے۔

لہٰذا ان حالات میں ان سے غفلت برتنا یا ان کی نااہلیت کا شکوہ کرنا سماجی اور سیاسی کام کرنے والی جماعتوں اور خالص دینی اور اسلامی کام کرنے والے اداروں کے لئے بلکہ خود حکومت کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے، ضرورت ہے کہ ہم اپنے فرائض کی ادائیگی سے دریغ نہ کریں اور ان مظلوموں کے کام آئیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں حکومت بمبئی پر پورا اطمینان واعتماد ہے کہ اس نے مرہٹواڑہ کے مسلمانوں کے حالات پر ہمیشہ مستعدی دکھائی ہے اور آئندہ بھی وہ اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوگی۔ (ماہنامہ ''البلاغ''، بمبئی۔ مئی تا جولائی ۱۹۷۳ء)

☆☆☆☆☆☆☆

دہلی کا ایک یادگار سفر (نومبر ۱۹۶۲ء)

حرمین شریفین زادھما اللہ شرفاً ومھابۃً عالم اسلام کے دو دینی، روحانی، اور علمی مرکز ہیں۔ علوم دینیہ کی مرکزیت عہد صحابہ سے لے کر دور حاضر تک مختلف رنگوں میں باقی رہی۔ پہلے دنیائے اسلام کے امراء وسلاطین نے اپنے خصوصی صرفہ سے یہاں پر دینی وعلمی معاہد ومدارس قائم کئے، قابل اساتذہ وشیوخ رکھے، اور عظیم الشان کتب خانوں کی بنیاد ڈالی، چنانچہ ہندوستان کے امراء وسلاطین نے بھی حرمین شریفین کی ان خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خاص طور سے بنگال اور گجرات کے سلاطین نے بڑے اخلاص کے ساتھ یہاں علمی ودینی خدمات کی، مگر اسی کے ساتھ یہ عجیب بات ہے کہ عہد صحابہ وتابعین کے بعد ان دونوں اسلامی مرکزوں کی جیسی علمی مرکزیت ہونی چاہئے نہ ہوئی بلکہ علمی ودینی خدمات کا سلسلہ انفرادی رنگ میں جاری رہا، نہ جامع ازہر قاہرہ جیسی دینی درس گاہ بن سکی، نہ جامع قزوین جیسا جامعہ بن سکا، اور نہ اسلامی علوم کی یونیورسٹی قائم ہوسکی، ترکی سلاطین کو اس طرف توجہ آخر میں پیدا ہوئی جبکہ ان کے اقبال کا چراغ گل ہورہا تھا، انھوں نے مدینہ منوّرہ میں ایک عالمی اسلامی یونیورسٹی کی اسکیم بنائی تھی جس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی فنون کی ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو۔ اور قرآن وحدیث کے ساتھ مسلمانوں کے بچے ہر قسم کی موجودہ زمانہ کی تعلیم سے بہرہ ور ہوسکیں۔ سلاطین عثمانیہ کا یہ تصور بڑا خوش آئند اور خوش کن تھا مگر ان کے اس ذہنی خاکہ میں عملی رنگ نہ بھرا جاسکا، اور ان کے اقبال کا وقت پورا ہوگیا۔ مرحوم سلطان عبدالعزیز کا زمانہ ہنگامی زمانہ تھا۔ حجاز میں ان کی حکومت نئی نئی تھی اس لئے انھوں نے اپنی ساری توجہ توحید ورسالت کی عملی تعلیم اور امن وامان کی بحالی

پر صرف کی۔ الحمدللہ کہ وہ اس میں کامیاب رہے۔ اور اپنی زندگی ہی میں کھلا ہوا صالح انقلاب عربوں میں دیکھ لیا، ان کے بعد جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز کا دور آیا تو بنیادی کام کرنے کی فضا سازگار ہوچکی تھی، چنانچہ موصوف نے حرمین شریفین کی جدید تعمیر وتوسیع اور ترمیم کا عظیم الشان سلسلہ شروع کیا۔ اور پچاس کروڑ ریال کے صرفہ سے مسجد نبوی شریف کی تعمیر وتوسیع کرائی، اس کے بعد حرم مکی کا عظیم الشان کام شروع کیا۔ اس درمیان میں حرمین شریفین میں ایک عظیم الشان دینی یونیورسٹی کا خیال بھی قائم رہا تا آنکہ حرم مدنی کی تعمیر کے بعد ہی حرم مکی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اس خیال کو بھی عملی جامہ پہنانے کا کام شروع ہوگیا اور مدینہ منورہ میں ''الجامعة الاسلامية'' کے نام سے ایک عظیم الشان عالم اسلام کی یونیورسٹی کھل گئی، اور پورے عالم اسلام سے دین کی اونچی تعلیم کے طالب علموں کی مقدار مقرر ہوئی جن کے شروع سے آخر تک جملہ اخراجات یونیورسٹی نے اپنے ذمہ لئے اور اسی تقسیم وتقدیر کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ یہاں کے علمی ودینی معاہد ومدارس سے مخصوص تعداد میں طلبہ طلب کئے گئے۔

میں نے بھی مولوی خالد کمال کیلئے کوشش کی اور وہ مدینہ منورہ پہونچ گئے، جہاں تک اس باب عالی میں داخلہ کے اذن کا تعلق ہے اس میں دو شخصیتوں کا بڑا ہاتھ ہے، ایک جامعہ اسلامیہ کے نائب الرئیس فضیلۃ الشیخ العلامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز اور دوسرے میرے دیرینہ کرم فرما محترم معالی الوزیر الشیخ یوسف بن عبد اللہ الفوزان وزیر مملکت عربیۃ السعودیہ مقیم دہلی۔ موصوف نے ہر قسم کی آسانیاں فراہم کرنے میں اخلاص، اخلاق، ہمدردی اور شرافت ومروت کا وہ مظاہرہ فرمایا ہے، کہ زبان بارِ ندامت سے شکریہ ادا کرتے ہوئے بھی جھجھک محسوس کرتی ہے، نیز نائب قنصل محترم الشیخ حسین صاحب اور دوسرے ارکان نے بڑے اخلاص سے تعاون فرمایا

۔واقعہ یہ ہے کہ اگر محترم الشیخ فوزان صاحب کی عنایت نہ ہوتی تو یہ کام انجام کو نہیں پہونچ سکتا تھا اور انھوں نے نہ صرف ایک وزیر ہونے کی حیثیت سے کام کردیا بلکہ ایک مخلص ترین مسلمان کی حیثیت سے ضرورت سے زائد کرم فرمایا۔

بمبئی میں پاسپورٹ بنانے اور دوسرے سرکاری مراحل طے کرنے میں میرے محسنوں نے بڑے اخلاص ومحبت کا ثبوت دیا، خاص طور سے محترم الحاج احمد غریب صاحب سکریٹری انجمن خدام النبی اور محترم ضیاء الدین صاحب پرنسپل انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی نے اس معاملہ میں ہر وقت ہر خدمت ہر طرح سے کی۔

دہلی یعنی اسلامی تاریخ کی ایک کتاب :۔

پندرہ سال کے بعد اب نومبر ۱۹۶۲ء میں دہلی جانے کا اتفاق ہوا، ملک کی تقسیم کے بعد لاہور کیا چھوٹا کہ اِدھر کا رُخ نہ ہوسکا، اور بمبئی نے اس طرح کھینچ لیا کہ دوسری طرف نظر اٹھانے کی مہلت نہیں مل سکی، بمبئی ایسا ہی شہر ہے جو یہاں کا ہوجاتا ہے وہ دوسری طرف بہت کم دیکھتا ہے۔ ۱۵ر نومبر کی شام کو بمبئی سے چل کر ۱۷ر کی صبح کو دہلی پہونچا، یہ سفر بالکل علمی اور دینی تھا، علمی اس لئے کہ عزیزم مولوی خالد کمال سلّمہٗ کو تعلیم کیلئے غیر ملک روانہ کرنا تھا اور دینی اسلئے کہ اس سفر کی منزل مہبطِ وحی، مرکزِ اسلام اور علوم اسلامیہ کی اولیں درسگاہ مدنیہ منورہ زادھا اللہ شرفاً وتعظیماً تھا اور یہ شَدِّ رحال مسجد نبوی پر جاکر کھلنے والا تھا۔

چونکہ یونیورسٹی کیلئے روانگی دہلی ہی سے محترم معالی الشیخ یوسف الفوزان صاحب کے توسط وانتظام سے ہوتی ہے، اسلئے بمبئی کا کام مکمل کرکے دہلی جانا پڑا۔

اس سے پہلے دہلی کو بار بار دیکھا تھا، آیا گیا تھا، اور اس سے پوری طرح واقفیت تھی، مگر اب کے پوری دہلی ہی نئی دہلی معلوم ہوئی، پندرہ سال کے بعد دہلی پر جب نظر پڑی تو یہ شعر یاد آیا۔ ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا اک جام میں نہاں
نکلے جو میکدے سے تو دنیا ہی بدل گئی

۱۹۴۷ء کے اک جامِ آتشیں نے دل و دماغ، فکر ونظر حتیٰ کہ جسم و روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور قدح خوارانِ حریت جب باہر نکلے تو بدمستی وخرمستی کا عالم برپا ہوگیا، سینکڑوں سال تو کیا ہزاروں سال کی شرافت وانسانیت، تہذیب و دولت اورعزت وشہرت دم کے دم میں خاک میں مل گئی۔ معاً میر تقی میر کے یہ اشعار ذہن میں آئے۔

دلی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کر ویران کردیا　　ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں میرؔ کی روح کی اجازت سے یہ وقتی تبدیلی کی جاسکتی ہے وہ خوشی سے اس کی اجازت دیں گے، ’’ہم آنے والے ہیں اسی اجڑے دیار میں‘‘......نئی دہلی سے بلی ماران تک کا راستہ ٹیکسی پر صبح تڑکے میں تیزی سے طے ہورہا تھا اور دل و دماغ پر دہلی کی روایات تیزی سے گزر رہی تھیں ۔ یہ بڑی الجھن کا وقت تھا، دماغ کے سفر میں قدم قدم پر موڑ اور منزل کا سامنا ہوتا تھا مگر ٹھہرنے اور کسی ایک پہلو پر غور کرنے کی مطلق فرصت نہ تھی، بلکہ جس طرح ایک قدم کا عدم دوسرے قدم کے وجود کا سبب ہوتا ہے اور ماضی کے ہر لمحہ کی شاہراہ پر مستقبل کے قدم پڑتے ہیں اسی طرح ذہن و دماغ میں دہلی کے شاندار ماضی کی آمد وشد برپا تھی، قدیم فلاسفۂ یونان کے یہاں مُعِدّاتِ دہر اس کو کہتے کہ اس عالم ایجاد میں ہر آن یوں کون وفساد کا سلسلہ جاری ہے کہ ایک کا عدم دوسرے کے وجود کا سبب بنتا ہے، دن کے ختم ہونے پر ہی رات آسکتی ہے، پہیئے کا ایک چکر ختم ہوکر دوسرا چکر پیدا کرسکتا ہے۔

لیکن کہیں کہیں پر:۔

چونکہ یہ سفر سراسر علمی اور دینی تھا، اسلیئے منزل کے جو نقوش دل و دماغ پر ابھرے ان میں وہی نوعیت اپنا رنگ لئے ہوئے تھی، غالباً صبح کے چار بجے تھے نومبر کی ابتدائی سردی تھی، ٹرین او کھلے کے بعد ایک اسٹیشن پر ٹھہری، دیکھا تو رومن خط میں لکھا ہوا تھا ''حضرت نظام الدین جنکشن'' اسے دیکھتے ہی حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے پاک ہم نفسوں کے اشغال سحر گاہی، تہجد، وظیفے اور گریہ وزاری کا نقشہ سامنے آگیا، باہر اونچے اونچے گنبد، گرے پڑے روضے، اور سونے سونے کھنڈرات رات کے آخری حصہ کی خاموش فضا میں ایسے پُر جمال نظر آرہے تھے جیسے ان کے پاک باشندے اپنے اپنے زاویوں اور خانقاہوں میں مصروف عبادت ہیں، ایسے حسین وقت میں اپنی گزشتہ روحانیت وتقدیس کے یہ خاموش افسانے اور اربابِ دل کی یہ موجودہ ساکت وصامت وادیاں اربابِ ذوق ونظر کیلیئے اب بھی بہت کچھ سامانِ عبرت رکھتی ہیں، رات کا آخری حصہ اور دین وایمان کی یہ آخری یادگاریں یہ نقشہ پیش کررہی تھیں۔ ع

''تارے چمک رہے ہیں لیکن کہیں کہیں پر''

یہ اور اسی قسم کے کہیں کہیں چمکنے والے تارے آج بھی دہلی کے حسن و جمال کے شاہد عدل اور آئینہ دار ہیں، اگر قطب مینار، لال قلعہ، مقبرۂ ہمایوں، جامع مسجد، مسجد فتحپوری، مسجد قوت الاسلام وغیرہ دہلی میں نہ ہوں تو پھر اس راجدھانی میں غیر ملکی مہمانوں کو اپنا شاندار ماضی دکھانے کیلیئے کیا رہ جائے گا، اور دنیاوی جاہ وجلال، آرٹ ،فنون لطیفہ، فن تعمیر کی کون سی یادگار ہندوستان کی ترجمانی کرسکے گی؟ دہلی کی زینت میں سرکاری وغیر سرکاری حلقوں میں ان ہی یادگاروں کو شمار کیا جاتا ہے، حالانکہ جب بھی اس ملک میں کوئی انقلاب آیا ہے تو اس کی جان پر بنی ہے اور اسے تباہی وبربادی سے دوچار ہونا پڑا ہے، اور پھر اس سے عجیب تر حقیقت یہ ہے کہ اس تباہی وبربادی

میں آبادی کا پہلو بھی مضمر رہا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ آٹھ سو سال تک مسلم اثرات نے ان سب میں اس طرح امتزاج پیدا کردیا ہے کہ جیسے مختلف دھاتوں کو ایک کر کے کوئی ٹھوس دھات بنالی جائے اور توڑنے پھوڑنے کی مسلسل کوشش کے باوجود اپنی جگہ پر موجود ہو، اگر یہاں کی ملی جلی تہذیب میں یہ سخت جانی نہ ہوتو پندرہ سال کی مسلسل یلغار سے کب کے ختم ہو چکی تھی۔

دہلی ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن اور مسلمانوں کے علوم وفنون کا مرکز رہی ہے، کئی مرتبہ دہلی پر آفت آئی مگر اسلامیوں کی شان پھر ابھری اور آب وتاب سے چمکی، چنانچہ آج بھی یہ شہر مسلمانوں کا سب سے مقدس شہر اس اعتبار سے ہے کہ اس کی زمین میں مسلمانوں کی عظمت کی داستانیں دفن ہیں۔ چپہ چپہ کے سینے میں بے پناہ شخصیتیں محوِ خواب ہیں اور کونے کونے میں مسلمانوں کی عظمت وجلال کا سرمایہ زیر زمین ہے۔اس ملک میں اسلامی عظمت اور مسلمانوں کی شوکت کے دوسرے بھی کئی مراکز ہیں، مگر جو ثبات ودوام آج بھی دہلی کو حاصل ہے وہ کسی اور شہر کو نہیں ہے، حالانکہ آج دہلی اسلامیوں کے حق میں ایک اجاڑ بستی معلوم ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی آبادی صرف محدود علاقوں میں محدود تعداد میں ہے، جن کی حالت ہر اعتبار سے قابل رحم ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ دہلی کی سرزمین ان کے آباء واجداد کی زندہ تاریخ ہے، جس کے کچھ ابواب لال قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، مسجد فتحپوری اور نظام الدین اولیاء، امیر خسرو، خواجہ باقی باللہ اور خاندان ولی اللٰہی کے مقبروں اور خانقاہوں کی شکل میں ثبات ودوام کے حروف سے لکھی ہوئی ہیں، اور دنیا کے سیاح ان کو سب سے پہلے پڑھتے ہیں، پندرہ سال کے بعد دہلی جانے پر یہ نقوش نئے انداز میں ابھرے مگر افسوس کہ اب ان میں رنگ بھرنے کا سرمایہ نہیں رہا، اور مسلمانوں کے ادارے، رجال اور سرگرمیاں کالعدم ہیں۔

اسلامی آثار و علائم:۔

بغداد وقرطبہ اور مصرواندلس کے جوامع ومساجد کوابھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے، مگر دہلی کی جامع مسجد دیکھ کہ ان کی عظمت وشوکت کا اندازہ ہوجاتا ہے، لاہور کی شاہی مسجد اور دہلی کی جامع مسجد دونوں اسلامی جاہ وجلال کی زندہ تصویریں ہیں، ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سجدے کس قدر پُرتاثیر تھے جن کیلئے یہ مسجدیں بنائی گئی ہیں اور وہ پیشانیاں کس قدر غیور تھیں جو ان میں اپنے رب کے سامنے جھکتی تھیں۔ان کے درودیوار اور محرب ومنبر سے عبد ومعبود کے تعلقات کے ثبات ودوام کا پتہ چلتا ہے، ان پُرشکوہ مسجدوں اور پُرجلال عمارتوں میں یقین وایمان کی لافانی قدریں کارفرما ہیں اور قلب ونظر کی بے پناہ کیفیات نے ان میں نقش ونگار کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔

جامع مسجد:۔

دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ دونوں آمنے سامنے واقع ہیں، بیچ میں اس طرح میدان ہے کہ ہرایک جگہ سے دوسرے کو دیکھا جاسکتا ہے، توحید پرستوں نے اللہ تعالیٰ کے جلال وعظمت کا خیال اس طرح رکھا ہے کہ جامع مسجد کو سطحِ زمین سے سینکڑوں سیڑھی اوپر لے جاکر تعمیر کیا ہے، اور شاہی محل کے مقابلہ میں خدائی محل ہراعتبار سے سربلند ہے، جامع مسجد کا پورا علاقہ اگرچہ آج کل گندے بازار کی شکل اختیار کرچکا ہے ،اور کباڑ خانہ معلوم ہوتا ہے جو ذوق پر بہت گراں گزرتا ہے پھر بھی حال یہ ہے کہ قدم تھکنے سے پہلے مسجد کی طرف اوپر دیکھتے ہوئے نظریں تھک جاتی ہیں۔تین طرف سے سینکڑوں سیڑھیاں اور ہرطرف پُرشکوہ سرخ دروازے واقعی اسلامی قلعہ کا منظر پیش کررہے ہیں، ہم دونوں اکثر جامع مسجد دہلی میں نماز پڑھتے تھے، اس بار جب پہلی مرتبہ فجر کی نماز اس میں پڑھی اور صحن میں آکر نظر دوڑائی تو ایسا معلوم ہوا کہ وسیع وعریض اور صاف ستھرا صحن گزشتہ پورے عالم اسلام کا نقشہ ہے، جس میں اندلس سے

لے کر سمرقند و بخارا تک اسلامی دنیا اپنی تمام زندہ قدروں کے ساتھ موجود ہے، اور بنو امیہ کی سادگی و پُرکاری بنو عباسیہ کی رنگینی، سلجوقیوں کے اخلاص، غزنویوں کی اسلامی خدمات اور مغلوں کی گنگا جمنی زندگی سب یہاں پر تصور و خیال کی دنیا میں زندہ و متحرک ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم اس وقت ہزاروں سال پہلے کی اسلامی دنیا کے درمیان تماشائی بن کر کھڑے ہیں، یہی دہلی کی جامع مسجد ہے جو کئی صدیوں تک علماء و فضلاء، عباد و زہاد، ارباب دل اہل کمال کا مرکز رہی ہے اور توحید پرستوں نے اسے اپنی پیشانیوں سے آباد کیا ہے۔

لال قلعہ:۔

لال قلعہ ہندوستان کے تاج کا واقعی لعل ہے جس کی چمک دمک کئی صدیوں تک مغل شہنشاہوں کی عظمت و شوکت دکھاتی رہی ہے، مئی ۱۸۵۷ء کی ایک شام نے اس کے اقبال کو بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کی شکل میں ختم کر دیا۔ اندلس کے قلعہ حمراء (لال قلعہ) کو یورپ کی مسیحی طاقتوں نے تاراج کیا اور ہندوستان کے لال قلعہ (قلعہ حمراء) کو بھی مسیحیوں نے تاراج کرنا چاہا، اندلس سے لے کر انڈونیشیا تک اس قوم نے اسلام کے کیسے کیسے آثار کو مٹا کر استبداد کا جھنڈا لہرانے کی کوشش کی، مگر یہ بیت الہند یعنی لال قلعہ آج بھی ہندوستان کی عظمت رفتہ کا امانتدار ہے اور حکومت نے اس کی اہمیت و عظمت کو بہرحال محفوظ رکھا ہے۔

ہمایوں کا مقبرہ:۔

مغل شہنشاہوں کے لافانی شاہ کاروں میں ہمایوں کا مقبرہ بھی شامل ہے جس میں شہنشاہ ہمایوں کے ساتھ ساتھ اس کی شان و شوکت دفن ہے، وہ خود خاک میں مل چکا ہے مگر اس کی عظمت زندہ ہے، اور اس کی شام مرگ صبحِ زندگی کا منظر پیش کر رہی ہے۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں کیسے کیسے آثار کس کس بہانے سے باقی

رکھے ہیں، اور اپنے ملک کے بے شمار صناعوں، کاریگروں، معماروں، مزدوروں اور ارباب فن کی قدر دانی اور رزق و معیشت کیلئے کیا کیا جتن کیے، کہیں مقبرے بنوائے، کہیں قلعے بنوائے، کہیں مینار بنوائے، کہیں پل، سڑکیں اور سرائیں بنوائیں۔اور کہیں کسی اور حیلے بہانے سے انسانوں کی پرورش و پوشش کا انتظام کیا۔

قطب مینار:۔

بابل اور اسکندریہ میں اربابِ اقتدار کے مینارے مدتوں زمین کے سینے پر نصب رہے اور اپنے بنانے والوں کی عظمت رفتہ کی کہانی کہتے رہے ہیں، مگر دہلی کا قطب مینار اپنے بانی سلطان قطب الدین ایبک کی بلند پروازی، عالی ہمتی کا نشان بن کر موجود ہے، فراعنہ مصر نے اپنے اہرام اور براجم میں اپنی خدائی کے اشارات رکھے ،مگر خدا پرست بادشاہ نے خدا سے لَو لگانے اور اس کی بلند جناب تک اپنی عبدیت و بندگی کی کچھ قدریں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کا قطب مینار بابل واسکندریہ کے میناروں سے جداگانہ مزاج رکھتا ہے۔

یہ تو دنیاوی امراء وسلاطین کے چند آثار وعلائم کی بات تھی، اس سرزمین میں فقیروں کی بادشاہیاں بھی جاہ وحشم اور جلال و جمال میں اپنے لوگوں کی ترجمان ہیں، اور ''آناں کہ درفقیری شہنشاہی کردہ اند'' بھی اس شہر میں اپنے سازوسامان سے شہنشاہیت کا مقابلہ کررہے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت بختیار کاکی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت خواجہ باقی باللہ، خانوادۂ ولی اللٰہی اور خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے اربابِ دین ودیانت اور اہل فضل وکمال یہاں آسودۂ خاک ہیں۔

بدایونی کی منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ اس وقت دہلی میں وقت کے ہر علم وفن کے اتنے باکمال موجود تھے کہ پوری دنیائے اسلام میں ان کی نظیر نہیں ملتی تھی، علمائے شریعت، اربابِ طریقت، شعراء، ادباء، فلاسفہ، فقہاء ومحدثین غرض کہ ہر علم اور ہر فن

کے منتخب روزگار دہلی کی آغوش میں آسودۂ خواب ہیں، اور جگہ جگہ ان کے مزارات، قبے، زاویئے، خانقاہیں، مدرسے اور مکانات کے گرے پڑے نشانات ان کا پتہ دے رہی ہیں۔

حَظیرۃ المقدس میں حاضری:۔

بمبئی میں پاسپورٹ کی پریشانیوں اور مرکز سے اجازت ملنے کی تاخیر کے باعث مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زیادہ یاد آتے رہے، کہ اگر حضرت مرحوم ہوتے تو ایک خط کے بعد تمام پریشانیاں ختم ہو جاتیں۔

چنانچہ دہلی جانے کے بعد دوسرے ہی دن ۱۸؍نومبر کو ہم دونوں نے جامع مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد مہندی والے (اب مہندیان سے مشہور ہے) قبرستان کے گنجینۂ علم وفضل پر حاضری کا پروگرام بنایا، دونوں انجان تھے، کچھ دور سواری پر اور کچھ دور پیدل چلے، جب مہندی والے قبرستان کے احاطہ میں گئے تو عجیب عالم نظر آیا، مسلمان دھوبیوں کے جھونپڑے قبرستان کو آباد کئے ہوئے تھے اور ایک طرف ان کی بھٹیاں، کپڑے اور گرے پڑے مکانات تھے، کچھ دور جاکر اوپر کی طرف چڑھے تو دیکھا کہ بے شمار قبروں کا ڈھیر ہے، آگے ایک مسجد کی قبلی دیوار نظر پڑی اور دیوار سے متصل جنوبی سمت مشہور شاعر مومن دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار نظر آیا، جسے مولانا آزاد سوسائٹی نے حال ہی میں مرمت کرایا ہے۔ نظر پڑتے ہی والہانہ انداز میں ان کا یہ مصرعہ زبان پر آیا۔ ؎

”مومنؔ نہیں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم“

مومنؔ صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ مجاہدین تحریک کے سرگرم رکن بھی تھے، پکے موحد اور صحیح معنوں مومن تھے، سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی مجاہدانہ تحریک کے ساتھی تھے، مرنے کے بعد جگہ بھی ان ہی کے جُھرمٹ میں پائی جن

کی معیت میں زندگی بسر کی تھی، اسی دیوار کے بعد متصل ہی خانوادۂ ولی اللٰہی کا پورا علم وفضل دفن ہے، ہم آگے بڑھے اور مسجد کا شمالی دروازہ کھولا، اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی فرش کے کنارے دکھن جانب ایک نئی قبر پر لکڑی کا سیاہ تختہ نظر آیا جس پر سفید حروف میں یہ شعر لکھا تھا۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

نظر پڑتے معلوم ہو گیا کہ یہی مجاہدِ ملتؒ کی قبر ہے، اور ایسا معلوم ہوا کہ مولانا اپنی پُرانی وضع کے مطابق نہایت تپاک سے مل کر حال احوال دریافت فرمارہے ہیں کہ اس کام کیلئے دونوں آدمیوں کو دہلی آنے کی کیا ضرورت تھی؟ وقت اور روپیہ ضائع کرتے ہوئے آپ لوگوں کو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، لڑکے کو ایک خط دے کر بھیج دیا ہوتا، یہاں سب کام ہو جاتا اور اسے روانہ کر دیا جاتا۔ خیر اب آپ نے اپنا نقصان کرہی لیا ہے، بتایئے کیا کرنا ہے؟............مولانا مرحوم جب کوئی شخص کام لے کر جاتا تھا تو پہلے اسی طرح خاص انداز میں گفتگو فرما کر فوراً کام کرنے والے سے بات کرنے لگتے تھے اور ہر چھوٹے بڑے کا کام اسی انداز سے کرتے کراتے تھے، اللہ رحم فرمائے مولانا بڑی آن بان اور جلال وجمال کے آدمی تھے، اُن کی ان باتوں میں بڑا لطف آتا تھا بلکہ آج بھی ان کی ان اداؤں اور بولیوں کو نقل کرنے میں ایک گونہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجاہد ملتؒ کو مسلمانانِ ہند اور عالم اسلام کی طرف سے بہترین جزا دے کہ انھوں نے ان کیلئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

اس سے متصل دکھن جانب وہ ''حظیرۃ المقدس'' ہے جو ہندوستان کے موجودہ دینی علوم وفنون کا مرکز ہے، آج ہندوستان میں علم قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر کے ساتھ ساتھ ''احسان'' کا مقامِ بلند اسی خواب گاہ میں آرام کرنے والے بزرگوں کی بدولت پایا جاتا ہے، ایک چبوترہ پر ان کی قبروں کی قطاریں ہیں اور ہر قبر کے سرہانے

ان میں سونے والے بزرگ کا نام اورسن وفات درج ہے، ان میں سے چند حضرات یہ ہیں۔

حضرت مولانا مخصوص اللہ صاحب محدث دہلویؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ، وفات ۷؍شوال ۱۲۳۹ھ، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ، وفات ۲۹؍محرم ۱۱۷۶ھ، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب محدث دہلویؒ، وفات ۱۱۳۱ھ، حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی، وفات ۱۲۳۳ھ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ، وفات ۱۲۳۰ھ، حضرت مولانا عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ، وفات ۱۲۲۷ھ وغیرھم رحمھم اللہ۔

یہ وہ خلاصۂ علم وفضل ہیں جن کا فیض آج پورے ہندوستان میں جاری ہے اور ہم سب ان ہی کے سلسلے کے آدمی ہیں، حدیث میں ہمارا سلسلۂ روایت وسند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ تک پہونچ کرآگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب اورحضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ قرآن سے تو عام لکھے پڑھے مسلمان مستفیض ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا اور اردو زبان میں ان کے صاحبزادوں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب اورحضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے کیا، یہ تینوں ترجمے عام طور سے چھپتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں۔

اس قبرستان میں آنے کے بعد ایک عجیب دنیا سامنے آگئی، پورے ہندوستان میں ادھر دوسوسال سے جوعلمی سرگرمیاں برپا ہیں، تقریباً ان سب کا مرکز ومرجع اسی چارگز ویرانے میں ہے، یہ ویرانہ کس قدر آباد ہے اور یہاں کی سنسان اورخاموش دنیا صدیوں کی قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے کسقدر معمور ہے؟ اپنے سلسلے

کے بزرگوں اور شیوخ واساتذہ کی اس بستی میں پہونچنے کے بعد سب کچھ بھلا کر ان ہی کی زندگی بسر کرنے میں دین وایمان اور سکون واطمینان کی لذت کا یقین ہوا، کہ یہ حضرات اپنے زمانہ کے بخاریؒ ومسلمؒ ہونے کے ساتھ جنیدؒ وشبلیؒ بھی تھے۔

مسجد کے احاطہ میں پورب جانب میں بھی بہت سے بزرگوں اور عالموں کی قبریں ہیں ۔ ہم نے ان سب قبرستان میں جاکر اس ساکنوں کے حق میں دعائے مغفرت کی، فاتحہ پڑھا اور قرآن شریف درود شریف پڑھ کر ایصال ثواب کیا، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس کی تاکید فرمائی اور اس کا حکم دیا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ان کی اس آباد وشاد دنیا سے عبرت کی بڑی قدریں لے کر لوٹے، خدا کرے وہ قدریں دل ودماغ پر چھائی رہیں یہاں تک کہ ہماری زندگی بھی اپنے شیوخ واساتذہ کی طرح بالکل دینی وعلمی ہوجائے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

اسی سفر میں پہلی بار مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا کی زندگی میں دو مرتبہ ان سے ملاقات کا موقع ملا تھا، ایک مرتبہ غالباً اگست ۱۹۴۶ء میں لاہور میں جبکہ مولانا کانگریس کے صدر تھے اور میں اخبار ''زم زم'' لاہور میں کام کرنے کے ساتھ زم زم کمپنی کی فرمائش پر ''منتخب التفاسیر'' جمع کر رہا تھا، یہ کام دو سال میں ساڑھے نو سو صفحات میں مکمل ہوا، جس میں ہندوستان میں لکھی ہوئی تمام مروجہ تفسیروں کا خلاصہ درج کیا تھا اگر شائع ہوگئی ہوتی تو بڑے کام کی چیز ہوتی، تقسیم سے پہلے تیرہ پارے اس کی کتابت بھی ہوچکی تھی، مولانا بحیثیت صدر لاہور آئے تھے، فلیٹی ہوٹل میں شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ قیام پذیر تھے، ''غبار خاطر'' کا مسودہ ساتھ تھا اور اس کی طباعت کیلئے کاغذ وغیرہ کا مرحلہ مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کے ذریعہ طے فرما رہے تھے، نیز ترجمان القرآن جلد ثانی کا معاملہ زمزم کمپنی لاہور سے طے کر رہے تھے، اسی سلسلہ میں مولانا سے معاملہ کی نجی بات کرنے

کیلئے ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، مولانا کو جب معلوم ہوا کہ میں قرآن کریم کی خدمت کے سلسلہ میں یہ کام کررہا ہوں تو دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ جزائے خیر دے، آمین

دوسری ملاقات ۱۹۵۲ء میں بمبئی کے تاج ہوٹل میں ہوئی تھی، جسے صرف ملاقات ہی کہنا چاہئے، اس میں ان کی زبان سے مسلمانانِ ہند کے بارے میں بڑے دل گیر الفاظ سننے میں آئے تھے۔ مولانا آزادؒ کی علیحدہ پسندی اور انفرادیت ان کے وصال کے بعد بھی ظاہر ہوتی ہے۔........... جامع مسجد کے سامنے ایک حسین پارک میں نازک کمانوں کے زیر سایہ مولانا کا مزار ان کی نزاکتِ طبع اور ذوق لطیف کی ترجمانی کررہا ہے۔ (البلاغ، بمبئی فروری ۱۹۶۳ء)

☆☆☆☆☆☆☆

سفرنامہ ناندیڑ (اپریل ۱۹۶۳ء)

جمعیۃ علماء ہند مہاراشٹر کے ماتحت ۱۲/اور ۱۳/اپریل ۱۹۶۳ء کو اضلاع مرہٹواڑہ کا دینی و تعلیمی کنونشن ناندیڑ میں منعقد ہوا، جس میں مسلمان بچوں کی بنیادی دینی تعلیم کو مرہٹوارہ کے علاقہ میں عام کرنے کے طور وطریقہ پر غور کیا گیا، جمعیۃ علماء ہند کا یہ علاقائی دینی تعلیمی کنونشن صاحبزادہ مولانا سید اسعد میاں صاحب کی صدارت میں ہوا، اور اس میں راقم الحروف نے محترم حکیم اعظمی صاحب صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے ایماء سے شرکت کی، ۱۱/اپریل پنجشنبہ کی شام کو ناگپور اکسپریس سے روانگی ہوئی، اور براہ منماڑ جمعہ کو ساڑھے بارہ بجے دن میں ناندیڑ پہونچے، اورنگ آباد اسٹیشن سے محترم غازی معین الدین صاحب ایڈوکیٹ اور محترم یوسف الدین صاحب مغربی بھی ساتھ ہوگئے، اس پورے سفر میں ایک بار پھر معلوم ہوا کہ ہر قسم کی آسانیوں کے باوجود سفر بہر حال سفر ہوتا ہے اور اس کے لئے اسلام نے جو رعایتیں رکھی ہیں ان سے آج بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جس طرح ہزاروں سال پہلے سفر کی دشواریوں کے زمانہ میں اٹھایا جاتا تھا۔

اورنگ آباد اور خلد آباد تک اس سے پہلے ایک مرتبہ سفر ہو چکا تھا، ناندیڑ کا یہ پہلا سفر تھا اس لئے سفر کی صعوبتیں نسبۃً کم معلوم ہوئیں، اور شوق سیر وسیاحت نے راستہ کی ناہمواریوں میں بھی ایک گونہ لذت پائی، ناندیڑ تلنگانہ کا ایک صاف ستھرا مرکزی شہر ہے، جنوبی ہند کے مشہور دریا گوداوری کے شمال جانب آباد ہے، لاکھوں کی آبادی میں تیس بتیس ہزار مسلمان ہیں جن میں معمولی صنعت اور دست کاری کرنے والوں کی اکثریت ہے ویسے ان میں اونچے درجے کے کاروباری اور تاجر لوگ بھی

ہیں، برادران وطن سے تعلقات ریاست حیدرآباد کے زمانہ سے اچھے ہیں، اور سقوط حیدرآباد کے بعد جو مصیبت وہاں کے عام مسلمانوں کے اوپر آئی اس سے مسلمانان ناندیڑ کو بھی حصہ ملا چنانچہ ان کے بہت سے مسائل اب تک حل طلب ہیں جن کے لئے کوشش جاری ہے۔

ناندیڑ کی اسلامی تاریخ

تاریخی ثبوت کے ساتھ نہیں بلکہ روایتی طور سے بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ ناندیڑ میں اسلام کی اشاعت حضرت شاہ کامل دادنامی ایک بزرگ کی ذات سے ہوئی ، جو سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے ناندیڑ آئے اور مقامی راجہ کے ایک باغ میں قیام کیا، راجہ نے ان کو طلب کر کے کہا کہ میرے مذہب کے علاوہ دوسرے مذہب کا آدمی میرے راج میں نہیں رہ سکتا، ان بزرگ نے ایمانی جذبہ بھرپور جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں بھی اسی جگہ رہونگا، راجہ نے اس جرأت پر آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا اور جب اس کام کو نہیں کرسکا تو قید کرنے کا حکم دیا، مگر آپ قید خانہ سے بھی باہر آگئے اور اسی باغ میں جاکر اپنی جگہ سنبھالی اب بھی راجہ کے عمال آپ کو تکلیف دیتے رہے آپ نے مجبور ہو کر سلطان محمد تغلق کو صورت حال سے مطلع کیا اس نے ۷۲۸ھ میں سید فخر الدین احمد کی سرکردگی میں فوج روانہ کی اور راجہ کی فوجوں سے مقابلہ کے نتیجہ میں سلطانی فوج کامیاب ہوئی ،اس کے بعد ناندیڑ کی کثیر آبادی نے اسلام قبول کرلیا، اور ایک عالم دین سید حکیم اللہ کو دینی تعلیم و تربیت کیلئے مقرر کیا گیا۔

حضرت شیخ رفیع الدین قندھاری ناندیڑی

بہرحال جس صورت سے بھی ناندیڑ میں اسلام پھیلا ہو، واقعہ یہ ہے کہ یہاں پر اسلام کی تشریف آوری کی تاریخ اس سے قدیم معلوم ہوتی ہے، ہمارا خیال

ہے کہ اس سے بہت پہلے یہاں پر اسلام آچکا تھا اور نویں صدی ہجری کے بعد سے عام جنوبی ہند کی طرح یہ علاقہ بھی اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنا رہا، اور یہاں کی خاک سے بڑے بڑے نامور فضلائے روزگار اٹھے جن میں سے بعضوں نے تو ہندستان سے گذر کر حرمین شریفین تک میں اپنے علم وفضل کی روشنی دکھائی اور وہاں کے اہل علم وفضل نے ان سے اکتساب فیض کیا، ان میں حضرت شیخ مولانا رفیع الدین قندھاری نانديڑی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بہت مشہور ہے۔

حضرت شیخ رفیع الدین بن شمس الدین بن تاج الدین حنفی نقشبندی قندہاری دکنی متوفیٰ ۱۲۴۱ھ رحمۃ اللہ علیہ، گذشتہ صدی کے زبردست محدثین میں سے ہیں، آپ ۱۹؍ جمادی الاخری ۱۱۶۴ھ جمعرات کو قندھار میں پیدا ہوئے جو ناندیڑ کا ایک قصبہ ہے، بلاد دکن میں گھوم گھوم کر دین کی تعلیم حاصل کی، اورنگ آباد میں حضرت شیخ قمر الدین حسینی اورنگ آبادی کی صحبت میں رہے، ان سے اور ان کے صاحبزادے شیخ سید نور الہدیٰ اور شیخ سید غلام انور اورنگ آبادی وغیرہ سے کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی پھر حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج وزیارت کے ساتھ ساتھ وہاں پر حضرت شیخ محمد بن عبداللہ مغربی اور دوسرے محدثین کبار سے حدیث کی سند لی نیز وہاں کے علماء کو اپنی طرف سے حدیث کی سند دی، چنانچہ شیخ محمد مغربی غروزی نے ''اتحاف ذوی العنایہ'' میں متعدد بار آپ کے سلسلۂ حدیث وسند کا تذکرہ نہایت ادب واحترام کے ساتھ کیا ہے، ہندستان واپس آکر طریقت ومشیخت کی تعلیم وتربیت حضرت رحمت اللہ نقشبندی سے حاصل کی، اور مدتوں ان کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا، آخر میں خلق اللہ کی فیض رسانی میں لگ گئے قرآن وحدیث کی تعلیم اور سلوک ومعرفت کی تلقین میں آپ کا بڑا حصہ ہے، وقت کے بڑے بڑے علمائے ورمشائخ نے آپ سے فیض اٹھایا اور دکن میں آپ کی ذات مرجع وماویٰ بنی سلوک وتصوف میں آپ کا ایک مختصر سا

رسالہ فارسی زبان میں ہے۔

ان کے علاوہ بھی تلنگانہ اور ناندیڑ کے اطراف میں گذشتہ صدیوں میں ہماری بزم علم وفضل کی بہت سی تابناک شمعیں روشن رہی ہیں جن کی روشنی اب تک ان ظلمت کدوں میں اپنی جھلک رکھتی ہے۔

ماضی کی چند علمی ودینی شخصیتیں

خاص شہر ناندیڑ جن نفوس قدسیہ کے انفاس گرم سے وقتاً فوقتاً فیض پاتا رہا ہے، ان کے نام اور مختصر حالات ہم دینی تعلیمی کنونشن کے صدر استقبالیہ جناب مولانا الحاج حافظ محمد عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ کے خطبۂ صدارت سے پیش کرتے ہیں،

مولانا تراب الدین صاحب آج سے تقریباً ۱۱۲/سال پہلے نواب سالار جنگ بہادر وزیر اعظم کے زمانہ میں ۱۲۷۹ھ میں سرکاری مدرسہ کے صدر مدرس بن کر تشریف لائے، اور تقریباً ساٹھ سال تک ہر قسم کی دینی وعلمی تعلیم وتربیت سے مسلمانان ناندیڑ کو نوازا، باوجودیکہ آپ سرکاری آدمی تھے مگر عوام میں مل جل کر خوب مقبول ہوئے، ان کے وجود سے یہاں کی علمی ودینی فضا بہت خوشگوار ہوئی، اور مسلمان اور ہندو سب ہی مولانا کی شاگردی پر فخر کرتے تھے، دوسرے عالم وبزرگ مولانا منظور محمد صاحب گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے، سرکاری مدرسہ میں مدرس بن کر آئے تھے، آپ حافظ، قاری اور محدث وفقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بااخلاق بزرگ تھے، انھوں نے تین سال تک ناندیڑ میں رہ کر مسلمانوں کی ہر قسم کی خدمت کی، نیز مولوی ضامن شاہ صاحب اور مولوی عبداللہ صاحب چھپر بندوی نے بھی یہاں پر علم کی شمع جلائی، مولانا حبیب حسین صاحب عیدروسی نے سرکاری امداد سے ایک دینی مدرسہ جاری کیا جو اب تک جاری ہے، مولانا سلطان حسین صاحب مجددی رامپوری نے بھی یہاں آکر تعلیم

دی، آپ ہندستان کے مشہور عربی کے شاعر وادیب مولانا طیب عرب صاحب مکی کے شاگرد رشید تھے اور کئی سال تک حرمین شریفین میں رہ کر قرآن وحدیث کی تکمیل کر کے مکہ مکرمہ کے مدرسہ صولتیہ میں مدرسی کی، یہ بزرگ راقم الحروف کے نانا حضرت مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری مبارکپوری کے معاصرین میں تھے، ان دونوں بزرگوں نے رام پور میں شیخ محمد طیب عرب صاحب مکی سے عربی ادب وشاعری کی خصوصی تعلیم حاصل کی تھی، مولانا سلطان حسین رام پوری ناندیڑ ہی میں فوت ہوئے۔

ان حضرات کے علاوہ مولانا ریاست خاں صاحب فاضل دیوبند اور مولانا نصیر الدین صاحب فاضل دیوبند نے گذشتہ دنوں یہاں علمی خدمات انجام دیں، اس وقت دار العلوم ناندیڑ میں دیگر مدرسین کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے شاگرد وخلیفہ مولانا عبد الغفور صاحب قریشی اور مولانا سید انیس الرحمان صاحب الہ آبادی فاضل دیوبند بڑے انہماک سے علمی خدمت کر رہے ہیں۔

دار العلوم ناندیڑ واقع مسجد حسانی اپنی مرکزیت وافادیت کے اعتبار سے پورے علاقۂ مرہٹوارہ میں انفرادی حیثیت کا مالک ہے پچاسوں طلبہ کو مدرسہ سے ہر طرح کا وظیفہ دیا جاتا ہے اور ان کے قیام وطعام کا مفت انتظام ان کو فقہ وحدیث کی اونچی تعلیم دی جاتی ہے، مدرسہ کا مطبخ اور دار الطلبہ ہے، مدرسین بڑے اخلاص وانہماک سے کام کرتے ہیں اور بڑے خوش خلق ہیں، مدرسہ سے متعلق ضرورت کے مطابق ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے، ضرورت ہے کہ اس کتب خانہ کو وسعت دی جائے تا کہ دار العلوم کی طرح اس کا کتب خانہ بھی علاقۂ مرہٹوارہ میں علم وتحقیق کا مرکز ثابت ہو۔

موجودہ علمی ودینی صورت حال

یہاں کے مسلمان عام طور سے اسی آخری تصوف کا شکار ہیں، جو آخری دور

میں پورے ہندستان اوراطراف میں عام تھا جگہ جگہ مقبرے، درگاہیں، اور تکیے وغیرہ ہیں، جس جگہ ہمارا قیام تھا اس کے قریب ایک چبوترہ پر چونے اور گارے کا ایک بہت بڑا شیر بنا ہوا ہے جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس پر گوشت کی نذر گذاری جاتی تھی جو مجاور کا حق ہوتا تھا، مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں مگر عام حالات دینی اعتبار سے ابتر معلوم ہوئے ،دوروزہ قیام کے دوران ان باتوں کا صحیح اندازہ کیا ہوسکتا ہے خصوصاً جبکہ جلسے جلوس کا ہنگامہ ہو، پھر بھی ہمارا اندازہ یہ ہے جو ممکن ہے بالکل صحیح نہ ہو ،لوگوں میں دینی اور علمی سرگرمیوں سے دلچسپی کم ہے ،مگر کچھ ارباب ہمت ہیں جو کام کررہے ہیں، ان میں جدید وقدیم دونوں طبقے کے لوگ موجود ہیں وہ اپنی حیثیت کے مطابق بہت کچھ کام کررہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہمتوں میں برکت دے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جوش محمد آبادی اور مرزا احمد علی بیگ چغتائی وغیرہ تعمیری وعلمی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں، ہفتہ وار اخبار کے علاوہ تصنیف وتالیف کا ذوق بھی رکھتے ہیں، اور دینی تعلیم کے سلسلہ میں آگے آگے نظر آتے ہیں، مولانا الحاج حافظ محمد عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ مقامی لوگوں میں بہت غنیمت ہیں، علم دوستی او دینی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔

نادیدہ احباب

اطراف وجوانب مثلاً لاتور، ویگلور، اورنگ آباد کے بھی کچھ حضرات کنونشن میں شرکت کرنے کیلئے تشریف لائے تھے، مقامی لوگوں اور باہر سے آنے والوں میں سے کئی حضرات راقم کو غائبانہ جانتے تھے، اوراس کے بارے میں حسن ظن رکھتے تھے ،ان حضرات سے مل کر خوشی ہوئی اور شدید احساس ہوا کہ اپنی بے مقداری کا یہ

حال ہے اور لوگ کیا کیا گمان رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نازک صورت حال کو ہمارے حق میں بہتر سے بہتر بنائے، اس موقع کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی اچھی اور جامع دعا خود فرمائی اور ہمیں بتائی،

اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا، یعنی اے اللہ! تو مجھے میری نظر میں مجھے چھوٹا بنادے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنادے۔

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس شخص کے بارے میں ہمارے خیالات اس سے دور رہ کر اچھے ہوں اگر اس سے ملنے کے بعد ان خیالات میں اور زیادتی اور پختگی ہو تو وہ شخص اچھا ہے، اور اگر قریب ہونے کے بعد ان خیالات میں کمی آجائے یا وہ بدل جائیں تو وہ شخص برا ہے۔

ماضی پر طائرانہ نگاہ

ناندیڑ اپنی تاریخ کے کئی ادوار کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے اور کئی ذہن وفکر کی جولانگاہ رہا ہے، مسلمانوں سے پہلے دریائے گداوری کنارے آباد یہ شہر ہندو فکر ونظر کا مرکز رہا ہے اور یہاں راجوں مہاراجوں کا راج تھا۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد اہل اللہ اور صوفیائے کرام کے انفاس گرم سے اس کی فضا میں تقدیس پیدا ہوئی، بعد میں دولت آصفیہ نے یہاں پر بھی اپنے نقوش واثرات ثبت کئے، سکھ فرقہ کی سپاہیانہ سرگرمیاں بھی یہاں جاری رہیں، الغرض مہاراشٹر کا یہ علاقہ اپنے سورماؤں اور سنیاسیوں کا مرکزی مقام رہا ہے۔

شہر میں جگہ جگہ آثار قدیمہ اور کھنڈر ماضی کی روایت سنا رہے ہیں، راجوں مہاراجوں اور امراء وحکام کے قلعے اور پرشکوہ مکانات کے آثار ان کے جاہ وجلال کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں، علماء وصوفیاء کے زاوئے، خانقاہیں اور مقابر و مزارات کاروان رفتہ کے نقش پا کے طور پر اب تک موجود ہیں، افسوس کہ ہمیں وقت کی تنگی اور روقتی

مصروفیات کی وجہ سے ان کی تفصیلی سیاحت و معلومات کا موقع نہیں مل سکا۔

گردوارہ گرو گوبند سنگھ صاحب

البتہ دوسرے دن ۱۳/اپریل کو ہم نے گردوارہ گرو گوبند سنگھ مہاراج کی سیر کی، جو فرقۂ سکھ کا مشہور و مقدس و تاریخی مقام ہے اور ناندیڑ کی سب سے مشہور عمارت ہے، گرو گوبند صاحب سکھوں کے دسویں گرو ہیں، ان کی پیدائش پٹنہ میں ۱۶۶۶ء میں ہوئی، آپ نے فرقۂ سکھ کی تنظیم کی اور ان کا نام خالصہ رکھا، اور اس فرقہ میں فوجی طاقت پیدا کی، مشہور ہے کہ سکھوں کے نام کے ساتھ سنگھ (شیر) آپ ہی کی ایجاد ہے، نیز کیس کنگھا، کڑا، کچھ اور کرپان سکھوں کے لئے لازمی قرار دیا اسی طرح دوسری تعلیمات آپ نے جاری کیں، گرنتھ صاحب کی تدوین بھی آپ ہی نے کی، راجاؤں اور مغل سلطنت سے متعدد لڑائیاں لڑیں، اور اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں اپنا سکہ بٹھایا، ظفرنامہ کے نام سے فارسی زبان میں ایک طویل منظوم خط اورنگ زیب عالمگیر کے نام لکھا، جو گرودوارہ میں قلمی محفوظ ہے، اس کے پجاری صاحب نے خاص طور سے ظفرنامہ کے کچھ ابتدائی اشعار اس سے پڑھ کر سنائے جن میں حمد خداوندی بڑے والہانہ انداز میں بیان کی گئی تھی تین اشعار یہ ہیں،

منم کشتہ ام کوہیان بت پرست — کہ آں بت پرستند و من بت شکست
ببیں قدرت نیک یزدان پاک — کہ از یک جدہ یک رساند ہلاک
کہ پیمان شکن بیدریغ آمدند — بشمشیر وتبر و تفنگ آمدند

تقریباً ۴۲ سال کی عمر میں ۱۷۰۸ء میں ناندیڑ میں ۲۷ سال تک سرگرمی جاری رکھنے کے بعد گرو گوبند سنگھ صاحب نے وفات پائی، لاش جلانے کے بعد جہاں راکھی رکھی گئی وہیں پر رتچل نگر کا گرودوارہ ہے جسے گرودوارہ گرو گوبند سنگھ مہاراج کہا جاتا ہے۔

ہم نے یہ باتیں ''سوانح عمری گرو گوبند سنگھ مہاراج مصنفہ جناب مرزا احمد علی بیگ چغتائی صاحب سے لکھی ہیں'' موصوف نے اپنی اس کتاب کا ایک نسخہ ہم کو ہدیہ کے طور پر عنایت فرمایا تھا، اس گرودوارہ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب نے ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیان پانچ چھ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تعمیر کرایا، حکومت آصفیہ حیدرآباد کے وزیر اعظم مہاراجہ چندلال بہادر نے اس میں کافی حصہ لیا، یہ گرودوارہ تعمیراتی حسن وجمال کا اعلیٰ نمونہ ہے، گنبد سنہرا ہے اور سمادھی وغیرہ کی عمارت میں سونے کا کام ہے، در و دیوار پر مینا کاری اور پچکاری کا کام بہت ہی عمدہ ہے، اب بھی عقیدت مندوں کی طرف سے تعمیراتی نشان کے طور پر مینا کاری اور پچکاری کئے ہوئے پتھر وغیرہ نصب کئے جاتے ہیں۔

سنگ تراشی کا شعبہ

پتھروں کی تراش وخراش اور ان میں جڑاؤ اور مینا کاری کے لئے ایک مستقل شعبہ ہے ہم نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ قدیم زمانہ میں قیمتی پتھروں پر کس طرح پھول پتی اور مینا کاری کے کام ہوا کرتے تھے، ماہرین اور کاریگر دور دور سے آئے ہوئے رنگ برنگ کے قیمتی پتھروں کی تراش وخراش میں مصروف نظر آئے، ان لوگوں نے بڑی محنت سے ہمیں اپنے فن کے نازک کمالات دکھائے اور سمجھائے۔

گرودوارہ کے منتظم اور پجاری صاحبان نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا، ہار پیش کئے، خصوصی انتظام کے ساتھ ظفرنامہ سنایا اور گھوم گھوم کر ایک ایک تاریخی چیز دکھائی اور اس کی تاریخ بیان کی، ہم ان کے اخلاق سے کافی متأثر ہوئے، انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ سکھ فرقہ اسلام سے کس قدر قریب ہے اور گرونانک صاحب مسلمان فقیروں اور بزرگوں خاص طور سے حضرت بابا فرید شکر گنج سے کس قدر متأثر تھے اور ان کی تعلیمات کا گرونانک صاحب کی تعلیمات میں کتنا رنگ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرھویں عیسوی میں ہندستان میں گرونانک صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں قریب لانے کے لئے اپنی تعلیمات پھیلائیں، اور مسلمان صوفیاء اور بزرگوں نے ان کی ہمت افزائی کی کہ کچھ تو اس طرح دوسروں کو اسلام سے قربت ہوگی مگر بعد میں سیاست وسلطنت کے الجھاؤ نے اس تحریک کو بالکل اصلی رخ سے پھیر کر فوجی اور عسکری رنگ دیدیا، اس سے پہلے امرتسر اور لاہور میں ہم نے گرودواروں کو دیکھا، ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں اور اسی نتیجہ پر پہونچے۔

آب رسانی کا محکمہ

ناندیڑ کی دوسری مشہور چیز یہاں کا محکمۂ آب رسانی ہے، جو شہر کے جنوب مغرب میں دریائے گداوری کے کنارے ایک نہایت ہی پرفضا اور خوشگوار مقام پر واقع ہے، اب سے چند سال پہلے تک یہاں کا محکمۂ آب رسانی اپنی نوعیت میں یکتا تھا، مگر بعد میں اس جیسے بعض دیگر مقامات پر وائر ورکس بن گئے ہیں، اس میں بڑی حکمت عملی اور تعمیری خوبی کے ساتھ پانی تین مقامات پر صاف ہوتا ہے، ۱۴/اپریل کی شام کو جمعیۃ علماء ناندیڑ کی طرف سے یہیں پر مہمانوں کے اعزاز میں عصرانہ اور پریس کانفرنس کا انتظام کیا گیا تھا، اس عصرانہ میں بڑی سلیقہ مندی سے کام لیا گیا تھا، شہر کا صاف ستھرا طبقہ بھی کافی تعداد میں تھا، یہاں کی خوشگوار مجلس اور حسین تقریب بہت خوب رہی، مقامی وغیر مقامی اخبارات کے نمائندوں نے دینی تعلیمی کنونشن اور جمعیۃ العلماء کے موقف کے بارے میں سوالات کئے جن کے تسلی بخش جوابات دئے گئے، کئی صحافیوں اور علم دوست شخصیتوں سے تعارف ہوا، الغرض یہ تقریب ہر اعتبار سے بہت کامیاب رہی۔

دار العلوم کا جلسہ اور دینی تعلیمی کنونشن

یہاں کا دوروزہ جلسہ دونوعیّتوں پر مشتمل تھا، دارالعلوم ناندیڑ کا سالانہ اجلاس اور دینی تعلیمی کنونشن ۱۲/اپریل جمعہ کو عصر سے پہلے اور رات کو دارالعلوم کے سالانہ جلسہ کی ہماہمی رہی، جو دارالعلوم کے قریب ہی ایک شاندار جلسہ گاہ میں برپا رہی، اور دینی تعلیمی کنونشن کا کھلا اجلاس گاڑی محلّہ کی ایک درگاہ میں ہوا، اور مجلس مضامین کا اجلاس مقامی مدرسۂ نسواں کے ہال میں ہوا، دارالعلوم کے جلسہ کے مجلس استقبالیہ کے صدر الحاج حافظ محمد عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ تھے، اور دینی تعلیمی کنونشن کی مجلس استقبالیہ کے صدر جناب عیسیٰ خان صاحب ایڈوکیٹ تھے، مؤخر الذکر صاحب اپنی افتادطبع کی وجہ سے یا ہماری کم نگاہی کے باعث ہمارے لئے معمہ بنے رہے، دور دور سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے کام کے آدمی ہیں خدا کرے معاملہ ایسا ہی ہو۔

راقم الحروف نے ۱۳/اپریل کو بعد نماز فجر دارالعلوم کی مسجد میں تفسیر بیان کی جس میں واعظانہ انداز میں توحید، رسالت، مجازات وقیامت اور معروف ومنکر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی، اور شام کو کھلے اجلاس میں مدارس اسلامیہ کی ابتدائی تاریخ، عہد رسالت کی دینی درسگاہوں اور تعلیمی سرگرمیوں کو مختصر طور سے بیان کیا اور بتایا کہ مسلمانوں نے کس طرح دینی تعلیم کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا ایک جزء قرار دیکر اس کا انتظام مسجدوں، مدرسوں، مکانوں، دکانوں اور بازاروں میں کرتے کراتے تھے، مسلمانوں کا ذہن سراسر علمی وتعلیمی ہے اور ان کی زندگی میں معمولات دینی علوم وفنون داخل ہیں۔

اس دور میں دینی تعلیم کی اہمیت

دینی تعلیمی کنونشن کے سلسلہ میں نہایت مفید اور ضروری تجاویز زیر بحث آئیں، اور پاس کی گئیں، اس کے بورڈ کے لئے صدر اور سکریٹری اور ممبروں کا انتخاب ہوا، نیز

بعد میں دیگر ممبروں کے لئے گنجائش رکھی گئی، کھلے اجلاس میں اس موضوع پر کھل کر تقریریں ہوئیں اور مسلمانوں کو بتایا گیا کہ آج کے دور میں ہم اپنی دینی تعلیم کا انتظام کس طرح کر سکتے ہیں اور لادینی اسٹیٹ میں دین کی بقا وحفاظت کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پورے ملک میں مسلمانوں کو دین کی بنیادی تعلیم کا انتظام اپنے طور پر نہایت معقول کرنا چاہئے اور سرکاری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بچوں کو دینی چاہئے، اس کے لئے ہر بستی میں مسلمانوں کو صباحی، شبینہ اور جز وقتی مدرسے کھولنے چاہئیں تاکہ سرکاری اسکول میں جانے والے ان میں دین کی تعلیم حاصل کریں، یا پھر مسلمانوں کو ایسے اسکول کھولنے چاہئیں جن میں سرکاری نصاب کے ساتھ ساتھ بچے دینی تعلیم حاصل کریں اور ان میں دونوں قسم کی تعلیم کا بندوبست ہو اس دور میں اخلاق وانسانیت اور دین وایمان کی جس قدر ضرورت ہے اس کا اندازہ موجودہ دنیا کی بہیمی ترقیوں اور مادی الجھنوں کو دیکھ کر ہوسکتا ہے، آج انسانیت جس امن وسکون کے لئے بیچین ہے وہ مذہب کی آغوش میں ہی نصیب ہوسکتا ہے، پھر مسلمان قوم کی زندگی تو دین وایمان کے بغیر لاشئہ بے جان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اس کے لئے تو ہر حال میں دین کی تعلیم لازمی اور فرض ہے۔

(ماہنامہ ''البلاغ''، بمبئی، نومبر ۱۹۶۳ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک خالص دینی سفر (نومبر ۱۹۶۴ء)

آج کے ہندستان میں مسلمانوں میں مایوسی اور بے اطمینانی کے باوجود تبلیغی جماعت کا کام الحمدللہ بڑے سکون واطمینان سے ہورہا ہے اور یہ ہلکی پھلکی سیدھی سادی جماعت بغیر کسی دنیاوی قاعدہ قانون کے چل رہی ہے، دراصل دینی اور اصلاحی کاموں کے لئے کسی ایسے قاعدہ وقانون کی ضرورت نہیں ہے جو آج دنیا کی سیاسی جماعتوں میں رائج ہے، کیونکہ اصلاح وتحسین اس طرح کی قیود وحدود سے یکسر آزاد اور مستغنی ہے، اسی سادگی اور ہمہ گیری کی وجہ سے اس کام میں خیر وبرکت کا پہلو نمایاں ہے، اور اس میں روز بروز ترقی ہورہی ہے، اس کے اجتماعات ہوتے رہتے ہیں، ملک اور غیر ممالک میں اس کے وفود جاتے رہتے ہیں، اور سیدھی سادی باتیں کرتے ہیں، اسے نہ کسی سیاسی اور ملکی تحریک سے مطلب ہے نہ کسی کے ذاتی اور شخصی حالات سے غرض ہے اور نہ ہی کسی گروہی اور جماعتی عصبیت میں اس کا حصہ ہے بلکہ انسانیت و اسلام کی باتیں کرنا اور لوگوں کو اچھائی کی دعوت دینا اس کا کام ہے۔

اس کے اجتماعات ملک کے مختلف حصوں میں مختلف حیثیات واوقات میں ہوا کرتے ہیں، اور سالانہ اجتماع کے علاوہ بھی بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں، چنانچہ کچھ دنوں پہلے گجرات کے ایک مقام چھاپی میں بڑی کامیابی اور شانداری کے ساتھ یہ اجتماع ہوا تھا، اور اب گجرات ہی کے دوسرے مقام کاوی ضلع بھڑوچ میں ایک اجتماع ۲۱۔۲۲۔اور ۲۳ر نومبر کو ہوا جس میں ملک کے اطراف واکناف کے ہر طبقہ کے مسلمان آئے، اس میں شرکت کے لیے ہم لوگ بھی گئے تھے۔

۲۱؍نومبر کو مکہ مکرمہ سے علامہ الشیخ السید محمود طرازی مدنی اور دیگر تین عرب حضرات آئے، محترم الحاج احمد غریب صاحب سکریٹری انجمن خدام النبی بمبئی، ان کے بھائی محترم الحاج محمد صدیق الـمیـمنی صاحب اور راقم، ان تین آدمیوں کا قافلہ اتوار کو گیارہ بجے دن کی گاڑی سے روانہ ہوا، اسی دن صبح آٹھ بجے کی ٹرین سے شیخ علامہ محمود طرازی مدنی اور دیگر عرب بھی روانہ ہوئے، اور یہ طے ہوا کہ دونوں جماعتیں بڑودہ پہونچ کر وہیں سے کاوی کے لئے ایک ساتھ روانہ ہوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بڑودہ سے ہم آٹھ نو آدمیوں کا قافلہ چالیس پینتالیس میل کار کے ذریعہ طے کر کے رات دس بجے کاوی اجتماع گاہ میں پہونچا، بمبئی سے بڑودہ تک مہاراشٹر اور گجرات کے جو علاقے گذرے ان میں اسلام کی کئی شاندار ماضی کی یادگاریں ہیں۔ جو گزرتے ہوئے تازہ ہورہی تھیں۔

بمبئی سے نکل کر سب سے پہلا تاریخی مقام سنجان پڑا، جسے ہمارے عرب سیاح اور جغرافیہ نویس سندان کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ قدیم ساحلی شہر اور بین الاقوامی تجارتی مرکز تھا، عرب کے تاجر ہندوستان اور چین آتے جاتے یہاں قیام کرتے اور کئی قسم کے سامان تجارت خریدتے، مرچ، بانس، ساگوان، سوتی کپڑے، چاول، ناریل، شہد اور جوتے وغیرہ اس شہر سے خرید کر عرب ممالک میں لے جاتے تھے، خلیفہ معتصم کے زمانہ میں یہاں پر فضل بن ماہان نامی ایک عرب نے حکومت قائم کی جس میں تین حکمراں ہوئے ہیں، اگرچہ عرب حکومت مہاراجگان ولبھی رائے کے ماتحت تھی مگر اسے اندرونی آزادی حاصل تھی خلیفہ بغداد کے نام کا خطبہ جاری تھا، عالم اسلام سے تعلقات تھے، اور یہاں کی جوامع ومساجد میں باقاعدہ نماز واذان اور جماعت ہوتی تھی، مسلمانوں کے اسلامی قوانین کے لئے قاضی ہوا کرتے تھے جو یہاں کی زبان میں برھمن کے وزن پر ہنرمن (ہنرمند) کہے جاتے تھے، سنجان کی اس

عرب حکومت نے ساحلی مقامات سے بحری ڈاکوؤں کا صفایا کیا اور پالی (غالباً کاٹھیاواڑ) تک کا علاقہ فتح کر کے اسے اپنی حکومت میں شامل کرلیا مگر باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے یہ حکومت تین حکمرانوں کے بعد ختم ہوگئی، دولت ماہانیہ سنجان پر راقم کا ایک مقالہ کئی ماہ ہوئے مجلّہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکا ہے، یہ مقام پارسیوں اور مجوسیوں کا ابھی مقدس مقام مانا جاتا ہے اور یہاں پران کے بھی بہت سے آثار ہیں۔

آگے چل کر نوساری بھی بہت ہی تاریخی اور مرکزی مقام آیا جہاں اکبر کے زمانہ میں پارسیوں کی بہت زیادہ آبادی تھی اور اس قوم نے گجرات میں نوساری کو اپنا مرکزی مقام قرار دیا، مولانا محمد علی جوہر کی عملی زندگی کا ظہور بھی یہیں سے ہوا تھا، جب کہ آپ نے ولایت سے آنے کے بعد مہاراجہ بڑودہ کی طرف سے یہاں کی سرکاری ملازمت اختیار کی، نوساری اگرچہ بڑودہ سے کافی دور ہے مگر ۱۹۴۸ء تک گائیکوار ریاست یعنی بڑودہ کی ایک تحصیل تھا، اس کے بعد ضلع سورت میں آ گیا اور اب اسے مستقل ضلع بنانے کی تحریک سننے میں آرہی ہے۔

سورت گجرات کا خوبصورت ترین شہر اور مرکزی مقام ہے، اس کے قریب راندیر اسلامی آثار وعلائم کا گہوارہ ہے، یہاں پر چوتھی صدی ہجری کی ایک مسجد یادگار ہے اور اپنی حسین وجمیل مسجدوں کی وجہ سے اسے ''بلد المساجد'' بجا طور کہا جاسکتا ہے، خود شہر سورت اسلامی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے۔

نوساری اور سورت کے درمیان ڈابھیل کی بستی ہے جسے ایک زمانہ میں بڑی علمی مرکزیت حاصل تھی، عالم اسلام میں اچھی خاصی علمی ودینی شہرت رکھتا تھا، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے فضلائے دہر اس میں کتاب وسنت کا درس دیتے تھے او عرب وعجم کے طالبان علم وفیض یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے، بمبئی آنے سے پہلے راقم نے بھی ایک سال یہاں تاریخ وادب عربی اور دوسرے دینی علوم کی

مدرسی کی ہے اور اس کی برکت سے اسے علاقۂ گجرات سے ایک علمی و دینی نسبت قائم ہوگئی ہے، یہاں کے متعدد مقامات پر راقم کی نسبت ظاہر کرنے والے اہل علم موجود ہیں جنھوں نے اس زمانہ میں تلمذ کیا۔

سورت سے آگے ضلع بھڑوچ میں انکلیشور اب بہت ہی اہمیت حاصل کرلیا ہے اور اسی کے اطراف میں پٹرول نکلنے سے اسے بین الاقوامیت حاصل ہوگئی ہے، ٹرین سے کارخانوں کے کھمبے اور گیس وغیرہ کے اثرات ونشانات نظر آتے ہیں اتر کر دیکھنے کا موقع نہیں تھا، ویسے جی بہت چاہتا تھا کہ اپنے ملک کی اس چیز کو چل کر دیکھنا چاہئے۔

بھڑوچ گجرات کا قدیم ترین اور مشہور ترین ساحلی شہر ہے اس کے ساتھ ماضی کی عظیم اسلامی یادگاریں وابستہ ہیں، واپسی پر شہر کے اندر سے گذر ہوا، یہ زندگی میں دوسری بار بھڑوچ کے اندر داخلہ تھا، مگر افسوس کہ دونوں بار عبوری اور سطحی تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی طائفی رضی اللہ عنہ نے بحرین اور عمان کی گورنری کے زمانہ میں ۱۵ھ میں اپنے بھائی حضرت حکم بن العاص ثقفی طائفی رضی اللہ عنہ کو متطوعین (رضا کار) اور فدائیوں کی ایک جماعت کے ساتھ تھانہ اور بھڑوچ روانہ کیا جہاں انھوں نے مقامی راجہ سے مقابلہ کرکے فتح پائی، ہمارے علم میں اسلام اور ہندستان کے تعلقات میں تھانہ اور بھڑوچ کا یہ تعلق بہت سے قدیم اور سب سے اہم ہے، عرب کے تاجر بھڑوچ سے تجارت رکھتے تھے اور یہاں کی چیزیں عرب ممالک میں لیجا کر فروخت کرتے تھے، ان عرب تاجروں میں بھڑوچ کے نیزے بہت مشہور تھے، اور کھمبائیت کے بنے ہوئے آواز دینے والے جوتے بھی بھڑوچ کی منڈی سے عرب ممالک میں جاتے تھے، یہاں کی نیل بھی بہت مشہور تھی، اس شہر سے عدن اور یمن کے علماء، عباد، زہاد اور ارباب علم وفضل

کے تعلقات بہت زیادہ تھے، شاہان گجرات کے زمانہ میں بھڑوچ بہت ہی علمی اور دینی شہر تھا، خاص طور سے رفاعی اور عیدروسی خاندان نے یہاں پرآباد ہوکر جنوبی ہند کے سواحل میں بڑا کام کیا، اسی خاندان کے ایک زبردست عالم شیخ عبدالقادر عیدروسی کی کتاب ''النورالسافر'' دسویں صدی ہجری کے علماء ومشائخ کی تاریخ ہے، یہ کتاب بغداد میں چھپ چکی ہے اس میں عدن، تریم، یمن، صنعاء، لحج اور دیگر عرب علاقوں کے علماء اوران کے ہندستان میں آنے جانے کا بیان ہے، بھڑوچ میں بہت سے قدیم ترین تاریخی مقامات ومقابراور مساجد ہیں، ان میں سے بعض میں بقول محترم سید عظیم الدین منادی ایڈیٹر مسلم گجرات سورت ایسے مقصورے بھی بنے ہوئے ہیں جن کی ابتداء حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے اقدام قتل کے بعد ہوئی تھی اوراس کے بعد خلفائے بنوامیہ وبنوعباسیہ ان ہی مقصوروں سے آکر پہلی صف میں شریک ہوجاتے تھے، اس شہر بھڑوچ کے ایک بہت بڑے ولی اور باخدا بزرگ حضرت سید صبغۃ اللہ بھڑوچی ہیں، جن کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی اور جنۃ البقیع میں ان کا مزار ہے۔

اسی بھڑوچ کے نواح میں بھاڑبھوت ایک مقام ہے جسے عرب مورخین باربد لکھتے ہیں، یہ وہ تاریخی مقام ہے جہاں ۱۶۰ھ میں عبدالملک بن شہاب مسمعی کی قیادت میں جنگ ہوئی اور مسلمان مجاہدین مظفر ومنصور ہوئے مگر واپسی پر اسلامی فوج ایک مقام پر ٹھہری اوراس میں ایک مرض ''حمامۃ القر'' نامی پیدا ہوگیا اور منہ میں زہریلی پھنسیاں نکلنے لگیں، جس سے ہزاروں مجاہدین واصل بحق ہوگئے ان ہی میں حضرت امام ربیع بن صبیح بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، جو تابعین تبع میں سے زبردست محدث وفقیہ ہیں اور ساتھ ہی مجاہد وزاہد بھی ہین، حضرت ربیع بن صبیح بصری پر راقم کا ایک تحقیقی مقالہ کئی سال ہوئے مجلّہ معارف اعظم گڈہ میں شائع ہوچکا ہے۔

بھڑوچ کے علاقہ میں اتر جانب دریائے کاوی کے کنارے گندھارا ہے اسے اب بھی گندھارا بندر کہتے ہیں، یہ مقام بھی اسلامی تاریخ میں بہت اہم ہے اور یہاں صدر اسلام میں مسلمان فاتحوں کے قدم آچکے ہیں، بلاذری نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ میں ہشام بن عمرو ثعلبی نے سندھ کی گورنری سنبھالی، اور انھوں نے عمرو بن جمل کو فوج دیکر بھاڑ بھوت (باربد) روانہ کیا اور جنگی کشتیوں کے ذریعہ وہ گندھارا (قندھار) آئے اور اسے فتح کر کے مسجد کی بنیاد ڈالی، اس زمانہ میں یہاں بڑی شادابی اور پیداوار میں زیادتی ہوئی جسے اس علاقہ کے باشندوں نے مسلمان فاتحوں کی برکت سمجھا اور بہت زیادہ خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔

شاہان گجرات کے زمانہ میں یہ بندرگاہ عرب، مکہ، مدینہ، عدن، اور یمن آنے جانے کے لئے استعمال ہوتی تھی، خاص طور سے شاہان گجرات نے بڑی اہمیت اور وسعت دی تھی۔

بڑودہ ہمارے ریل کے سفر کی آخری منزل تھا، یہاں پہلی مرتبہ آنا ہوا تھا شام کو پانچ بجے کے بعد یہاں پہونچے اور عشاء سے پہلے کاوی کے لئے موٹر سے روانہ ہوئے ''گجرات'' میں یہ شہر بڑی عظمت واہمیت کا مالک ہے، اس کی صاف ستھری اور وسیع سڑکیں، قرینے کے مکانات، شہر میں جگہ جگہ فصیلیں اور بڑے بڑے دروازے عظمت کے شاہد ہیں، یہ مہاراجگان گائیگواڑ کا پایۂ تخت تھا اسلئے انھوں نے اسے خوب خوب سجایا ہے شہر میں جگہ جگہ حسین اور بڑے باغات، پارک، تالاب، تفریح گاہیں ہیں جو ان اطراف کے شہروں کے نصیب میں نہیں ہیں، مگر بڑودہ اس معاملہ میں بڑا خوش نصیب ہے، بڑے بڑے کالج، تعلیمی ادارے، عظیم الشان عمارتیں، گنبدوں اور برجوں کے محلات یہاں کے حکمرانوں کے ذوق حسین کا پتہ دیتے

ہیں، افسوس کہ اس تاریخی شہر کو دیکھنا تو درکنار پوری طرح اس سے گذرنا بھی نصیب نہیں ہوا، ہمارے محترم منادی صاحب فرماتے ہی رہے کہ اگر یہاں قیام کرنا ہوتا تو میں تم کو فلاں فلاں تاریخی چیزیں دکھاتا اور فلاں فلاں حضرات سے ملاقات کراتا، یہاں ہمارے محترم حضرت مولانا شمس الدین صاحب کا مکان ہے جو کئی سال ہوئے وفات پاگئے، اس خاندان کا نسبی تعلق شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہے۔

ہمارے میزبان محترم محمد یونس صاحب نے بڑے اخلاص ومحبت اور خدمت کا ثبوت دیا، وہ محترم الحاج احمد غریب صاحب کے بہت ہی قریبی حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور غالباً دور نزدیک سے ان کے رشتہ دار بھی ہوتے ہیں، بڑودہ اسٹیشن سے لیکر کاوی پہونچنے تک کہنا چاہئے کہ انھوں نے سب کچھ ہمارے لئے کیا، شیخ محمود طرازی مدنی اور ان کے عرب رفقاء کے ساتھ ہم چار آدمیوں کے آرام کرنے کھانے پینے اور سواری کے تمام کام انھوں نے انجام دئے، بمبئی کے حاجی زکریا صاحب دھوراجی والے عرب کی جماعت کے ساتھ بڑودہ تک گئے اور ہمارے ساتھ واپس آئے، یہ صاحب خدمت اور ماموں قسم کے بزرگ ہیں، ایسے بے نفس اور ہر چھوٹے بڑے کی خدمت کرنے والے لوگ اب کہاں ملتے ہیں؟

آج کل کاوی دریائے کاوی کے پاس ایک پرانی بستی ہے، کتابوں میں اسے گاوی لکھا گیا ہے، یہ بھی قدیم زمانہ میں بہت بڑی بندرگاہ تھی، آئین اکبری میں گندھارا اور گاوی دونوں کو بھڑوچ کے ساتھ کی بندرگاہ بتایا گیا ہے، یہاں سے براہ دریا کھمبائیت چند میل رہ جاتا ہے، مشہور سیاح ابن بطوطہ کھمبائت سے چل کر پہلے گاوی اور پھر وہاں سے گندھار آیا، اس کا بیان ہے کہ یہ دونوں ساحلی شہر راجہ جالینی کے قبضہ میں ہیں، مگر وہ مسلمان بادشاہ کے ماتحت ہے، یہاں مسلمانوں کی آبادی ہے جن

میں بہت سے راجہ کے درباری اورسرکاری افسر ہیں، جن میں ایک راجہ بہرہ تھا، اوردوسرا ناخدا ابراہیم تھا، ابن بطوطہ گندھار میں ناخدا ابراہیم کے جہازوں میں سوار ہوا جن کے نام جاگیر اور منوت تھے، ان جہازوں میں سمندری ڈاکوؤں سے حفاظت کے لئے پچاس تیرانداز اور پچاس حبشی موجود تھے، افسوس کہ کھمبائت، کاوی اور گندھار میں سے کسی کو دیکھنے کا موقع نہ مل سکا اوران کی تاریخ لکھنے والا ان کے قریب پہونچ کران میں داخل نہ ہوسکا۔

ہم آٹھ نو آدمی دوموٹروں کے ذریعہ کاوی کے تبلیغی اجتماع میں رات کے دس بجے پہونچے، معلوم نہیں کس وجہ سے بھڑوچ اور بڑودہ دونوں مرکزی شہر ونسے چالیس پچاس میل دور یہ اجتماع رکھا گیا، اجتماع بستی کے باہر ایک کھلے میدان میں تھا، جہاں نیکوں اورنیکی کا ایک شہر تین دنوں کے لئے آباد ہوگیا تھا، رات کے وقت اس پچاسوں ہزار کے مجمع پر نظر پڑتے ہی منیٰ اور عرفات کے رات دن یاد آگئے کھانے پینے کی سستی دکانیں، دینی کتابوں کے اسٹال اور ضروریات کی دوسری چیزیں قطار اندر قطار تھیں۔

جلسہ گاہ جسے مسجد اور قیام گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا بہت بڑی تھی، اس کی لمبائی تقریباً دوسوقدم اور چوڑائی تقریباً ڈیڑھ سوقدم تھی، اتنا بڑا شامیانہ جب نمازاوروعظ کے وقت پر ہوجاتا تھا تو سکون ووقار اور سکون واطمینان کا بڑا پراثر مظاہرہ کرتا تھا، تین دن تک یہ اجتماع دین وایمان کی خوشگوار بستی بنا ہوا تھا، سنا کہ ڈیڑھ ہزار آدمی ایک سو سے زائد جماعتوں میں ہندستان اور بیرون ہند نکلے ہیں، یہاں نہ پولیس کی ضرورت تھی نہ انتظام کاروں کی بھیڑ بھاڑ تھی نہ کسی چیز کے گم ہونے کا خطرہ تھا اور نہ جیب کترے اوراچکے تھے۔

ہمارے نزدیک دین وایمان کے نام پر اس طرح کا پاکیزہ اور صاف ستھرا

اتنا عظیم الشان مجمع ہی کامیابی کی بات ہے، چہ جائیکہ اس کے ایمانی اثرات کھلے طور پر نظر آتے ہیں اور قانون قدرت کے مطابق انسانوں کو نفع دینے والی یہ بات زمین میں پھیل کر اور اپنے نیک اثرات پیدا کر رہی ہے۔

(ماہنامہ ''البلاغ'' جنوری ۱۹۶۵ء)

☆☆☆☆☆☆☆

مبارکپور سے جونپور تک

ایک علمی اور دینی سفر (مئی ۱۹۶۵ء)

مشرقی یو،پی میں قصبات و دیہات کے عربی مدارس میں سالانہ امتحانات اور جلسے بڑی شان وشوکت سے ہوا کرتے ہیں، مہینوں پہلے سے تیاریاں ہوتی تھی، عوام وخواص اور بوڑھے بچے سب ہی ان سالانہ جلسوں اور علماء کے وعظوں کا بڑا اہتمام کرتے تھے، عام طور سے جاڑے کی لمبی راتوں میں شاندار شامیانوں اور پنڈالوں میں یہ جلسے منعقد ہوا کرتے تھے،اور برسوں ان کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ رہا کرتی تھی، عام مسلمان دینی امور ومعاملات اور مسائل سے واقف ہوتے تھے اور بڑے ذوق وشوق سے اپنے بچوں کو دینی تعلیم دیتے دلاتے تھے،اب بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی حد تک جاری اور یہ روایت زندہ ہے،اگرچہ لوگوں میں دینی ذوق کی کمی کی وجہ سے اب وہ باتیں نہیں ہیں پھر بھی یہ جلسے غنیمت ہیں،ان سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دو تین دن کے شب وروز سال بھر تک دینی یادگار کے طور پر زندہ رہ کر عوام میں دینی احساس کو باقی رکھتے ہیں،اس اعتبار سے یہ جلسے نہایت ضروری اور بہت ہی مفید ہیں اور ان کو بہر حال باقی رکھنا چاہیے۔

بمبئی میں رہنے کی وجہ سے وطن اور اطراف کے مدارس اسلامیہ کے ان سالانہ جلسوں سے دوری ہوگئی اور اپنے طالب علمی کے زمانہ کی یہ خالص دینی وعلمی محفلیں بڑی شدت سے یاد آتی تھیں، خیال پیدا ہوا کہ واپس وطن جانے کے بعد جہاں موقعہ ہوا ایسے جلسوں میں جانا چاہیے،اس سے اپنے ذوق کی تازگی اور پرانی علمی ودینی رونق

کی تازگی اپنے حق میں مفید ہوگی، یہ داعیہ دوایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے، چنانچہ گذشتہ سال اس قسم کے دوایک جلسوں میں شرکت کا موقعہ ملا اوراب کے بار بھی دوجلسوں میں جانا نصیب ہوا۔

۳رمئی سے ۱۲رجون تک زمانہ مبارکپور میں گذرا،اس مدت میں ۲۷رمئی پنجشنبہ کوقصبہ گھوسی کے ایک مدرسہ کے سالانہ پہلے اجلاس میں شرکت ہوئی، اور ۲۸رمئی جمعہ کوشہر جونپور کے ایک نسواں اسکول کے سالانہ اجلاس میں حاضری ہوئی، یہ دونوں علمی ودینی اورتاریخی اسفار مولانا عبدالباری صاحب قاسمی ناظم اعلیٰ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور کی معیت میں بلکہ قیادت میں ہوئے، نیز بعض اور دوسرے علمی اسفار مولانا کی معیت وقیادت میں ہوئے، جی چاہتا ہے کہ ناظرین کرام کی خدمت میں اس علمی ودینی سفرکا سفرنامہ پیش کیا جائے اوران دونوں مسافروں نے اپنے سفر میں جوکچھ پایا اوردیکھا ہے اس کی کہانی قارئین کی بزم میں سنائی جائے، یہ کہانی افادیت سے خالی نہیں ہے اورارباب ذوق کے لئے اس میں بڑی دلچسپی ہے۔

دائرۂ ثقافت اسلامیہ کی مجلس مشاورت

محدث العصر حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب الاعظمی زیدمجدہم، جناب مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی ناظم جامعہ عربیہ مفتاح العلوم مئواور میں، ہم تینوں بہت دنوں سے ایک ایسے ادارہ کے قیام کوسوچ رہے تھے جوقدماء کی خالص علمی ودینی تصنیفات کوزمانہ کی ضرورت کے مطابق شائع کرے اورصدراسلام کے علماء ومحدثین اورفقہاء رحمہم اللہ کی اہم غیرمطبوعہ کتاموں کوتعلیق وتحشیہ کے ساتھ آج کی علمی وتحقیقی اوردینی دنیا کے سامنے پیش کرے، ساتھ ہی موجودہ جدید تقاضوں کی روشنی میں اسلام کے ان فقہی اورجزئی مسائل کے بارے میں تحقیق کرے جن کے حل کی شدید ضرورت ہے،اس سلسلہ میں ایک وسیع پروگرام کے ماتحت نہ صرف ہند و

پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے مستند علمائے دین سے استصواب کر کے ایسے مسائل کی تحقیق و تنقیح کرے نیز دینی و علمی ضرورت کے ماتحت تالیف و ترجمہ اور تصنیف کا کام بھی اس ادارہ سے ہو اور اس کے ان تمام علمی و دینی کاموں کو حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی کی سرپرستی اور نگرانی حاصل ہو، اس سلسلہ میں ہم تینوں کی ایک غیر رسمی نشست مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں ۱۵ ر مئی کو ہو چکی تھی ، دوسری کے لئے ۲۷ یا ۲۸ ر مئی مقرر کی گئی ، اسی دوران میں مولانا عبدالباری کی زیر صدارت قصبہ گھوسی کے ایک عربی مدرسہ کے سالانہ جلسہ کی تاریخ ۲۷/۲۸ ر مئی مقرر ہوئی نیز ۲۸ ر مئی ہی کو شہر جونپور میں ایک ایسے ہی جلسہ کی تاریخ مقرر ہوئی ، چونکہ مجھے دائرۂ ثقافت اسلامیہ کی دوسری مٹنگ کے لئے مئو جانا ہی تھا اس لئے سوچا کہ گھوسی کے پہلے اجلاس میں شرکت بھی ہو جائے تو اچھا ہے، نیز گھوسی کے دو حضرات جو اس سال ہوائی جہاز کے ذریعہ حج و زیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے حاجی انصار احمد اور حاجی ریاض احمد ان سے ملاقات ہو جائے گی۔

دو پہر کو جب ہم مئو پہونچے تو معلوم ہوا کہ مولانا حبیب الرحمان صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی برسوں کا تقاضہ پورا کرنے کے لئے صبح ہی ادری تشریف لے گئے ہیں اس لئے شدید گرمی اور دھوپ میں ہم دونوں ادری ایک بجے دن میں پہونچے، اور دائرہ کی دوسری مٹنگ مدرسہ فیض العلوم ادری میں ۳ ر بجے دن میں ہوئی جس میں ہم چاروں کے علاوہ مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی، مولانا محمد صاحب شمیم ادروی، مولانا رشید احمد صاحب مفتاحی اور دوسرے مقامی علماء شریک ہوئے یہ دوسری نشست بہت کامیاب رہی ، دائرہ کے قیام کی صورت کتابوں کی اشاعت اور دوسرے امور و معاملات پر کھل کر بحث ہوئی، اور بعض ابتدائی کام شروع کرنے کی تجویز ہوئی ، یہاں کے ہمارے دو بے تکلف ساتھیوں (مولانا اسیر، مولانا محمد

صاحبان) نے حسب دستور اپنی سنت قدیمہ متعارفہ کے مطابق ہمارے ساتھ خود بھی تکلیف اٹھائی اور پانچ بجے شام کوادری سے نکل کر ۸ر بجے رات کو ہمارے ساتھ گھوسی پہونچے اور ہم سب نے وہاں جلسہ میں شرکت کی۔

شمال مشرق میں گھوسی ضلع اعظم گڈھ کی ایک تحصیل ہے، یہ چند مواضعات پر مشتمل نہایت ہی قدیم قصبہ ہے یہاں پر ایک کوٹ تھی جسے راجہ بکرماجیت کے زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے، اب اس کا اکثر حصہ کھیتوں اور مکانوں میں تبدیل ہوگیا ہے، ابوالفضل نے آئین اکبری میں گھوسی کا تذکرہ کیا ہے، پہلے یہ قصبہ ضلع غازی پور میں واقع تھا مگر جب اعظم گڈھ ۱۹۰۱ء میں چکلہ سے ضلع بنایا گیا تو گھوسی اور چریا کوٹ کو غازی پور سے الگ کر کے اسی میں شامل کر دیا گیا، یہ قصبہ شاہان شرقیہ شہر جونپور کے زمانہ میں بڑا مردم خیز تھا، بعد میں بھی یہاں باکمال علماء وفضلاء پیدا ہوئے۔

مولانا عطاء اللہ گھوسوی جونپوری

شیخ عطاء اللہ بن حبیب اللہ عثمانی اصفہانی گھوسوی جونپوری، اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء میں سے ہیں، ان کی ولادت گھوسی میں ہوئی، ملا محمود جونپوری اور دوسرے علماء سے تحصیل علم کر کے شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جونپوری سے مشیخت وطریقت حاصل کی، فقہ، اصول اور علم کلام میں مشہور تھے بڑے دیندار متقی اور خدا ترس بزرگ تھے ۵ر ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ میں لکھنو میں فوت ہوئے۔

شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی

گھوسی کے اعاظم رجال میں بارہویں صدی ہجری کے ایک عالم وفاضل شیخ غلام نقشبند گھوسوی لکھنوی متوفی ۱۱۲۶ھ میں ان کے دادا شیخ حبیب اللہ گھوسی کے قاضی تھے، ان کا شجرۂ نسب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے ان کے آباء واجداد اصفہان سے ہندستان آئے تھے، ان کی پیدائش ذوالحجہ ۱۰۵۱ھ میں گھوسی میں

ہوئی اپنے وقت میں نحو، لغت، اشعار اور ایام عرب کے زبردست عالم تھے ان کے زمانہ میں ان علوم میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا، حضرت شاہ پیر محمد لکھنوی سے آخر میں پڑھا، اکیس سال کی عمر میں فارغ ہو کر اپنے استاذ اور مرشد حضرت شیخ محمد کے سجادہ نشیں ہوئے، ان کے بعد ان کے لڑکوں میں شیخ احمد اور شیخ قطب الہدیٰ بھی ان کے جانشیں ہوئے، شاہ عالم بن عالم گیر نے لکھنؤ میں ان کی زیارت کی اور غایت احترام کے ساتھ پیش آیا، حضرت غلام نقشبند کی تصنیفات میں ربع قرآن کی ایک تفسیر ''الانوار'' کے نام سے ہے نیز انھوں نے سورۂ اعراف، سورۂ مریم، سورۂ طٰہٰ، سورۂ محمد، سورۂ یوسف، سورۂ الرحمان، سورۂ نباء، سورۂ کوثر، سورۂ اخلاص کی تفسیریں لکھیں، ان کی تصنیفات میں سے فرقان الانوار، الاشعۃ العرشیہ، شرح قصیدۂ خزرجیہ وغیرہ ہیں، عربی کے زبردست شاعر تھے، نعت میں ان کے عربی قصائد ہیں، آخری رجب یا جمادی الاولی ۱۱۲۶ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے اور دریائے گومتی کے کنارے اپنے پیر و مرشد کے پہلو میں ٹیلہ پیر محمد شاہ میں دفن کیے گئے۔

قاضی حبیب اللہ گھوسوی

قاضی حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الاسلام نقشبند کے والد ہیں، آپ بھی زبردست فقیہ و عالم تھے، فقہ، اصول، اور عربیت میں بڑا مقام حاصل تھا، پوری زندگی گھوسی کے قاضی رہے، طریقت و مشیخت میں حضرت شیخ علی بن قوام سرائمیری جونپوری سے نسبت رکھتے تھے اور ان سے مرید تھے ان حضرات کے علاوہ بھی یہاں پر آخری دور میں اچھے اچھے علماء و اساتذہ گذرے ہیں، ملک پورہ کا مدرسہ صدیوں تک اطراف و جوانب میں علم کی روشنی پھیلاتا رہا اور یہاں سے اچھے اچھے علماء و مدرسین نکلے۔

۲۷ مئی کی رات میں یہاں ایک مدرسہ کا پہلا اجلاس مولانا عبدالباری

صاحب کی صدارت میں ہوا، آج کے جلسہ کے تنہا مقرر مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہاں پوری تھے، ہردوحضرات نے مجھ سے جلسہ کے افتتاح کے لئے فرمایا، میں نے تقریباً پندرہ بیس منٹ افتتاحی تقریر کی جس کی گھوسی کی ماضی کی علمی ودینی عظمت اور علم دین کی ضرورت پر اظہار خیال کیا، ویسے گھوسی دوایک باراس سے پہلے بھی جانا ہوا تھا مگر اب کے حاضری ایک خاص نقطۂ نظر سے تھی، اس لئے میں نے حاضرین کو اسی کے مطابق خطاب کیا۔

صبح کو یہاں کے علماء میں مولانا قاری منظور احمد صاحب، مولانا اختر صاحب اور مولانا فخرالدین صاحب سے ملاقاتیں رہیں، ہمارے میزبان حاجی محمد مرتضیٰ صاحب اور ان کے لڑکے حاجی انصار احمد اور حاجی ریاض احمد بڑے اخلاص و محبت سے پیش آئے، محترمی مولانا وقار احمد ملک پورہ سے تشریف لائے اور ہم ان کے خلوص واصرار پر ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔

ایک علمی ملاقات

مولانا وقار احمد صاحب اپنی ذات سے بقیۃ السلف ہیں، ان کا خاندان صدیوں سے علم وفضل کا مرکز رہا ہے جس نے ہر زمانہ میں تعلیم وتعلم کا مشغلہ رکھا، آپ کے جداعلیٰ ہندوستان کے پہلے انگریز گورنر کے میر منشی یا سکریٹری تھے، انھوں نے فارسی میں ایک روزنامچہ لکھا ہے جو ابتک مولانا وقار احمد صاحب کے یہاں موجود ہے اس میں ہندوستان کی تاریخ کے عجیب وغریب واقعات ہیں، ہندوستان کی موجودہ ملکی وقومی تاریخ میں اس سے بڑی مدد لی جاسکتی ہے، آپ کے یہاں ایک قدیم آبائی کتب خانہ بھی ہے جس میں قلمی نوادرات ہیں، آپ نے بتایا کہ ان کے خاندان کے کسی بزرگ نے مبارکپور اور مئو کی تاریخ اور گذشتہ صدی میں یہاں پر جو فسادات ہوئے ہیں ان کا حال جمع کیا ہے اس کتاب سے مبارکپور کی اسلامی تاریخ پر اچھی خاصی روشنی

پڑسکتی ہے مولانا نے خوداس کودوسری ملاقات میں مطالعہ کے لئے عنایت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

میں نے اس مختصرسی ملاقات میں ان کے قیمتی کتب خانہ کوایک نظر دیکھااورامام شعرانی کی کتاب ''المیز ان'' کاایک نہایت قیمتی قلمی نسخہ ہاتھ لگا، میں نے اس ملاقات میں دوسری مرتبہ آ کرتفصیل سے کتب خانہ کی سیر کاوعدہ لے لیا، ہم طالب علموں کے لئے اس قسم کے موقعے غنیمت ہوا کرتے ہیں اور ہماری سیروتفریح کا یہی ماحصل ہوتے ہیں اس مختصر سے وقت میں مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوا، پھر یہاں سے ۲۸رمئی کودس بجے روانہ ہوکرکوپا گنج پہونچے، جہاں جمعہ کی نماز پڑھتے ہی مئو کے لئے روانہ ہوئے مئوسے تین بجے براہ اوڑیہار جونپور کے لئے روانہ ہوئے، یہ عجیب اتفاق ہواکہ اب سے تقریباً سترہ اٹھارہ سال پہلے جب جونپور جانا پہلی بارہوا تھا تواسی راستہ سے کراکت ہوتے ہوئے گیا تھااوراب کے دوبارہ جب باقاعدہ جونپور جانا ہواتو پھر اسی راستہ سے جانا ہوا۔

باقاعدہ اس لئے کہ بے قاعدہ جونپور سے متعدد بار گذر ہوامگرکبھی تفصیل سے شہر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہواتھا، حالانکہ بچپن ہی سے شیراز ہند کی عظمت دل پر ثبت تھی، ادھر چند سالوں سے بمبئی آتے جاتے الہ آباد سے بذریعہ بس اعظم گڈھ جانا ہوتا ہے مگرشہر سے بس گذرنا ہی ہوتا ہے فخر مشرق حضرت شفیق جونپوری مرحوم نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا تھا کہ آپ بمبئی آتے جاتے جونپور سے گذرتے ہیں مگر کبھی مجھ سے نہیں ملتے ،میری زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں اسلئے اب مل لیجئے، مرحوم کے اس خط کے بعد وطن سے جونپور کے لئے مستقل سفر کرنے کا ارادہ تھا مگرافسوس کہ اس کے چند ماہ بعد ہی مرحوم کا انتقال ہوگیا، اللھم اغفرله وارحمه۔

جونپور کی ایک یادگار رات

نسواں پرئمری اسکول جونپور کے پہلے سالانہ جلسہ میں شرکت کے بہانہ اب کے جونپور کی حاضری ہوئی تھی، اسکول کے سکریٹری جناب محمد یوسف صاحب انصاری کی دعوت پر مولانا عبدالباری صاحب قاسمی کے ہمراہ یہ سفر ہوا، اوڑیہار سے شہر غازی پور کے دو صاحب ساتھ ہوگئے جو اسی جلسہ میں مقرر کی حیثیت سے جا رہے تھے، ہم تقریباً آٹھ بجے رات میں جونپور پہونچے اور دس بجے جلسہ میں حاضری ہوئی، جلسہ اٹالہ مسجد میں رکھا گیا تھا جو شاہان شرقیہ کی ایمانی قوت اوران کے تعمیری ذوق کا بھرپور نمونہ ہے اس مسجد کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا مگر آج اس میں داخلہ اوراس کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، میں بہت دیر تک تنہا مسجد میں گھوم گھوم کراس کے بام ودراور محراب ومنبر میں اسلامی عظمت وشان اور شاہان شرقیہ کے جاہ وجلال کے آثار وعلائم چشم عبرت اور دیدۂ بصیرت سے دیکھتا رہا اس وقت میں ماضی کی پرشکوہ اور حسین تاریخ کا تیزی سے مطالعہ کررہا تھا اور بانیان جلسہ اپنے انتظام واہتمام میں مصروف تھے۔

شاہان شرقیہ کے دارالسلطنت میں میری یہ پہلی رات تھی جو بڑی پرکیف اور بڑی حسرتناک تھی، اللہ اکبر! یہ کیسی یادگار رات ہے جس میں شیراز ہند کی اس عظیم تاریخی مسجد میں اپنے کو حضرت ملک العلماء حضرت قاضی شہاب الدین آبادی، حضرت ملا محمود جونپوری، حضرت دیوان عبدالرشید اور دوسرے ہزاروں باکمال فضلائے دہر کے حاشیہ نشینوں میں پارہا ہوں، جونپور کی یہ رات میری زندگی یادگار رات ہے میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔

جلسہ اور تقریر

اٹالہ کی مسجد کا یہ جلسہ تعلیم نسواں کے سلسلے میں تھا اس لئے میرا موضوع علمی اور تعلیمی ودینی رہا، میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جس خطۂ زمین پر آج میں مجمع کو خطاب

کر رہا ہوں وہ اسلامی علوم وفنون کی راجدھانی ہے یہاں شاھان شرقیہ اور مغل بادشاہوں نے علم وفن کے تخت وتاج کی حکومت کی ہے، اگر شاہ جہاں نے محبت کی حسین راتوں کی ٹھنڈی چاندنی کو سمیٹ کر آگرہ میں تاج محل تعمیر کیا ہے تو اسی نے ہندوستان کے اسلامی علوم کی بساط سے پورب کی بزم کو سجایا ہے اور ''پورب شیراز ما است'' کہہ کر اس سرزمین کو علم وفن، شعروادب اور اسلامی رجال کا گہوارہ بنایا ہے جہاں صدیوں تک علم وفن کے چراغ جلتے رہے اور اس کے گرد پروانے رونق محفل بنے رہے جونپور، ظفرآباد ہی نہیں بلکہ اس حکومت کی آخری حدود تک علم اور اہل علم کی جولان گاہ رہ چکی ہے، حتیٰ کہ مبارکپور بھی اسی سلطنت کا ایک حصہ رہ کر اس کے علم و فضل سے حصۂ وافر پا چکا ہے، اور سلسلہ بہ سلسلہ آج تک اس کا فیض جاری ہے یہی نہیں بلکہ یہاں کے تخت وتاج تک کتاب وقلم کے حق میں دست بردار ہو چکے ہیں، سلطان ابراہیم شاہ شرقی اسی سرزمین پر ملک العلماء قاضی شہاب الدین کی جان کے بدلے اپنی جان کو بارگاہ خداوندی میں پیش کر کے سلطنت کو علم وفضل کی نذر کر چکا ہے جس سرزمین کو شاہ جہاں نے ''شیراز ہند'' قرار دیا ہو اور جہاں کی سلطنت کو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے علم پر قربان کر دیا ہو، وہاں کے خمیر میں علم ہے اور یہ وصف کبھی اس سے ختم نہیں ہو سکتا، گذشتہ صدی تک جونپور کے مدرسے اطراف وجوانب میں مشہور تھے اور ان میں دور دور کے طلبہ آ کر فیض یاب ہوتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں جب میں مدرسہ سے بھاگتا تھا تو گھر کے لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر شرارت کرو گے تو تم کو جونپور بھیجد یا جائے گا، جہاں کھانے کے وقت گھنٹی بجتی ہے اور طالب علم اپنے اپنے برتن لیکر مطبخ کی طرف دوڑتے ہیں اور جو طالب علم پیچھے رہ جاتا ہے اسے کھانا نہیں ملتا، یہ بات شائد آج آپ کو اچھی نہ معلوم ہو، مگر جو لوگ علم کی تلاش میں شہر شہر قریہ قریہ دوڑتے تھے وہ اسے بڑی خوشی سے گوارا کرتے تھے اور اسی طرح

پڑھ کر انھوں نے قابلیت اور خودداری میں یوں نام پیدا کیا ہے کہ حکومتیں اور حکمراں ان کے سامنے جھکتے تھے مگر ان کی پیشانی کسی کے سامنے نہیں جھکتی تھی۔

ابھی کتنے دن کی بات ہے کہ مدرسہ حنفیہ استاذ المتاخرین مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری جونپوری کی ذات سے علم دین کا گہوارہ بنا ہوا تھا، جہاں مولانا شبلی نعمانی اور میرے نانا مولانا احمد حسین صاحب مبارکپوری جیسے ارباب کمال فیضیاب ہو کر آسمان علم وفن کے شمس وقمر بنے ،اٹالہ کی مسجد کا مدرسہ بھی اپنی مرکزیت اور مرجعیت میں کچھ کم نہیں تھا،جس سر زمین کے خمیر میں علم شامل ہو وہاں کے لوگوں سے تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کی بات کرنا اور اس کی طرف متوجہ کرنا ان کے تاریخی ذہن ومزاج کی یاد تازہ کرنا ہے۔

میرے بعد کئی مقامی اور غیر مقامی مقرروں نے تقریریں کیں ،مولانا عبدالباری صاحب نے بھی تقریر کی بچیوں نے دینی وقرآنی موضوعات پر تقریریں کیں اور نظمیں سنائیں اور قرأت پڑھیں،ان کی دست کاری کی نمائش بھی بڑے سلیقہ سے کی گئی ،ایک سال کی کارگذاری سے اندازہ ہوا کہ نسواں اسکول کے ذمہ داروں میں کتنی لگن اور حوصلہ مندی ہے اور وہ اپنے اس اقدام میں کس قدر کامیاب ہیں اس کی کامیابی کا سہرا دوسرے منتظمین کے ساتھ ساتھ اس کے سکریٹری جناب محمد یوسف انصاری اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے سر ہے۔

جامع الشرق

۲۹ ؍مئی سنیچر کی صبح کو ہم نے ۷؍ بجے جامع الشرق کی زیارت کی جسے یہاں کے ہردلعزیز اور کامیاب حکمراں سلطان ابراہیم شرقی نے شہر کے شمالی حصہ میں بنوایا ہے جامع الشرق بلندی اور شان وشوکت میں دہلی کی جامع مسجد کی ہم پلہ معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مٹی کے پہاڑ پر پتھر کا قلعہ بنا ہوا ہے، جامع الشرق اپنے عظیم

بانی کے ایمانی جذبات واحساسات کی آج بھی ترجمانی کرتی ہے، بڑادروازہ بیسیوں سیڑھیوں کے بعد بلندی پر دکھن کی طرف بنا ہوا ہے، سڑک سے اس دروازہ اوراس کے تینوں طرف وسیع عریض سیڑھیوں کو دیکھ کراس کی عظمت واہمیت کا سکہ دل بیٹھ جاتا ہے لمبا چوڑا صحن، کنارے حجرے اور پتھر کی اکھم اور بلند عمارت بڑی پر شکوہ اور پرعظمت معلوم ہوتی ہے مسجد کے بام ودر، نقش ونگار، احادیث وآیات، اشعار و عبارات یہ سب کہنگی کے باوجود ایمان میں تازگی بخشتے ہیں۔

شمالی سمت مسجد کے باہری حصہ میں احاطہ کے اندر بہت سے مزار ہیں جن میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی اور سلطان حسین شاہ کے مزارات بھی ہیں، اور یہ سب کے سب پتھر کی چہار دیواری میں کھلے پختہ صحن کے اندر تہ بہ تہ پتھروں سے بنے ہوئے ہیں، ان پر کوئی قبہ یا روضہ نہیں ہے، مسجد اور مقبرہ دونوں میں محکمۂ آثار قدیمہ کا بورڈ ہندی اور اردو میں آویزاں ہے جس کی رو سے **جامع الشرق** اور اس حظیرہ کو نقصان پہونچانا سرکاری جرم ہے جس کی سزا قید اور جرمانہ دونوں ہوسکتی ہے ہم نے تو سرسری طور سے جامع الشرق کی زیارت کی مگر بعد میں مولانا حکیم منظور انصاری نے (جن کا تذکرہ آرہا ہے) بتایا کہ جامع الشرق میں بنے ہوئے بعض حجروں اور جھروکوں کو اس طرح صنعت تعمیر کے ساتھ تراش خراش کر بنایا گیا ہے کہ باہر ہوا کسی رخ کی ہو مگر وہاں جاکر ایک ہی رخ کی نہایت ٹھنڈی اور خوشگوار بن کر لگتی ہے اسی طرح صحن کا حوض اس کاریگری سے بنایا گیا ہے کہ اس کے کنارے کسی سمت اور کہیں بھی آپ کھڑے ہوں حوض میں مسجد کا جو عکس پڑتا ہے اس میں آپ بیچ مسجد ہی میں نظر آئیں گے، نیز انھوں نے بتایا کہ جامع الشرق کی بعض نالیاں اور نابدان اس طرح بنائے گئے ہیں کہ جب ان سے مسجد کا پانی باہر کو بہتا ہے تو بالکل صاف ستھرا نکلتا ہے اور صحن کے درختوں کی پتیاں وغیرہ بالکل نہیں آتی ہیں۔

افسوس کہ اس عظیم امانت کے محافظ بہت کم لوگ ہیں، اور یہ عظیم الشان مسجد صفائی تک سے محروم رہتی ہے، شائد اس کے لئے کوئی وقف یا اہتمام نہیں ہے گرد وغبار اور چڑیوں کی گندگی جگہ جگہ دیکھنے میں آئی مسجد کے باہر حجروں میں بھی کچھ گرے پڑے قسم کے خاندان آباد ہیں جو بجائے خود اس عظیم مسجد کی نفاست ونزاکت کے لئے مستقل بار ہیں۔

دو مدرسے

اس مسجد کے احاطے میں دو مدرسے ہیں، ایک میں صرف قرآن شریف کی تعلیم ہوتی ہے اس کے بچے مسجد کے صحن میں اور اندر پڑھتے ہیں، دوسرا مدرسہ عربی کا ہے جس میں درس نظامیہ کے ساتھ عالم فاضل کے کورس کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، پہلے مدرسہ کا نام مدرسہ صدیقیہ ہے، اور دوسرا مدرسہ جناب مولانا محمد ایوب صاحب کے زیر اہتمام چلتا ہے اور مولانا موصوف نے اس مدرسہ کو اپنا مقصد زندگی بنا کر یہیں اقامت اختیار کر لی ہے۔

یہ مدرسہ جامع الشرق کے جنوبی مشرقی حجروں میں ہے، ہمارے داخل ہوتے ہی اس کے ایک مدرس غالباً ماسٹر محمد مسلم صاحب نے چائے کیلئے اصرار کیا وہ اور مولانا محمد ایوب صاحب ۲۷؍مئی کو گھوسی کے جلسے میں گئے تھے اور صبح کو وہاں سے چلے آئے تھے، مولانا چونکہ اعظم گڈھ کے ایک گاؤں میں اپنی رشتہ داری میں رک گئے تھے اس وقت موجود نہیں تھے، مگر بعد میں آتے ہی خبر ملی تو اسی وقت حکیم منظور صاحب کے یہاں ملنے کے لئے تشریف لائے اور کھانا ہمارے ساتھ تناول فرمایا، ان کی غیر موجودگی کے باوجود چونکہ ان سے ایک خصوصی علمی ودینی تعلق ہے اور جونپور کے معدودے چند متعارفین میں سے ہیں، اس لئے ان کے مدرسہ میں دل بستگی رہی اور ماسٹر صاحب نے بڑے اہتمام وانتظام کے ساتھ ہماری تواضع کی، وہ نام تو پہلے

سے سنتے تھے مگر کل ہی گھوسی کے جلسے میں دیکھا تھا، اور تقریریں سنی تھی۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی

جامع الشرق کی مناسبت سے اس کے نیک دل ،عادل،اور ہر دلعزیز حکمراں سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے مختصر حالات یہاں پر مناسب معلوم ہوتے ہیں، سلطان الشرق خواجہ جہاں (۷۹۶ھ تا ۸۰۶ھ) نے جونپور میں شرقی سلطنت کی بنیاد رکھی ،اس کے بعد سلطان مبارک شاہ شرقی (۸۰۲ھ تا ۸۴۴ھ) نے حکومت کی پھر سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ۸۰۴ھ سے ۸۴۴ھ تک بڑی کامیاب اور شاندار حکومت کی ،سلطان ابراہیم بن خواجہ جہاں بہت ہی عادل ، نیک سیرت اور شریف النفس حکمراں گذرا ہے چالیس سال تک اس نے حکومت کی۔

اس نے اپنے دور میں شرقی سلطنت کو رشک جنت بنایا، ہر قسم کا ملکی انتظام کیا، پیداوار اور تعمیرات کی طرف خاص طور سے توجہ دیکر اس میں کافی ترقی کی ،امن وامان اور دین وایمان کی فضا پیدا کی۔

ابراہیم شاہ شرقی کی چالیس سالہ دور حکومت کی آئینہ داری تاریخ فرشتہ کے یہ الفاظ کررہے ہیں۔

وبعدازکوچ چند ازراہ برگشتہ بدارالعلم جونپورآمد،وبصحبت علماء ومشائخ و تعمیرولایت ،وتکثیرزراعت مشغول شدہ،سالہاہیچ طرف سواری نفرمود،ومردم از اطراف واکناف ہندستان کہ شحون ازخلل شدہ بودروئے جونپورآوردہ، ہریک فرا خودمرتبت وحالت نوازش بیافتند وازخادم مشائخ وسادات ونویسندہ ازہرحیثیت بجائے رسید کہ جونپوررا ’’دہلی ثانی‘‘ می گفتند،ابراہیم شاہ شرقی رااز جملہ مغتنمات بمژدہ دوردرہ حیات رابنشاط وانبساط می گذارنیدندازشاہ گرفتہ تاگدابالتمام خوش وقت بودند، واندوہ ازاں دیار یار بستہ بود۔

سلطان ابراہیم شرقی نے محکمۂ احتساب قائم کر کے عوام میں دینداری کی روح پھونکی، خود بھی بڑا دیندار، بیدار مغز اور صاحب مروّت انسان تھا، اللہ تعالیٰ نے ان ہی کمالات واوصاف کی وجہ سے اسے عوام میں بڑی مقبولیت دی تھی، اس نے اپنے چالیس سالہ دورِ حکومت میں بڑے بڑے علماء وفضلاء اور ارباب کمال کو اپنے گرد جمع کرلیا تھا۔

حضرت قاضی القضاۃ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، حضرت قاضی نظام الدین گیلانی، حضرت شیخ ابوالفتح بن عبدالحی بن عبدالمقتدر شریحی الکندی جیسے سرآمدۂ روزگار شیراز ہند میں جمع ہوگئے تھے، سلطان ابراہیم نے پوری سلطنت میں مدارس اسلامیہ کا جال پھیلا دیا، جامع الشرق جسے اب جامع مسجد کہتے ہیں اسی نے بنوائی ہے۔

۸۴۴ھ میں اس کی موت واقع ہوئی، اس کی موت کے غم کو رعایا نے بڑے دکھ درد کے ساتھ برداشت کیا اور مدتوں سوگ منایا۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین

سلطان ابراہیم شرقی نے اگرچہ بہت سے علماء کو اپنے دربار میں جمع کرلیا تھا مگر حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے اس کو خاص انس ونسبت تھی، ان کا نام قاضی القضاۃ ملک العلماء قاضی احمد بن عمر شہاب الدین دولت آبادی ہے، دولت آباد دہلی میں ساتویں صدی کے بعد پیدا ہوئے اور علماء وقت سے تحصیل علم فرمائی، بڑے فہیم وذکی اور علم وتحقیق کے شیدائی تھے، رات دن علمی مصروفیات، درس وتدریس، بحث ومباحثہ اور کتب بینی ومطالعہ کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف میں مشغول رہا کرتے تھے، جب حضرت قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے پہونچے تو استاذ نے ان کی شدت انہماک کو دیکھ کر فرمایا کہ میرے

پاس ایسا طالب علم آیا ہے جس کا گوشت پوست اور ہڈی سب کچھ علم ہی علم ہے۔

قضا وقدر نے حضرت شیخ شہاب الدین کو جونپور پہونچایا اور سلطان ابراہیم شاہ شرقی سے ان کی ملاقات ہوئی تو علم وعمل کے اس گلستاں کو کھلنے اور مہکنے کا پورا سامان مل گیا، سلطان آپ کا انتہا درجہ معتقد ہو گیا، ان کیلئے دربار میں چاندی کی ایک کرسی بنوائی گئی تھی جس پر وہ بادشاہ کے سامنے بیٹھا کرتے تھے آپ کی عظمت وشہرت کا نصف النہار، یوں جلوہ گر ہوا کہ پوری سلطنت شرقی کے قاضی القضاۃ بنا دیے گئے۔

ایک مرتبہ قاضی صاحب بیمار ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی آپ کی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا اور پانی سے بھرا ایک پیالہ منگا کر آپ کے سر پر پھرایا اور یہ کہ کر پی گیا کہ، اے اللہ اگر ان کی موت اسی مرض میں مقدر ہو چکی ہو تو ان کو زندہ رکھ کر ان کی موت میری طرف پھیر دے، یہ بات یوں پوری ہوئی کہ دونوں ہی کچھ آگے پیچھے ۸۴۴ھ میں دنیا سے تشریف لے گئے، آپ کی وفات رجب ۸۴۴ھ میں جونپور میں ہوئی۔

حکیم محمد منظور صاحب انصاری

جامع الشرق کی دید وزیارت کے بعد ہم لوگ جناب حکیم محمد منظور صاحب انصاری کے مطب اور دولت کدہ واقع سبزی منڈی پر حاضر ہوئے، حکیم صاحب موصوف کا نام ادھر چند سالوں سے ماہر معالج اور کامیاب طبیب کی حیثیت سے سنتا تھا، مولانا عبدالباری قاسمی اور حکیم صاحب کے تعلقات بہت دیرینہ اور بہت شگفتہ ہیں، حکیم صاحب اپنی ذات اور اپنے فن سے بہت خوب آدمی ہیں، وہ شہر دیہات اور اندر باہر ہر طرف یکساں مقبول ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں بڑی شفا اور آپ کی ذات میں بڑی مرجعیت دی ہے، ان کے یہاں پہونچ کر طب یونانی کی عظمت وافادیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، صبح سے لیکر ظہر بعد تک مریضوں کا تانتا بندھا

رہتا ہے ترتیب اور نمبر کا خاص اہتمام رہتا ہے، کیا مجال کہ کوئی چھوٹا یا بڑا اس اصول سے مستثنیٰ ہوسکے، حکیم صاحب نیک سیرت اور صاحب نسبت بزرگ ہیں غالباً حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بیعت ہیں، اہل علم اور بزرگوں کے بڑے قدرداں ہیں وہ شیراز ہند کی واقعی یادگار معلوم ہوتے ہیں، بڑے بے تکلف، بڑے ملنسار اور وضع کے پابند ہیں، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر ریاض احمد صاحب انصاری بھی باوجودیکہ ایم، بی بی، ایس اور کامیاب ڈاکٹر ہیں مگر اخلاق وثروت میں اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر مقبولیت ومرجعیت رکھتے ہیں، آٹھ بجے سے لیکر ایک بجے تک ہم لوگ رہے مگر ان کو اتنی فرصت نہ مل سکی کہ باوجود ان کی خواہش اور ہماری آرزو کے حکیم صاحب ہم سے اطمینان سے بات چیت کرتے مریضوں کو دیکھتے جاتے تھے نسخے لکھتے جاتے تھے ان کی ہدایات ان کی زبان اور سمجھ کے مطابق دیتے جاتے تھے اور اسی میں ہم سے بھی باتیں کرجاتے تھے، حتیٰ کہ ساتھ کھانے کو بیٹھے تب بھی یہ سب کام جاری رہا، اور کسی معمول میں فرق نہیں آیا، مریضوں کو دیکھنا اور مہمانوں کی تواضع کرنا دونوں کا معیار قائم رہا، اسی میں دوست احباب اور دوسرے اصحاب ضرورت بھی آتے جاتے اور اپنا اپنا مطلب حاصل کرتے جاتے تھے۔

الغرض حکیم منظور صاحب اپنے فن، اخلاص، اخلاق میں جونپور کی ایک ہی شخصیت نظر آئے ان کی پہلی ملاقات نے باربار ملنے کا داعیہ پیدا کردیا ہے، اور بقول شخصے اب گھر دیکھ لیا، ۲۶ر جون کو محترم حکیم صاحب ایک مریض کے سلسلے میں مبارکپور گئے اور ہمارے گھر بھی تشریف لے گئے، میں محترم حکیم صاحب کا غائبانہ شکریہ ادا کرتا ہوں اور اسے مخلصانہ ملاقات کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

جونپور کی سیر

حکیم صاحب کے یہاں آتے ہی تعارف کے سلسلے میں جونپور کے تاریخی

مقامات کی سیر کی بات آئی، میں نے بڑے شدید انداز میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا، موصوف نے فرمایا کہ افسوس کہ میں ان مریضوں میں گھرا ہوں ورنہ آپ لوگوں کے ساتھ چل کر ایک ایک چیز کی سیر کراتا اور ان کا تاریخی پس منظر بتاتا، اس اثناء میں وہ جونپور کے علماء و عمارات کے حالات بیان کرتے رہے، پھر چند مقامات کی ایک فہرست بنا کر اپنے ملازم کے حوالہ کی اور کہا کہ تم ان دونوں مہمانوں کو گھر کے تانگے پر لیجا کر ان جگہوں کو دکھلاؤ، چنانچہ میں اور مولوی عبدالباری صاحب دونوں سخت گرمی اور دھوپ میں تانگہ پر جونپور کے بعض تاریخی مقامات کی سیر کیلئے نکلے۔

حضرت دیوان عبدالرشید جونپوری

سب سے پہلے ہم ایک جانے پہچانے اپنے عالم و بزرگ حضرت شیخ دیوان عبدالرشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ رشیدیہ اور ان کے نام پر آباد گاؤں رشید آباد پہونچے، یہ گاؤں شہر کے پورب سمت ریلوے لائن کے اس پار پڑتا ہے، یہاں پر حضرت دیوان عبدالرشید اور دوسرے علماء اور اہل اللہ ایک پکی دیوار کے لمبے چوڑے حظیرے کے اندر دفن ہیں، اور کچھ کے چاروں طرف دیوار ہے اور ان میں حضرت دیوان عبدالرشید کا مزار ہے، آپ کے بڑے مناقب و فضائل ہیں، علم و عمل دونوں کی طرف سے مالا مال تھے اور اولاد در اولاد ان کا فیض جاری رہا آپ کی کتاب رشیدیہ فن مناظرہ میں بے مثال کتاب ہے، جو ہمارے درس نظامیہ میں داخل ہے اور پڑھائی جاتی ہے۔

آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے مدرسہ کے دروازے پر جو پتھر رکھا ہے جس پر طالب علم اپنے جوتے اتارتے ہیں وہی پتھر میری قبر میں لگایا جائے، اللہ اکبر! علوم اسلامیہ کے پڑھنے پڑھانے والوں میں ان کی کیا قدر و منزلت تھی اور وہ علوم دینیہ کے اشتغال میں کس مقام و مرتبہ کے مالک تھے۔

مولانا ہدایت اللہ خان صاحب

اسی احاطہ اور حظیرہ میں دوسرے بہت سے علماء، اہل اللہ اور ارباب دین و دیانت مدفون ہیں، ان میں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری مدرس مدرسہ حنفیہ جونپور بھی آسودۂ خواب ہیں، آپ کا وصال جونپور میں دوشنبہ کی شام کو ۵؍بجے پہلی رمضان ۱۳۲۶ھ کو ہوا، آپ کے کوئی اولاد ذکور نہیں رہی، آپ کا نام یہ ہے ہدایت اللہ بن مولوی رفیع اللہ اخوندزادہ بن مولوی عبید اللہ اخون سواتی، آپ رامپور میں پیدا ہوئے، جب مولانا فضل حق خیر آبادی رامپور آئے تو ان کی خدمت میں رہے یہانتک کہ مولانا بغاوت کے الزام میں جزیرہ انڈمان بھیج دیے گئے، حدیث میں صحاح ستہ مولانا عالم علی محدث مرادآبادی سے پڑھیں ۱۸۷۰ء میں مدرسہ حنفیہ جونپور کے مہتمم و مدرس رہے، اور یہیں سپرد خاک ہوئے، میرے نانا مرحوم حضرت مولانا حسین احمد صاحب مبارکپوری رسولپوری متوفی ۲۶؍رجب ۱۳۵۹ھ نے جونپور میں مولانا سے ۱۳۰۹ھ میں ملاحسن، ملاجلال، میرزاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحییٰ وحاشیہ بحر العلوم اور دیگر کتابیں پڑھی تھیں، رحمهما الله تعالیٰ۔

اس سنسان ویرانے میں جا کر شدید خیال پیدا ہوا کہ یہ علم و فضل کا مدفن اپنی آغوش میں کیسے کیسے ارباب فضل وکمال کو لئے ہوئے ہے، کاش! اسی وسیع احاطہ میں کچھ علم اور دین سے نسبت رکھنے والے آکر آباد ہوں اور یہیں رہ کر خاموشی اور یکسوئی سے کچھ علمی و دینی کام کریں تو بڑی خیر و برکت ہو، مسلمانوں کے لئے ان کی یہ وراثتیں بڑے کام کی ہیں اگر وہ ان سے کام لیں۔

حضرت حمزہ چشتی

اس کے بعد ہم حضرت حمزہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر پہونچے آپ کا مزار

اعظم گڈھ آنے والی شاہ راہ کے بائیں طرف واقع ہے، وہ بھی ایک حظیرہ کے اندر آسودۂ خواب ہیں جو چہار دیواری کے اندر واقع ہے ہم نے دونوں بزرگوں کے مزار پر فاتحہ پڑھا اور زیارت کی۔

شاہی قلعہ

اس کے بعد جونپور کے شاہی قلعہ میں آئے جو شاہان شرقیہ کی یادگار ہے، دریائے گومتی شہر کے وسط سے بہتا ہے اس کے کنارے شمال کی طرف یہ قلعہ بلندی پر واقع ہے، دوہری فصیل ہے اور پوربی دروازہ سے بلندی شروع ہوتی ہے جو اندر کی مسجد تک چلی گئی ہے، حملہ کی وجہ سے سامنے کی دیوار دو تین جگہ سے ٹوٹ گئی ہے دوسری فصیل کے نیچے بلندی پر ایک بزرگ کا مزار ہے جن کو غالبًا حضرت شاہ درباری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، قلعہ کے اندر ہم زیادہ نہ ٹھہر سکے، مسجد میں گئے جو چھوٹی ہونے کے باوجود بہت خوبصورت ہے اس کی اندرونی کمانوں کو کم کر کے لوہا لگا دیا گیا ہے غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ کہنگی سے وزنی کمانوں کا اوپر ٹھہرنا مشکل ہوگیا تھا، ہمیں مسجد کے اندر ایک صاحب سوئے ہوئے نظر آئے، جو غالبًا محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے وہاں تعینات ہیں، اسی طرح ایک اور صاحب دوسری طرف نظر آئے یہ بھی غالبًا دیکھ بھال کیلئے ہیں محکمۂ آثار قدیمہ کا بورڈ یہاں بھی آویزاں ہے۔

اس قلعہ کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی کہ جن لوگوں نے اپنے لئے ایسے ایسے قلعے بنوائے وہ آج مٹی کا ڈھیر بن گئے ہیں اور ان کے یہ مکانات بھی آہستہ آہستہ مٹی کا ڈھیر بنتے جا رہے ہیں پھر بھی مکینوں کے مقابلے میں ان کے مکانوں کی عمریں زیادہ ہیں کہ یہ ابتک کسی نہ کسی حال میں موجود ہیں۔

پل اور شیر کی مسجد

جونپور کا پل اپنی صناعی اور مضبوطی میں دنیا بھر میں مشہور ہے یہ مسلمانوں کے

فن تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جو پورب کی سرزمین میں پایا جاتا ہے اس پل پر انگریزی زبان میں بھی کئی مضامین ومقالات لکھے جاچکے ہیں، اسی کے کنارے شیر کی مسجد ہے، پل کے اوپر دورویہ دکانیں ہیں، جو غالباً سپاہیوں اور سنتریوں کے رہنے کے کام آتی تھیں، مگراب ان میں خرید وفروخت کا کام ہوتا ہے، گذشتہ رات جلسہ کے سلسلہ میں اٹالہ کی مسجد دیکھی تھی، اس وقت بھی اس کی دیدوزیارت کے لیے گئے مگر گرمی اور دھوپ کی شدت سے اندر نہ جاسکے بلکہ صحن ہی سے واپس آگئے، اس طرح بارہ بجے حکیم صاحب کے یہاں پہونچ گئے، یہ سیر نہایت ہی تشنہ اور نامکمل رہی اور دوسرے موقع کے لئے ہم نے جونپور کی تفصیلی سیر وزیارت اٹھا رکھی، ورنہ یہاں کے ہزاروں آثار وعلائم پکار پکار کر ارباب نظر کو اپنی دید کی دعوت دیتے ہیں۔

اندازہ ہوا کہ ان تاریخی اور اسلامی آثار کے بقا وتحفظ کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، جونپور چھوٹا سا شہر ہے، یہاں کے مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر ہی مساجد وجوامع کی حفاظت ومرمت کرسکیں، پھر بھی اپنی طاقت بھر کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں، چنانچہ جامع الشرق کے شاہی حوض کے کنارے سائبان بنانے کے لیے اینٹ کے ناتمام کھمبے نظر آتے ہیں مگر چونکہ آثار قدیمہ کے قانون کی رو سے اس مسجد میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی ہے اس لیے یہ کام نہ ہوسکا، اگر اس مسجد کے وضع قطع کے مطابق اسے بنایا جاتا تو شائد اس کی اجازت مل جاتی، ویسے مدرسہ جاری رکھنے اور نماز پڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے محکمۂ آثار قدیمہ کو یہاں کی تاریخی عمارتوں کی حفاظت ومرمت اور صفائی کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے، اس کی سخت ضرورت ہے۔

جونپور اور شاہان شرقیہ

ہم اب تک جونپور کی داستان ناظرین کو سناتے چلے آئے ہیں مگر خود جونپور

اور یہاں کی شرقی سلطنت کے بارے میں بہت کم بیان کیا ہے، حالانکہ اس سفرنامہ کی تکمیل کے لیے اس کا بیان کرنا ضروری ہے۔

سلطان غیاث الدین تغلق کے دولڑکے تھے ایک کا نام ظفرخان تھا اور دوسرے کا نام فخرالدین جونا تھا غیاث الدین نے ظفرخاں کے نام پر ظفرآباد کیا اور فیروزشاہ تغلق نے ۷۶۱ھ سے پہلے فخرالدین جونا کے نام پر جونپور آباد کیا۔

سلطان الشرق خواجہ جہاں نے شرقی سلطنت قائم کرکے ۷۹۶ھ سے لیکر ۸۰۲ھ تک حکومت کی، جو ۸۸۰ھ میں حسین شاہ کی موت پر ختم ہوگئی، اس طرح جونپور میں شرقی حکومت پچاسی چھیاسی برس تک رہی اور اس میں چھ حکمراں گذرے

(۱) سلطان الشرق خواجہ جہاں ۷۹۶ھ سے ۸۰۲ھ تک
(۲) سلطان مبارک شاہ شرقی ۸۰۲ھ سے ۸۰۴ھ تک
(۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی ۸۰۴ھ سے ۸۴۴ھ تک
(۴) سلطان محمود شاہ شرقی ۸۴۴ھ سے ۸۶۲ھ تک
(۵) سلطان محمد شاہ شرقی ۸۶۲ھ سے ۸۶۲ھ تک
(۶) سلطان حسین شاہ شرقی ۸۶۲ھ سے ۸۸۱ھ تک

سلطان بہلول لودی کے ہاتھوں ۸۸۳ھ میں جونپور سے شرقی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا اور یہ علاقہ لودیوں کے قبضہ میں آیا پھر ۹۳۲ھ میں شاہ بابر نے لودیوں کا خاتمہ کردیا اور تیموری دور میں یہاں بڑی ترقی اور وسعت ہوئی۔

شرقی دور کے بعض علماء وفضلاء:

۷۹۶ھ سے ۸۸۳ھ تک شاہان شرقیہ کے دور میں جونپور شیراز ہند بنا، شاہ جہاں نے اسی پر بہار دور کے بارے میں کہا ہے کہ ''پورب شیراز ما است'' اس زمانہ میں ملتان، لاہور، اور دہلی کے ارباب فضل وکمال اور علماء ومشائخ کھینچ کر سرزمین

پورب میں آگئے، ملک العلماء قاضی القضاۃ شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۰ھ، شیخ نظام الدین داماد قاضی شہاب الدین، سید اسد الدین ظفرآبادی متوفی ۹۳۷ھ الملقب بہ مخدوم آفتاب ظفرآبادی، شیخ قطب الدین ابوالغیب بن نورالدین متوفی ۸۶۹ھ ، ملا شیخ عبدالملک عادل فاروقی بن نواب عمادالملک وزیر سلطنت شرقی، ملا عطاء الدین برادر شیخ عبدالملک قاضی سماء الدین قتلغ خان وزیر سلطنت شرقی متوفی ۸۸۳ھ، شیخ محمد عیسیٰ جونپوری، شیخ نورالدین ابومحمد بن مخدوم سید اسد الدین متوفی ۸۲۶ھ، ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفرآباد متوفی ۸۳۹ھ، قاضی الدین ناصحی ظفرآبادی متوفی ۸۳۱ھ ، قاضی نصیرالدین گنبدی قاضی جونپور متوفی ۸۱۷ھ ، ان حضرات کے علاوہ ہزاروں علماء اسلام اور بزرگان دین کے دم قدم سے جونپور کی شرقی سلطنت تخت وتاج کے بجائے کتاب وقلم کی اقلیم تھی اور بجا طور پر شیراز ہند کہے جانے کی مستحق تھی۔

لودھیوں کے بعد جب ۹۳۲ھ میں تیموری دور حکومت آیا، تو پھر جونپور کا آسمان علم وفضل کے چاند تارے بکھیرنے لگا اور اس کے مطلع پر وقت کے اعاظم رجال طلوع ہوئے، اس زمانہ میں مولانا الہداد متوفی ۹۶۲ھ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین تھے ، حضرت شیخ رفیع الدین محدث شیرازی متوفی ۹۵۴ھ ، شیخ معروف مرید مولانا الہداد، شیخ دانیال جونپوری، شیخ تھن ، میر عدل غازی پوری متوفی ۹۰۵ھ ، سید محمد جونپوری متوفی ۹۱۰ھ جن کے نام سے فرقۂ مہدویہ جاری ہوا، شیخ محمد حسن بن شیخ حسن جونپوری متوفی ۹۴۴ھ ، قاضی صلاح الدین خلیل جونپوری ، مولانا سید عبدالاول جونپوری متوفی ۹۶۸ھ آپ نے سب سے پہلے بخاری شریف کی شرح فیض الباری لکھی ، ملا یوسف قاضی خاں ظفرآبادی متوفی ۹۷۰ھ ، استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری، حضرت شاہ دیوان عبدالرشید متوفی ۱۰۸۳ھ آپ نے شاہ

جہاں کے اصرار کے باوجود خانقاہ سے باہر قدم نہیں نکالا، ملا محمود جونپوری اپنے زمانہ میں عقلیات کے سب سے بڑے امام تھے، نانا مرحوم حضرت مولانا احمد حسین صاحب مبارک پوری متوفی ۱۳۵۹ھ نے الفرائد کا بہترین حاشیہ لکھا ہے جو چھپ چکا ہے۔

ان حضرات کے علاوہ خاص عہد شاہجہانی میں ملا ضیاء الدین محدث، شیخ چندن محدث، شیخ احمد زین زاہد، قاضی محمد حسین جونپوری، شیخ محمد ماہ دیوگامی جونپوری، ملا شمس الدین جونپوری، ملا نور الدین جونپوری، ملا باب اللہ جونپوری، شیخ محمد افضل سید پوری غازی پوری رحمهم اللہ جیسے ارباب فضل وکمال ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے،

شرقی حکومت کے حدود اور اثرات

جونپور کی شرقی حکومت اپنی حدود کے اعتبار سے بڑی وسیع وعریض تھی پورب میں ترہت تک اس کی عمل داری تھی، موجودہ بلیا، غازی پور اور اعظم گڈھ کے اضلاع اس میں شامل تھے۔

موجودہ ضلع اعظم گڈھ اس دور کی برکتوں سے اچھی طرح مالا مال تھا اور سرائمیر، نظام آباد، چریا کوٹ، گھوسی، بھیرا وغیرہ ارباب علم وفضل سے معمور تھے، ان ہی میں مبارک پور بھی تھا جہاں اس دور میں بڑی خیر وبرکت تھی اور اس کا سلسلہ آخری دور تک قائم رہا چونکہ شاہان شرقیہ کے زمانہ میں مبارکپور، قاسم پور، یا رشید آباد کے نام سے آباد تھا، اس لئے اس دور کی تاریخوں میں یہ نام نہیں ملتا ورنہ یہ بستی موجود تھی، یہاں بھی بہت بڑے بڑے علماء موجود تھے۔

حضرت ملا محمود جونپوری کا مولد ومنشاء بھیرا تھا، اور لہرا (مبارکپور) میں ان کی رشتہ داری تھی، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لھرا میں ملا محمود یا کسی اور بزرگ کا ایک مدرسہ بھی تھا، حضرت الشاہ ابو الغوث گرم دیوان ملا محمود صاحب کے خاندان

سے ایک بزرگ لہرا میں مدفون ہیں۔

۱۸۰۱ء میں اعظم گڈھ کا ضلع تشکیل پایا، اس سے پہلے چند سالوں کے لئے یہ علاقہ اودھ کے حکمرانوں کے زیر تصرف بھی آیا تھا، جس میں انھوں نے بڑی تیزی سے اپنی سرپرستی میں تعزیہ داری اور شیعیت کو فروغ دیا، قصبہ مبارکپور کی موجودہ آبادی حضرت شیخ راجے مبارک کے نام سے ہے، جو حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلیفہ حضرت راجہ حامد شاہ کی نسل سے ہیں، انھوں نے ہمارے خاندان کو مانک پور کڑا سے ساتھ لاکر یہاں آباد کیا تھا، اسی وقت سے یہ گھرانا علمی و دینی تھا، قصبہ محمد آباد گوہنہ دارالقضاء تھا اور ہمارے خاندان میں مبارکپور اور اطراف و جوانب کے لئے نیابت قضاء کا عہدہ تھا جو اب تک کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے اس خاندان پر جب علمی زوال ہوا تو کئی بورے قلمی کتابیں کنوؤں میں ڈال دی گئیں، مجھے طالب علمی کے زمانہ میں اپنے پردادا شیخ محمد رجب صاحب خطیب مبارکپور کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطبات کے چند صفحات ملے تھے جن پر آخر میں ۱۲۹۲ھ درج تھا، نیز ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن شریف بھی ہمارے خاندان میں ابھی جلدی تک تھا۔

شیراز ہند کی علمی و دینی راجدھانی اور اس کے ارباب علم و فضل حکمرانوں کے تذکرے میں اس سیاح و مسافر کا یہ مختصر تذکرہ اظہار نسبت کیلئے ہے جو بجائے خود ایک بڑی سعادت ہے۔

یہ میری زندگی اے کاش: افسانہ ہی بنجاتی
یہ افسانے میں ان کے تذکرہ میرا کہاں آیا

(ماہنامہ ''البلاغ'' اگست ۱۹۶۵ء)

☆☆☆☆☆☆☆

بمبئی سے بُرہان پور تک (جون ۱۹۶۵ء)

عام طور سے کسی وعدہ کی وفا کا تقاضا لوگ کرتے ہیں، مگر کچھ وعدے ایسے ہوتے ہیں جو خود وفا کا تقاضا کرتے ہیں، اور بعض وعدے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔ میرے لئے ''دارالسرور'' برہان پور کا وعدہ اور تقاضا اسی تیسری صورت سے تعلق رکھتا تھا، گذشتہ چار پانچ سالوں سے میں اس عظیم اسلامی شہر کی زیارت کے لئے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا نیز برہان پور کے اربابِ ذوق اور اہل علم وفن کا تقاضا تھا کہ میں وہاں حاضر ہوں، محترمی الحاج یحییٰ زبیر صاحب (بمبئی) کا تقاضا سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ اہم تھا جو میرے لئے ہر اعتبار سے قابل اہمیت تھا، نیز محمد اسمٰعیل صاحب فہمیؔ برہان پوری اور محترمی منشی محمد حشمت اللہ صاحب ریاضی ناظم مدرسہ فیض العلوم برہان پور وغیرہ مجھے برہان پور آنے کی بار بار دعوت دیا کرتے تھے، ادھر میں خود برہان پور کی اسلامی روایات اور یہاں کے فاروقی حکمرانوں، ادباء وعلماء اور اہل اللہ کے حالات اور کارناموں کو پڑھ پڑھ کر اس کی عظمتِ رفتہ کی باقیات صالحات کی دید وزیارت کا متمنی تھا کہ اگر اس کے دورِ پُر بہار کے گلستاں کی زیارت نصیب نہ ہو سکی تو اس کی خزاں ہی سے اندازۂ بہار کر لینا چاہئے، الحمد اللہ کہ اس سال اس کی باری آ گئی اور سالوں کی تمنا پوری ہوئی۔

دَارالسرور برہان پور:

جب ۱۳؍جون کو مبارکپور سے واپس آیا تو محترم الحاج یحییٰ زبیر صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی ہی طرح بھاری بھرکم انداز میں حکم دیا کہ ۱۲؍ربیع الاول کی تقریب میں برہان پور چلنا ہے، میں ابھی ٹکٹ خرید لیتا ہوں، میں نے اب کے کوئی

لیت ولعل نہ کرتے ہوئے فوراً اپنی آمادگی ظاہر کردی، اور ۱۰؍ربیع الاول کو روانگی متعین ہوگئی۔

بہرحال میں پٹھان کوٹ اکسپریس سے ۱۰؍ربیع الاول کی رات میں روانہ ہوکر ۱۱؍کی صبح تقریباً ۸؍بجے برہان پوراسٹیشن پر پہونچا، خلیفہ عباسی ابوجعفرمنصور نے بغداد کو دارالسلام کا لقب دیا تو ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں نے برہان پور کو دارالسرور کہہ کر پکارا ہے۔ واقعی بعض شہروں کی آب وہوا میں سرورومسرت کی کیفیت ہوتی ہے جس طرح بعض مقامات میں دوسری کیفیات وخصوصیات بھی پائی جاتی ہیں ہمارے مسلمان جغرافیہ نویسوں نے ایسے شہروں کے نام گنائے ہیں جن میں اس قسم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، برہان پور بھی غالباً اس اعتبار سے وسطِ ہند کا نشاط آگیں، فرحت بخش اور خوش کن شہر ہے اور اسی مناسبت سے شاہ جہاں نے اسے دارالسرور کا لقب دیا ہے، ویسے وطن آتے جاتے برہان پوراسٹیشن سے متعدد بار گزرنا ہوا ہے اور اس مقام کی عظمت رفتہ کے خیال سے اکثر پلیٹ فارم پر اترا بھی ہوں، مگر اب کے یہاں کی صبح جس قدر خوشگوار اور پُر بہار معلوم ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں معلوم ہوئی۔ طبیعت میں انشراح، روح میں تازگی اور ذوق میں شگفتگی واضح طور سے محسوس ہورہی تھی۔

اسٹیشن پر قدردانوں کی ایک بھیڑ دیکھ کر خوشی بھی ہوتی تھی اور شرمندگی بھی، اللہ تعالیٰ کبروغروراور نام ونمود کی سطحیت سے بچائے، ایسے موقع پر خودنمائی اور خود پرستی کا خیال آجانا کوئی بعید بات نہیں ہے، خوشی اس لئے ہوتی تھی کہ ہر طبقہ، ہر عمر کے حضرات صرف دین اور علم دین کی نسبت کے احترام میں آئے ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی دنیاوی رشتہ نہیں ہے، اور نہ ہم سے ان کی کوئی غرض ہے، اور شرمندگی اس لئے محسوس ہوتی تھی کہ یہ حضرات جس عقیدت ومحبت کے ساتھ آئے ہیں اپنے اندر مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد، وما ہیچ

لوگ ہمیں کیا سمجھ رہے ہیں مگر ہم کیا ہیں؟ ہم جیسے بے علم و بے عمل کا یہ شاندار استقبال اس شہر کے لوگ کررہے ہیں جس کے چپے چپے میں علم وعمل، فضل وکمال اور زہدوتقویٰ کے پہاڑ دفن ہیں، اور جہاں کی موجودہ ویران اور سنسان فضاؤں میں بھی علم وفضل کے نقاروں کی گونج ابتک باقی ہے، اس مقام کے بزرگ، بوڑھے، جوان اور بچے ایک کم سواد اور بے مایہ شخص کے ساتھ کس عقیدت ومحبت کا معاملہ کررہے ہیں، ان کے پُرخلوص ہار اور پھول سے گردن جس قدر زیر بار ہوتی جاتی تھی، اسی قدر شرم وندامت سے جھکی جاتی تھی، حتیٰ کہ کہنا پڑا کہ اچھا اب یہ سلسلہ مہربانی فرما کر بند کیجئے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ استقبال کے ہار پھول نہیں ہیں گردن میں ذمہ داری کے قلادے ہیں، اچھا ہوا کہ اس موقع پر اپنے بارے میں ذمہ داری کا احساس ہوا، یہ احساس ان کے خلوص کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

جو مجمع مجھے اسٹیشن پر لینے آیا تھا اس میں ہر طبقہ کے اعیان واشراف شامل تھے، ایک بزرگ حاجی محمد مرتضیٰ صاحب ناظم وارثی نے فرمایا کہ میں آپ کو اس وقت سے غائبانہ جانتا ہوں جب سے کہ رسالہ ''قائد'' مرادآباد میں آپ کے اشعار اور مضامین پڑھا تھا، یہ ۲۵ رسال پہلے کی بات ہے جب میں اپنے وطن میں غالباً ہدایہ شرح وقایہ وغیرہ پڑھتا تھا، اس زمانہ میں شعروشاعری اور مضمون نگاری کا ابتدائی شوق ابھر رہا تھا، رسالہ قائد مرادآباد میں ائمہ اربعہ کے عنوان سے میرا ایک مستقل مضمون چاروں اماموں پر نکلتا تھا نیز دوسرے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی تھیں، عربی کے اس ابتدائی طالب علم کو رسالہ کے ایڈیٹر اور بعد میں ہونے والے استاذ (حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ) ''حضرت مولانا'' کہہ کر مضامین کی رسید کی اطلاع فرمایا کرتے تھے اور لکھتے تھے کہ آپ کے مضامین کی زیادہ تعریف اس لئے نہیں کرتا کہ مبادا آپ رسالہ قائد کو ان کا

اہل نہ سمجھنے لگیں، اس مرحوم رسالہ کی یاد کہاں اور کیسے موقع پر آئی ابتدائی دور کے اس ذوق مضمون نگاری اور شعر وشاعری نے کتنی مدت کے بعد اپنا رنگ دکھایا، اللہ اکبر! انسان کا کوئی اچھا کام ضائع نہیں جاتا اور اس کی قدر و قیمت باقی رہتی ہے۔

شہر برہان پور اسٹیشن سے بجانب مشرق تین میل پر واقع ہے، سڑک نہایت اچھی ہے، اس کے پورب دریائے تاپتی بہتا ہے، مہاراشٹر کی موجودہ شمالی حد سے ۱۲؍ میل دوری پر مدھیہ پردیش میں واقع ہے، جیسا کہ بتایا گیا، موجودہ آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے، جس میں ہر طبقہ وخیال کے چالیس ہزار مسلمان آباد ہیں، اس کو شاہ نصیر خاں فاروقی نے ۸۰۱ھ میں اپنے پیر و مرشد شیخ برہان الدین غریبؒ کے نام پر آباد کیا تھا جو دوسو سال تک خاندیس کے شاہانِ فاروقیہ کا دارالسلطنت رہا، نصیر خاں فاروقی بن ملک راجہ بن خان جہاں بن علی بن عثمان بن شمعون اپنے والد کے بعد ۸۰۱ھ خاندیس کا حاکم ہوا اور چالیس سال تک نہایت کامیاب حکومت کی، اسی نے آسیر گڈھ کو فتح کیا اور برہان پور آباد کیا، نیز اس نے دریائے تاپتی کے اُس پار زین آباد شیخ زین الدین داؤد شیرازی کے نام پر آباد کیا، ۳۰؍ربیع الاول ۸۴۱ھ کو انتقال کیا۔

حضرت شیخ محمد بن محمود ہانسوی شیخ برہان الدین کے لقب سے مشہور ہیں، آپ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے بھانجے تھے، ۶۵۴ھ میں ہانسی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی پھر دہلی آئے اور علوم ظاہری حاصل کر کے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی صحبت میں پہونچے اور ان کی زندگی بھر وہیں رہے، ۷۱۸ھ یا ۷۲۰ھ میں دولت آباد آئے، ۷۳۸ھ میں ۱۱؍صفر چہار شنبہ کو فوت ہوئے، آپ کا مزار روضہ خلد آباد میں ہے۔آپ کے نام پر نصیر خاں فاروقی نے برہان پور آباد کیا، آپ کے تلامذہ میں شیخ زین الدین داؤد بن حسین شیرازی ہیں جن کے نام پر نصیر خاں نے زین آباد بسایا، اس وقت سے مغلوں کے قبضہ تک یہ شہر شاہانِ فاروقیہ کا پایۂ تخت رہا اور دوسو سال تک

یہاں ایک حکومت قائم رہی، اس کے بعد مغل بادشاہوں کے زیر تصرف آیا اور اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور عالم گیر کے دورِ حکومت میں جنوبی ہند کی تمام سرگرمیوں کا مرکز رہا، اس دور میں عبدالرحیم خاں خانان نے یہاں پر ۲۰ سال تک رہ کر اسے بڑی ترقی دی اور اسے دہلیٔ ثانی کے مرتبہ کو پہونچایا، اس کے بعد برہان پور آصف جاہیٔ دکن کے زیر تصرف رہا، پھر کچھ دنوں مرہٹوں کے قبضہ میں رہا یہانتک کہ انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا، شہر پناہ کی دیواریں اور دروازے ابتک ساڑھے پانچ میل میں ہیں بعض بعض جگہ سے دیواریں ٹوٹ گئی ہیں، مگر مجموعی طور سے اینٹ اور چونے کا یہ حصار ابتک باقی ہے، اسے آصف جاہ اوّل نے بارہویں صدی ہجری میں تعمیر کرایا تھا، شاہانِ فاروقیہ کے دور کے واقعات وآثار اب بھی پائے جاتے ہیں، اور ان کے کارناموں کی داستانیں بھی موجود ہیں، مگر مغلوں کے دور میں برہان پور کو جو ترقی واقبال مندی نصیب ہوئی اس کی مثال دوسرے شہروں میں نہیں ملتی۔ عبدالرحیم خاں خانان نے یہاں مدتوں رہ کر بڑے کارنامے انجام دئے، مختلف بلاد وامصار کے علماء وفضلاء اور شعراء یہاں آئے اور قدردانی کے مستحق ٹھہرے۔ اس نے ملا عبدالباقی نہاوندی سے ''مآثر رحیمی'' لکھوائی جو گویا برہان پور کی دورِ خانِ خاناں کی چشم دید تاریخ ہے۔ خان خانان نے یہاں ۱۰۲۴ھ میں آب رسانی کا محکمہ جاری کیا، باغات لگوائے، شاہجہاں نے شہزادگی اور حکمرانی کے ایام میں یہاں سے دلچسپی لی، قلعہ کی مرمت کرائی، قسم قسم کی عمارتیں بنوائیں، مساجد وجوامع کو آباد کیا، ان ملوکانہ وشاہانہ آثار وعلائم سے ہٹ کر برہان پور اس لئے بڑا مقدس اور قابل احترام شہر ہے کہ یہاں بے شمار علماء وفضلاء، ادباء اہل اللہ اور بزرگانِ دین گزرے ہیں۔ کتنے یہاں رہ کر اکتسابِ فیض کر چکے ہیں، کتنے یہاں کی سرزمین میں محوِ خواب ہیں، عالیشان مساجد وجوامع اور ان کے محراب ودَر نمازیوں کو یاد کررہے ہیں، ان کے میناروں سے عبدیت وبندگی کی

روشنی پھیلتی ہے، الغرض شہر برہان پور آج بھی اہل نظر اور اربابِ دل کے لئے بہت پُرکشش اور دلکش شہر ہے۔

برہان پور کی چند زندہ تاریخیں:

برہان پور اب اپنی تمام عظمت رفتہ کے ساتھ اوراقِ پارینہ ہو رہا ہے، اس کی رونق کے دن بیت چکے، تاریخی آثار و علائم مٹ رہے ہیں۔ بہت سی تاریخی عمارتیں سرکاری محکمہ آثارِ قدیمہ کے ماتحت آچکی ہیں اور کتنی تباہ ہو رہی ہیں، افسوس کہ اب تک برہان پور کی مفصل تاریخ نہیں مرتب کی جاسکی، لے دے کے مولانا قاضی خلیل الرحمٰن صاحب برہان پوری مرحوم کی ''تاریخ برہان پور'' سب کچھ ہے جو شاہانِ فاروقیہ، سلاطین مغلیہ، امرائے آصفیہ اور یہاں کے علماء و اولیاء کی مختصر سوانح عمری پر مشتمل ہے، تھوڑا بہت عمارات اور آثارِ قدیمہ کا حال بھی ہے، مگر اسے برہان پور کی مکمل تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے اس کی ایک جامع اور مکمل تاریخ مرتب کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

اس وقت برہان پور میں چند شخصیتیں ہیں جن کو یہاں کی زندہ تاریخ کہا جاسکتا ہے، ان میں مولانا سید احکام اللہ صاحب بخاری ہر اعتبار سے مقدم ہیں، موصوف جامع مسجد برہان پور کے خاندانی امام ہیں ۱۹۱۱ء سے اس عہدہ پر ہیں، علماء و اولیائے برہان پور کی تصنیفات آپ کے ذاتی کتب خانہ میں مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ آپ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے یادگارِ سلف ہیں۔ محترمی منشی حشمت اللہ صاحب ریاضی کہنا چاہئے کہ یہاں کی ایک ایک یادگار کے ترجمان ہیں۔ موصوف فارسی کے اچھے عالم اور تاریخ برہان پور کے ماہر ہیں، مدرسہ عربیہ فیض العلوم کے ناظم بھی آپ ہی ہیں، آپ کا خاندان مبارکپور ضلع اعظم گڈھ کا ہے، آباء و اجداد ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ مبارکپور سے الہ آباد آئے پھر وہاں سے برہان پور آکر مستقل آباد ہوگئے، آپ

کے بڑے بھائی منشی محمد علیم اللہ صاحب خیالیؔ مرحوم برہان پور کے مایہ ناز شعراء میں سے بلکہ استاذ الشعراء تھے، ریاضی صاحب قدم قدم پر برہان پور کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور راستہ چلتے ایک ایک پرانی چیز کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ ریاضی صاحب اونچے درجہ کے شاعر بھی ہیں۔ جناب جاوید انصاری برہان پوری بھی یہاں کی تاریخ کے ماہر اور عالم ہیں، ان کے مقالات ومضامین اس سلسلہ میں نکلتے رہتے ہیں۔ اپریل ۱۹۶۴ء کے ''معارف'' میں جامع مسجد برہان پور پر ایک نہایت قیمتی مقالہ سپرد کیا جس کا ہندی ترجمہ بھی شایع کر چکے ہیں، نیز موصوف نے ''سلک گہر'' کے نام سے برہان پور اور اطراف وجوانب کے قدیم شعراء کے حالات میں نہایت اچھی اور معلوماتی کتاب لکھی ہے، جاوید انصاری صاحب تاریخ برہان پور کی ترتیب کی دُھن میں لگے ہیں، آپ نے برہان پور کی مفصل تاریخ پر بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں، محترمی محمد اسمٰعیل صاحب فہمی بھی قدیم برہان پور کی کھلی ہوئی کتاب ہیں، اور یہاں کی پوری تاریخ سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں، آپ جاوید انصاری کے بڑے بھائی ہیں، ان کا خاندان شہر اعظم گڈھ کا رہنے والا ہے، ان کے مورثِ اعلیٰ شیخ سبحانی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد برہان پور آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اصل میں یہ خاندان مہراج گنج کا تھا، فہمی صاحب اچھے شاعر ہیں ''ریاضِ دانش'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام ۱۹۴۷ء میں شائع ہو چکا ہے، آپ نے ملا عبدالباقی نہاوندی کی کتاب ''مآثرِ رحیمی'' کا ترجمہ کیا ہے، عبدالرحیم خاں خانان نے تقریباً ۳۰؍ سال تک برہان پور میں رہ کر اسے اپنے علمی وادبی اور تعمیری ذوق کا مرکز بنا کر یہاں کی زمین کو آسمان پر پہونچایا، اسی کے اشارے پر ملا عبدالباقی نہاوندی نے برہان پور میں ''مآثرِ رحیمی'' جیسی ضخیم کتاب لکھی جس میں عبدالرحیم خاں خانان کے کارناموں کو بیان کیا، فہمی صاحب نے اس کی پہلی جلد کا ترجمہ مکمل کرلیا ہے، اگر پوری کتاب اردو

میں ترجمہ ہوکر چھپ جائے تو ہندوستان کے مغل دور کی نہایت قیمتی تاریخ ہوگی جس سے اس دور کے علمی، ادبی، فنی، ترقیاتی، تعمیری اور سرکاری کارناموں پر اچھی خاصی روشنی پڑے گی، آزاد ہندوستان میں اس قسم کی علمی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ برہان پور کی یہ چلتی پھرتی تینوں تاریخیں ریاضؔی، فہمؔی اور جاویدؔ یہاں کے قدیم خاندانوں سے نہیں ہیں بلکہ سوسوا سو سال پہلے انکے آباء واجداد مبارکپور اور اعظم گڈھ سے آکر یہاں آباد ہوگئے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان خاندانوں نے فقر وفاقہ اور غربت ومسافرت کی مصیبت میں علم وفن کی دولت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنے ساتھ شیرازِ ہند پورب کا علمی ورثہ بھی محفوظ رکھا، جس کے بارے میں مرحوم اقبال سہیؔل نے کہا ہے۔

اس خطۂ اعظم گڈھ پہ مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

اعظم گڈھ کے فاقہ مست اور مصیبت زدہ کارواں کی گرد کے ساتھ کچھ ذرے بھی آگئے تھے جو برہان پور کے آسمان پر چمکے۔

موجودہ عام حالات:

کسی شہر میں نو وارد مسافر کیلئے پورے طور پر حالات کا پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے، وہ اپنی اچٹتی نگاہوں سے ہر چیز کو دیکھتا ہے اور اپنے ذوق کے مطابق نظریہ قائم کرتا ہے، ایسے سیاحوں کی ڈائریاں تاریخ کی ترجمانی نہیں کرتی ہیں، بلکہ ان کے تاثرات وانطباعات کو پیش کرتی ہیں، مگر یورپ کے اہل علم وتحقیق اس معاملہ میں بڑے سادہ لوح یا بڑے مکّار ہوتے ہیں، وہ کسی اجنبی ملک کا دو چار ہفتے دورہ کرکے ضخیم کتاب تیار کرتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی دیکھی دکھائی چیزوں پر اپنا نظریہ قائم کرکے اسے ملک

کی قدیم اور روایاتی چیز بتاتے ہیں اور بعض مؤرّخ و مصنف ایسی کتابوں سے اقتباس لے کر استدلال کرتے ہیں، یہ یورپ کی مؤرّخانہ کمزوری اور سطحیت ہے کہ وقتی چیزوں کو دیکھ کر ان کو کسی ملک کی قدیم اور عام چیز بتایا جائے۔

برہان پور کے چار روزہ دورانِ قیام میں ظاہر ہے کہ ہم نے اسی طرح اس شہر کو دیکھا اور چند جلسوں اور تاریخی آثار کے علاوہ عام حالات سے ہمیں بہت کم سابقہ پڑا، پھر بھی اندازہ ہوا کہ یہاں عام حالات اچھے ہیں، آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے جس میں تقریباً چالیس ہزار مسلمان ہیں، ان میں بوہروں کی تعداد بھی تین چار ہزار ہوگی، یہاں لوگ امن وچین سے رہتے ہیں اور ہندؤں اور مسلمانوں میں بڑی حد تک اتفاق ہے، دعوتوں اور جلسوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں، نجی اور اجتماعی زندگی میں بھی عام طور سے تعلقات خوشگوار ہیں۔ اُردو زبان یہاں کے مسلمانوں کی عام زبان ہے، سرکاری طور سے بھی اس کا چلن ہے، بعض سرکاری عمارتوں پر ہم نے اردو کے بورڈ دیکھے، اسکول اور کالج میں عربی فارسی اور اردو کی تعلیم کا اچھا خاصا انتظام ہے یہ حکومت مدھیہ پردیش کا حسنِ انتظام اور ذمہ دارانہ کام ہے، مسلمانوں میں اونچی تعلیم کا رواج کم ہے، ہمارے علم میں عربی زبان کا صرف ایک مدرسہ فیض العلوم ہے جو ابھی دو سال ہوئے جاری ہوا ہے، ویسے دینیات کے کئی مکاتب ہیں۔ بوہروں کے حکیمیہ اور قادریہ ہائی اسکول ہیں، حضرات بواہیر کا یہ بڑا مقدس مقام ہے، ان کے کئی داعی اور امام اس سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں، اور ان کو اس شہر سے مذہبی تعلق ہے، عام طور سے شعر وادب کے چرچے اور مشاعرے زیادہ ہوتے رہتے ہیں، شعراء کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ شعر وادب میں خیالی برہان پوری اور راشد برہان پوری مرحومین کے تلامذہ کا حلقہ وسیع ہے۔ دینی علماء میں مولانا سید احکام اللہ صاحب بخاری، مولانا سید معین الدین صاحب اور مولانا امانت اللہ صاحب برہان پوری کے

علاوہ اور کسی مستند عالم کا علم نہ ہوسکا۔ مسلمانوں میں موجودہ تعلیم کا ذوق اور رواج ہے، بعض لڑکے امریکہ میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کررہے ہیں اور بعض دوسرے لوگ معلوم ہوا کہ وہاں پر کاروباری حیثیت سے مقیم ہیں۔

یہاں کے لوگ عموماً بااخلاق اور مروت والے ہیں، ادباء، علماء اور شعراء کے ساتھ شریفانہ انداز میں پیش آتے ہیں اور اہل علم کی قدر کرتے ہیں، میرے پہونچنے سے پہلے ہی میرے مزاج کے علی الرغم شاندار دعوتوں کا پروگرام چار دن کے لئے مرتب ہوچکا تھا اور مزید کو رد کردیا گیا، ناشتہ اور صبح وشام کے کھانے کی دعوتوں میں اعیانِ شہر کی تعداد اچھی خاصی رہتی تھی، اکثر پچاس پچاس آدمیوں سے زائد ایک ایک دعوت میں شریک ہوتے تھے، ایسے ہی صاف ستھرے ماحول میں پہونچ کر اجنبی اپنے کو اپنے وطن اور گھر بار میں پانے لگتا ہے۔ محترم ریاضی صاحب نے تو کہنا چاہئے کہ چار دن کیلئے اپنے کو وقف کردیا تھا، اور ذاتی و جماعتی ضروریات سے یکسو ہوکر رات دن ساتھ رہتے تھے کیوں کہ آپ برہان پور اور اطراف کے آثار و علائم کے ایک ایک نوک پلک کی تاریخ سے واقف ہیں۔ آپ میرے اس تاریخی سفر کے رہنما اور میرِ کارواں تھے، میرے اور ان کے ذوق کی ہم آہنگی نے ویرانوں اور کھنڈروں کو پُرفضا بنادیا۔

قیسؔ جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

قلعۂ برہان پور:

۱۱؍ربیع الاول اتوار کو طے شدہ پروگرام کے مطابق ناشتہ کے بعد ہی ہم لوگ دس بجے محترم ریاضی صاحب کی معیت میں تانگہ پر شہر کے بعض تاریخی مقامات دیکھنے گئے، سب سے پہلے حضرت شیخ بہاء الدین باجنؒ متوفی ۹۱۲ھ کے مزار پر فاتحہ

خوانی کی، آپ برہان پور کے بہت بڑے اولیائے کرام اور علمائے عظام میں سے ہیں ۱۲۲؍سال کی عمر میں انتقال فرمایا، محلّہ شاہ بازار میں مزار ہے، آپ کی عظمت وعلمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ حضرت شیخ علی متقی مکی صاحب کنز العمال اور شیخ عبد الوہاب متقی مکیؒ آپ سے فیض یافتہ ہیں، ہندی کے شاعر بھی تھے، آپ کی تصنیف خزانۂ رحمت کا قلمی نسخہ موجود ہے جس میں بہت سے ہندی زبان میں دوھے اور اشعار ہیں۔

شیخ بہاؤ الدین کے حظیرہ میں اور بھی بزرگانِ دین اور علمائے کبار کے مزارات ہیں، جن میں آپ کے صاحبزادے شیخ عبدالحکیمؒ بھی ہیں جن سے شیخ علی متقی نے پڑھا ہے، اسی احاطہ میں ایک عالیشان مسجد بھی موجود ہے جو شاہان فاروقیہ کے طرزِ تعمیر کی یادگار ہے، مسجد میں اسی زمانہ کا ایک بہت بڑے پلنگ کا ٹھاٹھ پڑا ہوا ہے جس پر بیک وقت پچاسوں آدمی بیٹھ سکتے ہیں، مسجد اور مزار کے احاطہ کے باہری دروازہ کے اوپر ایک کتبہ بھی ہے۔

ہم یہاں سے حکیم ارزانیؒ کے مزار پر پہونچے جو شہر کے دکھن جانب ایک مسجد کے صحن میں واقع ہے، یہ وہی حکیم ارزانی ہیں جو شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں تھے اور جن کی طب اکبری وغیرہ کتابیں اطباء اور حکماء کے کام آتی ہیں۔

اس کے بعد برہان پور کے شاہی قلعہ میں آئے، یہ قلعہ شہر کے جنوب مشرق میں دریائے تاپتی کے کنارے واقع ہے، دیوار کے قریب سے بہتا ہے، یہ شاہان فاروقیہ کی عظیم یادگاروں میں سے ہے، ان کا دارالسلطنت پہلے تال گڈھ تھا جہاں کئی فاروقی حکمرانوں کی قبریں بھی ہیں، بعد میں جب ۸۰۴ھ میں شاہ نصیر فاروقی نے برہان پور آباد کیا تو یہی مرکز قرار پایا، اس قلعہ کا اکثر وبیشتر حصہ گر گیا ہے، یہ اینٹ اور چونے کا بنا ہوا ہے، پتھر بھی لگے ہوئے ہیں، ان میں ایسے پتھر بھی ہیں جو بنائے گئے ہیں اور جس طرح آج کل ریت اور پتھر اور سمنٹ ملا کر لادیاں بنائی جاتی ہیں، اسی

طرح شاہانِ فاروقیہ نے پتھروں اور مسالوں سے بڑے بڑے پتھر بنائے ہیں، ان کی مضبوطی ابتک عام پتھروں کی طرح قائم ہے، یہ قلعہ کئی منزلہ ہے، اوپر کی چھت گرگئی ہے، نیچے کی منزلیں باقی ہیں، چھت میں عام طور سے برہان پور کی شاہی عمارتوں میں ساگوان کی شہتیریں استعمال کی جاتی تھیں، اس قلعہ کی چھت میں لکڑی کی کڑیاں ہیں، فاروقیوں کے بعد جب مغلوں نے قبضہ کیا تو اس کی مرمت اور تزئین وتحسین کی، قیمتی پتھروں اور نقش ونگار سے اسے مزین کیا، مٹی کے نلوں کے ذریعہ قلعہ کے اندر ہر منزل پر پانی پہونچایا گیا، دیواروں میں ابتک ان کے نشان اور سوراخ باقی ہیں، اس قلعہ میں جنوبی ہند کے بڑے بڑے حوادث ہوئے ہیں، شاہجہاں کی کئی اولادیں یہاں پر پیدا ہوئیں، شاہجہاں کی بیوی ممتاز محل کا انتقال زچگی میں اسی قلعہ میں ہوا تھا۔

سنہ ۱۰۴۰ھ میں شاہجہاں، خان جہاں لودی کی سرکوبی کیلئے برہان پور میں تھا، ان ہی ایام میں ۱۷/ذی قعدہ کو ممتاز محل کے بطن سے ایک بچی ہوئی، اسی کی پیدائش میں اس کا انتقال ہوا۔ وقتی طور سے اس کی لاش دریائے تاپتی کے مشرقی جانب زین آباد باغ میں آہوخانہ کے پاس دفن کی گئی، اس کے بعد اس کی لاش آگرہ میں لاکر تاج محل کے قریب ایک چبوترہ پر دفن کی گئی اور جب تاج محل تیار ہوگیا تو اس میں مستقل طور سے رکھی گئی۔

مغلوں کے بعد اس قلعہ پر آصفی حکمرانوں نے قبضہ کیا، اس وقت تک اس کی حالت اچھی تھی، مرہٹوں کے دور میں اس کی ویرانی مکمل ہوگئی، اس کا مُغْتَسَل (غسل خانہ) ابتک کسی نہ کسی حالت میں موجود ہے، پہلے اس کی عمارت میں میونسپلٹی کے دفاتر تھے، مگر اب محکمہ آثارِ قدیمہ نے اپنے قبضہ میں لے لیا ہے، چونکہ بند تھا اس لئے ہم اس عجائب خانہ کو نہ دیکھ سکے، قلعہ کی ہر منزل میں مشرقی سمت کے جنوبی وشمالی کمرے اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ درمیان کے کمرے میں قبلہ رُخ محراب نما بنادیا

گیا ہے تا کہ بوقتِ ضرورت اسی میں نمازِ باجماعت ادا کی جاسکے، مسجد البیت کا یہ تصور برہان پور کی بعض دوسرے عمارتوں میں بھی پایا جاتا ہے، اس سے یہاں کے فاروقی حکمرانوں کے ذوقِ عبادت اور دینی جذبہ کا پتہ چلتا ہے۔

وہاں سے جہانگیری سرائے میں گئے جسے شہنشاہ جہانگیر نے بنوایا تھا، اب اس میں بعض سرکاری دفاتر ہیں اور پورا احاطہ ویران نما ہے، اس کے صدر دروازہ پر جہانگیر کے نام کا کتبہ موجود ہے، اسی کے سامنے دکھن جانب آصفی دور کی ایک عظیم الشان مسجد ہے جس کے دونوں میناروں کے کلس سونے کے ہیں اور صبح وشام اور چاندنی راتوں میں چمکتے ہیں۔

جامع مسجد برہان پور:

اس کے بعد جامع مسجد برہان پور میں حاضری ہوئی جو ہندوستان میں اپنے طرز کی ایک ہی مسجد ہے، ملا عبد الباقی نہاوندی نے ''مآثرِ رحیمی'' میں اس مسجد کو دکن کی عالیشان اور عجیب عمارت قرار دیا ہے، قاضی خان نے ''منتخب اللباب'' میں اسے خوبی میں دہلی کی جامع مسجد کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے، اسے خاندیش کے ممتاز فرمانروا عادل شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نے ۹۷۷ھ تا ۱۰۰۲ھ یعنی ۵ر سال کے عرصہ میں تعمیر کرایا ہے۔ سیاہ مضبوط پتھروں کی اس عظیم الشان مسجد میں چوڑائی میں پانچ ستون اور لمبائی میں پندرہ ستون ہیں، اس کا طول اندر سے ۱۴۸ر فٹ اور عرض ۵۲ر فٹ ہے، چھت کی بلندی ۱۵ر فٹ ہے۔ اس کا ہر ستون ایک ہی پتھر کو تراش کر منقش کیا گیا ہے، اگر کہیں جوڑ ہے تو چونا اور مسالہ نظر نہیں آتا، اسے بغیر چھت کی مسجد کہا جاتا ہے کیونکہ چھت اوپر سے ہموار اور اندر سے محرابی ہے، اندر سے ہر ستون کے بالائی حصہ کو محرابی خم دے کر اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ ہر طرف محراب ہی محراب بن گئی ہے اور اوپر چھت قائم ہوگئی ہے، فولاد کی طرح سخت کالے پتھروں پر منبت کاری کے جو باریک اور اعلیٰ نمونے اس

مسجد میں ہیں، ان کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی ۔ باریک سے باریک تر نقش ونگار اور بیل بوٹے میں کیا مجال کہ کہیں سے کوئی نقص اور خامی نظر آئے، مسلمانوں نے فنونِ لطیفہ کی تمام توانائی کو مساجد کے نقش ونگار میں لگا دیا ہے، اس کی شہادت اس مسجد کے نقش ونگار سے بھی مل سکتی ہے، ان کو دیکھ کر عقل حیران اور دنگ رہ جاتی ہے کہ کن ہاتھوں اور کن آلات کی مدد سے ان کو بنایا گیا ہے، مسجد میں متعدد کتبے ہیں جن میں سے تین عہدِ فاروقی کے ہیں، آیات واحادیث کو محراب میں نہایت خوبی سے نقش کیا گیا ہے، مسلمان بادشاہوں کی رواداری کے نقوش ان کی مسجدوں تک میں ابتک موجود ہیں، چنانچہ جامع مسجد برہان پور میں بھی سنسکرت زبان اور خط میں ایک کتبہ موجود ہے جس میں ۱۶۴۶ھ بکرمی درج ہے۔

صحن کی طرف مسجد کے جنوبی مینار کی دیوار میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے ایک کتبہ کندہ کیا گیا ہے، جس میں اس کے گجرات فتح کر کے لاہور جانے کا تذکرہ ہے، عبدالرحیم خان خاناں نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ میں ۱۰۲۴ھ میں جب شہر میں آب رسانی کا انتظام کیا تو اس مسجد تک زمین دوز نہروں کے ذریعہ مٹی کے نلوں سے پانی لایا گیا ہے۔ برہان پور کی جامع مسجد اپنی تراش خراش اور نوک پلک میں ایک ہی عمارت ہے، اس پر مستقل مقالہ جناب جاوید برہان پوری نے اپریل ۱۹۶۴ء کے رسالہ معارف میں شایع کیا ہے، اور ہندی میں بھی اس پر ایک کتاب لکھی ہے۔

مدرسہ فیض العلوم:

آج کی تاریخی سیر یہیں پر ختم ہوگئی، ظہر میں مولانا سید احکام اللہ صاحب بخاری کے یہاں حاضری ہوئی، وہاں سے ہم لوگ مدرسہ فیض العلوم میں پہونچے جہاں عربی فارسی اور دینیات کی اونچی تعلیم ہوتی ہے، یہ برہان پور میں عربی کا سب سے بڑا مدرسہ ہے جو دوسال پہلے قائم ہوا ہے، اس کے ناظم جناب ریاضی صاحب

ہیں، شرح وقایہ اور قدوری تک کے طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ بیرونی طلبہ کے قیام وطعام کا بھی انتظام ہے، میں نے عربی درجہ کے تقریباً ہر طالب علم کا امتحان لیا، طلبہ ماشاء اللہ ہونہار ہیں، مدرسین اخلاص ومحنت سے تعلیم وتربیت میں دلچسپی لیتے ہیں۔ شہر کے ہر طبقہ کے مسلمان اس مدرسہ کی سرپرستی کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ حفظ وقرأت، عربی و فارسی، اردو اور دینیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کا شعبہ بھی قائم ہے، دن کے علاوہ رات میں بھی تعلیم ہوتی ہے جس میں کام دھندے والے بڑے اور بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، مدرسہ کی اچھی حالت دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دینی تعلیم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کرنے کی توفیق دے۔ اس سال اس مدرسہ کا کل خرچ ۵۶۰۷/ روپئے ہے۔

آسیر گڈھ:

۱۱/ ربیع الاول کا آخری پروگرام جلسۂ سیرت کا تھا جو ہندوستانی مسجد کے صحن میں دس بجے رات سے شروع ہوا، صدارت مولانا سید معین الدین صاحب پروفیسر سیوا سدن کالج برہان پور نے فرمائی، میں نے کم وبیش ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی، کسی اور صاحب کی تقریر نہیں تھی، چونکہ میں واعظ ومقرر اس معنیٰ میں نہیں جو عوام کے لئے جاذبیت کا باعث ہو، اس لئے زیادہ لمبی تقریر نہ کرسکا، حالانکہ غالباً لوگ مزید کے منتظر تھے، اس تقریر کا خلاصہ انقلاب کے نامہ نگار جناب ظفر پرویزی صاحب نے اخبارات کو روانہ کردیا تھا جو انقلاب میں آگیا۔

۱۲/ ربیع الاول دوشنبہ کو طے شدہ پروگرام کے مطابق آسیر گڈھ اور اس کی جامع مسجد دیکھنے جانا تھا اس لئے صبح سویرے ہی ایک جیپ کے ذریعہ روانہ ہوئے، ریاضی صاحب، جاوید صاحب، حاجی یحییٰ زبیر صاحب، بابو افتخار صاحب اور ان کے گھر کے کچھ لڑکے بھی ساتھ تھے، آسیر گڈھ برہان پور سے شمال کی طرف ۱۲/ میل پر

تقریباً ایک ہزار فٹ بلند پہاڑ پر وہ سنگین قلعہ ہے جو جنوبی ہند کی جنگی اور سیاسی زندگی میں ہر دور میں دل بنا رہا ہے، اور یہاں کی حکمرانی کی تاریخ میں اسے بڑی عظمت و اہمیت حاصل ہے، سلاطینِ فاروقیہ اور شاہان مغلیہ نے اس پر اپنی فوجی طاقت خرچ کی ،اور انگریزوں نے اسے اپنا مرکز بنایا، جنوبی ہند میں آسیر گڈھ ہر حکمراں طاقت کی فتح وشکست کا نشان بنا رہا ہے، قلعہ تک پہونچنے کیلئے ہموار و ناہموار راستہ اوپر چلا گیا ہے، ہم جیپ پر قلعہ کے دروازے تک گئے ،قلعہ کیا ہے؟ پہاڑ کی چوٹی پر پہاڑ ہے، اندر سوائے جامع مسجد اور مندر اور بعض گری پڑی عمارتوں کے اب کچھ نہیں ہے، سنا ہے کہ انگریزوں کے دور تک اس کے اندر باہر بڑی چہل پہل رہا کرتی تھی اور وہ اس میں فوجیں رکھتے تھے جس سے نیچے اوپر آبادی اور رونق تھی، اس کے اندر وہ جیل خانہ بھی ہے جس میں مغلوں کے زمانے میں سرکاری مجرموں کو بھاری سزا دی جاتی تھی اور گویا وہ اسی میں عبور دریائے شور کی سزا بھگتتے تھے، قلعہ کا پورا گھیرا ویران ہے البتہ اس کی مسجد ابتک اچھی حالت میں ہے، یہ مسجد ۹۹۷ھ سے پہلے فاروقی دور میں ۴؍سال کی مدت میں بن کر تیار ہوئی، غالباً عادل شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نے اس کی بھی تعمیر کرائی ہے۔

قلعہ کا دروازہ اس طرح سنگین دیوار سے گھرا ہوا ہے کہ باہر کسی طرف سے دروازہ نظر نہیں آتا، دروازہ کے سامنے نیچے اترنے کا زمین دوز راستہ ہے، اس سے کچھ دور نیچے اتر کر دشمن کی فوج کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ دروازہ کے باہر قلعہ کی سنگین دیوار میں اکبر، شاہجہاں اور عالم گیر کے یادگاری کتبے پتھروں میں کندہ ہیں، اکبر کے زمانہ کے کتبہ کی عبارت وہی ہے جو جامع مسجد برہان پور کے مشرقی جنوبی مینارہ کی دیوار میں کندہ ہے۔ دونوں کا کاتب معصوم بھکّری ہے۔

جس وقت جیپ تیزی سے آسیر گڈھ جاتے ہوئے پہاڑی سڑک کے نشیب

وفراز اور کجی سے گزر رہی تھی، دور سے پہاڑ کی بلندی پر آسیر گڈھ کے اندر کی مسجد کے مینارے نظر آئے، ان کو دیکھتے ہی بے ساختہ زبان پر یہ شعر آ گیا۔

اذاں دی کعبہ میں، ناقوس دَیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پُکار آیا

اس پر ریاضی صاحب نے کہا کہ جی ہاں اس قلعہ میں اس مسجد ہی کی طرح ایک قدیم اور شاندار مندر بھی ہے، اس قلعہ میں ہمارے دیکھنے کی بس یہی ایک چیز مسجد تھی، جو جامع مسجد برہان پور سے پہلے بنائی گئی، یہ مسجد پہاڑ کی چوٹی پر قلعہ کے اندر رہ کر بھی بلند جگہ پر بنائی گئی ہے، اور قبلہ رُخ کی دیوار کے تمام دَر باہر کی طرف کھلے ہوئے ہیں کیونکہ کسی کے سامنے سے گزرنے کا احتمال نہیں ہے۔ مسجد کی قبلہ کی دیوار کی محرابوں کا کھلا ہونا پہلی مرتبہ نظر آیا اور فقہی اعتبار سے اس کا مقصد بھی سمجھ میں آ گیا کہ اگر سامنے سے کسی کے گزرنے کی صورت نہ ہو تو ایسا کرنا معیوب نہیں ہے، اس مسجد کے صحن میں جنوب کی طرف ابتک وضوخانہ اور آب رسانی کے حوض موجود ہیں، سخت حیرت ہے کہ کئی سو سال پہلے اس بلند پہاڑ پر کہاں سے اور کیسے پانی جاری کیا گیا، قلعہ کے باہر پہاڑ پر ایک عیدگاہ بھی نظر آتی ہے جو قلعہ سے نیچے ہے۔

آسیر گڈھ کے آس پاس اور نیچے کسی زمانہ میں بارونق شہر تھا اور یہاں اپنے وقت کے بڑے بڑے لوگ رہتے تھے، چنانچہ اسی مقام پر شمال مغرب میں ایک ٹیکری پر میر نعمانؒ کا مزار ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ حافظ شیرازی کے صاحبزادے ہیں، نیز ان کے مزار سے متصل اور بھی بہت سے مزارات ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ یا صاحبِ حیثیت کے ہیں، اسی کے قریب ایک نہایت قدیم مندر بھی ابتک موجود ہے، اندر بیل کا بت اسی پرانے انداز میں رکھا ہوا ہے، یہ مندر فاروقیوں کے دور کا ہے۔ آسیر گڈھ کے اندر اور اس کے باہر مندر کا وجود فاروقیوں اور مغلوں کی رواداری اور

سیر چشمی کی کھلی دلیل ہے۔

شاہانِ فاروقیہ کا قبرستان:

آج ہی ۴؍ بجے شام کو شہر کے باہر شمال مشرقی آثار و علائم کی سیر بھی رہی، جن میں زیادہ تر فاروقی بادشاہوں اور امرائے سلطنت اور علماء و اولیاء کے مزارات ہیں، پورا خطہ بڑی عبرت کا مقام ہے، خاص طور سے وہ حظیرہ جس میں چھ سلاطین فاروقیہ اور ان کی بیگمات کی قبریں ہیں۔ اس احاطہ کے باہر بھی بہت سی پرانی قبریں ہیں جن میں کئی پرتگیزی اور یورپین لوگوں کی ہیں، وہ پچھّم پورب بنی ہیں، اور ان پر رومن حروف میں نام اور مرنے کی تاریخ وغیرہ درج ہے، یہ ان سرکاری قسم کے لوگوں کی قبریں ہیں جو یورپ کی حکومتوں کی طرف سے شاہان فاروقیہ کے دربار سے وابستہ تھے، یا ہندوستان میں مستقل قیام کر کے فاروقی حکومت سے متعلق تھے، یہ فاروقیوں کی سیر چشمی ہے کہ انھوں نے یورپ کے لوگوں کو بھی اپنے شاہی قبرستان کے پاس دفن کیا کرایا۔

آس پاس کے مزارات میں شمال کی جانب حضرت شیخ عبداللطیف برہان پوریؒ کا مزار ایک قبہ کے اندر ہے، آپ بڑے متشرع تھے، اور قبر پرستی وغیرہ سے بہت بیزار تھے۔ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری قبر پر قبہ نہ بنایا جائے اور نہ وہ پختہ بنائی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم دین اور محافظِ شریعت کی بات یوں رکھی ہے کہ معمولی قبہ کے اندر قبر ہونے کے باوجود اس کا تعویذ باقی نہیں ہے، قبہ موجود ہے مگر تعویذ دست بردِ زمانہ سے ختم ہو گیا، ہم نے اسی قبہ کے گھیرے میں فاتحہ پڑھی، آپ کے قریب کہیں حضرت شیخ محمد فاخر صاحب زائر الہ آبادی متوفی ۱۱۳۰ھ کا مزار بھی ہے، آپ حج کیلئے جا رہے تھے کہ برہان پور میں بیمار پڑ گئے اور وصیت کی کہ اگر میری موت واقع ہو جائے تو مجھے حضرت شیخ عبداللطیف برہان پوری کے قریب دفن کیا جائے، کیونکہ یہ

مقام اہل زمانہ کی بدعات اور قبر پرستی کی رسم سے محفوظ ہے۔

۱۲؍ربیع الاول کو برہان پور میں بڑی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے اور اطراف وجوانب کے مرد اور عورتیں، بچے شہر میں کھنچ آتے ہیں اور حضرت شیخ نظام الدین بھکاری علیہ الرحمہ کے عرس میں شریک ہوتے ہیں اور وہیں ندی کی ریت پر مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے، اس تقریب میں وہ طوفان اٹھتا ہے جو مردوں اور عورتوں کی بھیڑ بھاڑ میں ہوا کرتا ہے، اس طوفانِ بدتمیزی میں کسی شریف آدمی کی گنجائش نہیں ہوتی، معلوم نہیں یہاں اس دن مغرب کی نماز خاص طور سے پڑھنے کی کیا وجہ ہے؟ جس میں شریک ہونے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ محمد بن فضل اللہ:

۱۳؍ربیع الاول کو برہان پور کے اولیاء اور علماء ومشائخ کے آثار وعلائم دیکھنے کے لئے حصار کے باہر مغربی سمت ویرانوں میں گئے، جہاں محدثین ومشائخ کے مزارات ومقابر دین وایمان اور علوم وفنون کو اپنے پہلو میں دفن کئے ہوئے ہیں۔

ان میں حضرت شیخ مولانا محمد بن فضل اللہ برہانپوریؒ متوفی ۲؍رمضان ۱۰۲۹ھ کا مزار بھی واقع ہے، آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خاندان سے ہیں، جونپوری اور برہان پوری کی نسبت سے مشہور ہیں، ہندوستان سے علم وروحانیت کا اکتساب کرکے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ۱۲؍سال مقیم رہے اور حضرت شیخ علی متقی برہان پوری مکی صاحب کنز العمال سے اکتسابِ فیض کیا، پھر احمد آباد آکر حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے علم حاصل کیا، آخر میں برہان پور تشریف لائے اور یہاں درس وتدریس اور تعلیم وتعلم میں ہمہ تن مشغول ہوگئے، آپ کا حال علامہ محمد بن فضل اللہ یحییٰ شامی نے ''خلاصة الأثر في اعيان القرن الحادي عشر '' میں لکھا ہے۔

آپ علم وفضل میں امامت کے درجہ پر فائز تھے، اور ہندوستان میں اور بیرونِ

ہندوستان میں بڑی مقبولیت وشہرت کے مالک تھے، روزانہ شام کو دن بھر کے کاموں کا محاسبہ فرماتے تھے، ہر وقت موت کے انتظار میں رہا کرتے تھے، ان کی تصانیف میں شرح الدعا السیفی، الوسیلہ الیٰ شفاعۃ النبی، شرح لوائح جامی، رسالہ معراج اور ہدیہ مرسلہ ہے۔ ہدیہ مرسلہ الیٰ النبی کی شرح الحقیقۃ الموافقۃ للشریعۃ کے نام سے لکھی، ایک کتاب التحفۃ المرسلۃ کے نام سے بھی آپ کی تصانیف میں ہے۔آپ کی تاریخِ وفات ''ابن فضل اللہ '' ہے،آپ کا مزار ایک قبہ کے اندر ہے،آس پاس اور بھی بزرگوں کے مزارات ہیں، قبہ کی مغربی سمت ایک بہت بڑی مسجد ہے جو آپ کی خانقاہ اور مدرسہ سے متعلق تھی اسی سے متصل جنوبی سمت میں ایک عالیشان مسجد تھی جس کی چھت وغیرہ گرگئی ہے، صرف چہار دیواری خستہ حالت میں باقی ہے اور اس طرح کی بہت سی مسجدیں اطراف وجوانب میں ہیں کہ ان کی چھت گرگئی ہے اور دیواریں کھڑی ہیں کیوں کہ برہان پور کی عمارتوں کی چھت میں لکڑی لگائی جاتی تھی، مرورِ دہور سے لکڑیاں خراب ہوگئیں تو چھتیں بھی گرگئیں۔ ان میں سے ایک مسجد کی جناب فہمی صاحب نے اپنی نگرانی میں مرمت کرائی ہے اور چھت وغیرہ نئی بنوائی ہے، ان کا پروگرام ہے کہ اسی کھلے میدان میں مدرسہ قائم کرکے طلبہ اور مدرسین کے رہنے کا انتظام بھی یہیں کیا جائے۔

راقم نے جب بھی شاہانِ ہند اور بزرگوں کے مقابر ومزارات کی وسیع وعریض عمارتوں اور کھلی جگہوں کو دیکھا تو معاً یہی خیال آیا کہ اگر مسلمان ان عمارتوں اور زمینوں کو اسلامی مدارس اور دینی اداروں کیلئے استعمال کریں تو ان سے بہت کچھ فائدہ ہوسکتا ہے اس طرح ان کے بانیوں کو ثواب بھی مل سکتا ہے اور آج کے مسلمان اپنے اسلاف سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔

آخری مصروفیات:

برہان پور ۱۳؍ربیع الاول کا دن نسبۃً زیادہ مصروف گزرا، ۴؍بجے ٹاؤن ہال میں ’’پیغمبر اسلام اور امن عالم‘‘ کے عنوان پر ایک ملے جلے جلسے میں تقریر ہوئی، جس میں شہر کے سیاسی، علمی اور سربرآوردہ طبقے کے لوگ زیادہ تھے، ایک گھنٹہ سے زیادہ ہی اس موضوع پر تقریر کی جس کا اقتباس جناب ظفر پرویز صاحب نے اخبارات میں دیدیا تھا، وہاں سے نکل کر مغرب سے پہلے جنتا لائبریری کے معائنہ اور چاءنوشی سے فراغت حاصل کی، اور عشاء کی نماز کے بعد ہندوستانی مسجد میں تبلیغی اجتماع میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ خالص دینی موضوع پر تقریر کی جس میں روز مرّہ کی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر زور تھا۔

۱۴؍کو محل گوڑاڑہ کی سیر، یہ برہان پور سے دس بارہ میل دور مشرق میں واقع ہے، یہاں پر ایک ندی ہے جس پر شاہجہاں نے بند باندھ کر اس کا پانی اپنی شکارگاہ آہوخانہ تک زمین دوز نہر کے ذریعہ دس بارہ میل دور تک پہونچایا تھا، بند کی جگہ نہایت خوشگوار ہے، تالاب کی شکل میں بیچ دریا میں پانی جمع کیا گیا ہے، اور اس کے دونوں طرف مشرق و مغرب میں شاندار عمارتیں بنی ہیں جو غالباً اس کے عملہ اور محافظوں کے رہنے کیلئے تھیں، دونوں طرف کی عمارتیں دومنزلہ ہیں اور ان میں بھی پچھّم کی دیوار میں محراب نما طاق بنا ہوا ہے، تاکہ اسی میں نماز باجماعت بھی ادا ہو سکے، چھت پر بھی اس کا اہتمام کیا گیا ہے، وہاں سے واپسی پر کھانے کے بعد ادبی سوسائٹی کے افتتاح میں شرکت کی جس کے سکریٹری جناب جاوید انصاری ہیں، اس کا مقصد ادبی اور شعری مجلسیں منعقد کرنا، مقالات تیار کرنا اور ادبی تخلیقات کو شایع کرنا ہے، اس کے ماتحت ایک شبینہ مدرسہ برہانیہ بھی چلتا ہے جس میں کئی مدرس پڑھاتے ہیں۔ اس تقریب میں شہر کے اعیان موجود تھے۔

اسی دن رات میں واپسی ہوئی، باوجود روکنے کے اسٹیشن تک کئی حضرات آئے

اور ۹ر بجے پٹھان کوٹ اکسپریس پر سوار کر کے پھر آنے کی درخواست کی اور بار بار اصرار کیا کہ بمبئی سے وطن آتے جاتے میں ان لوگوں کو خبر دیا کروں تا کہ وہ آکر ملاقات کرلیا کریں۔ میں اس زحمت دہی سے انکار کرتا رہا مگر زیادہ اصرار پر دبی زبان میں اقرار کرلیا۔ (''البلاغ'' بمبئی، دسمبر ۱۹۶۵ء)

☆☆☆☆☆☆☆

بمبئی سے بھٹکل تک

ایک دینی اور علمی سفر (اکتوبر ۱۹۶۷ء)

تین سال قبل ریاست میسور کے مشہور ساحلی شہر بھٹکل میں جامعہ اسلامیہ کی تاسیس کے سلسلے میں حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی معیت میں ایک سفر ہوا تھا اور اسی زمانہ میں یہ سفرنامہ مرتب ہو گیا تھا، چونکہ یہ سفر کئی وجوہ سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی رودادِ سفر بھی علمی و تاریخی ہے، اس لئے ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔

بھٹکل اور وہاں کا سفر میرے لئے بالکل نیا تھا مگر یہاں کے دوست احباب سے پندرہ سال سے زائد سے علمی اور دینی تعلق و تعارف ہے، اور محبّ گرامی الحاج محی الدین منیریؔ اور عزیز گرامی الحاج مختار احمد جاوید سلّمہٗ سے برادرانہ تعلقات ہمیشہ بڑے خوشگوار رہے ہے، ان حضرات نے بار بار بھٹکل آنے کی دعوت دی، اور میرے گھر مبارکپور میری عدم موجودگی میں سہی حاضری دے کر اپنے تقاضے میں اچھا خاصا زور پیدا کر لیا تھا۔ ''انقلاب'' اور ''البلاغ'' کے علاوہ بنگلور کے اخبار ''پاسبان'' کے ذریعہ بھٹکل اور ریاست میسور کے بہت سے حضرات غائبانہ تعلق بھی رکھتے ہیں، کیونکہ ''پاسبان'' میں انقلاب اور البلاغ سے میرے مضامین کے اقتباسات شائع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے غائبانہ محبت رکھنے والے بھی چاہتے تھے کہ میں ان سے مل لوں،

الحمد للہ کہ جب یہ سفر ہوا تو اس اعتبار سے بہت کامیاب رہا کہ اس کا مقصد ایک مدرسہ کی تاسیسی تقریب تھا، دوسرے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب زید مجدہٗ کی معیت و رفاقت بھی رہی، تقریباً ۸۲/ گھنٹے کا یہ سفر شروع سے آخر تک بڑا

خوشگوار اور حسین وجمیل رہا، یکم رجب المرجب ۱۳۸۷ھ، ۶/ اکتوبر ۱۹۶۷ء جمعہ کے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے سانتا کروز کے ہوائی اڈے سے شروع ہوا اور ۴/ رجب ،۱۰/ اکتوبر دوشنبہ کی شام کو پانچ بج کر پچاس منٹ پر اسی مقام پر ختم ہوا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب، مولانا محمد الحسنی مدیر مجلّہ ''البعث الاسلامی''، لکھنؤ اور راقم ہمسفر تھے، یہ کارواں اس لئے بھی بہت مبارک تھا کہ حدیث میں آیا ہے کہ کم ازکم تین آدمی مل کر سفر کرو، تین آدمیوں سے جماعت بن جاتی ہے، اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ رہتا ہے۔

راقم نے جب کسی تاریخی مقام کا سفر کیا ہے تو ناظرین کرام کو اس کی علمی و تاریخی سیر کرائی ہے۔ چنانچہ آج بھی ایسا ہی ایک تاریخی اور علمی دینی سفرنامہ پیش خدمت ہے، ہم سفر سے لوٹے تو قلم کا مسافر اپنا سفر شروع کر رہا ہے۔

چل مرے خامہ بسم اللہ:

ٹکٹ وغیرہ کا انتظام مکمل کر کے منیری صاحب جامعہ اسلامیہ کے جلسہ کے انتظامات کے سلسلے میں بھٹکل چلے گئے، مولانا علی میاں صاحب جمعرات کو دہلی سے بمبئی آ گئے، ان کو ۱۷/ اکتوبر کو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس میں شریک ہونا تھا مخلصین ومحبین نے ہوائی اڈے پر ان کا استقبال کیا جن میں بھٹکل کے سرگرم کارکن حضرات بھی تھے، جمعہ کو سات بجے ہم لوگ ہوائی اڈہ کو روانہ ہوئے، اس وقت بھی یہ حضرات ہوائی اڈہ پر پہونچے، میں نے مولانا سے کہا کہ ہوائی جہاز کا یہ میرا پہلا سفر ہے جو الحمدللہ کہ آپ کی معیت میں ہو رہا ہے، مولانا نے برجستہ فرمایا کہ اب آپ کو ہوائی سفر زیادہ کرنے پڑیں گے، تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز بیلگام کے ہوائی اڈہ پر اترا، جس کی تاریخی عظمت اور اسلامی یادگار کی گفتگو اوپر ہی سے ہو رہی تھی، میں یہاں اب سے چند سال پہلے آ چکا تھا اور ہیرے باگے واڑی، بیلگام، مانا پور اور خانہ

پور کے جلسوں میں شرکت کر چکا تھا، مولانا بھی مجلس مشاورت کے دورے کے سلسلے میں یہاں آچکے تھے، اس شہر کی عظمتِ رفتہ پر فضا میں بات چیت ہوتی رہی، اسی حال میں جہاز زمین پر اترا تو ہم لوگ بھی اتر کر نیچے آئے، مولانا نے یہ مصرعہ پڑھا،

سلامٌ علیٰ نجدٍ و من حلّ بالنجد

سرزمینِ نجد اور باشندگانِ نجد کو سلام ہو

چند منٹ کے بعد یہاں سے جہاز اُٹھا اور گوا کے اوپر سے گزرتا ہوا کبھی سمندر کے اوپر کبھی پہاڑی ساحل کے اوپر اُڑ رہا تھا، اور تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد منگلور کے ہوائی اڈہ پر اترا، جو ہمارے ہوائی سفر کی آخری منزل تھا، یہاں منیری صاحب اور سید احمد صاحب وغیرہ موجود تھے، یہاں سے شہر منگلور بیس بائیس میل کے فاصلے پر ہے، جمعہ کا وقت قریب تھا، یہیں وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر منگلور کیلئے روانگی ہوئی تا کہ نمازِ جمعہ وہاں کی جامع مسجد میں ادا کی جائے، جب ہم لوگ جامع مسجد میں داخل ہوئے تو امام صاحب پہلا خطبہ پڑھ رہے تھے، مولانا علی میاں صاحب نے نماز کے بعد مختصر سی تقریر بھی فرمائی، اس کے بعد کھانا کھایا گیا اور تین بجے بھٹکل کیلئے روانگی ہوئی، بھٹکل شہر منگلور سے ایک سو سے زائد میل پر واقع ہے، سڑک مناسب ہے، پورا راستہ سبزہ زاروں سے ''شہر نگاراں'' ہے، سبز پوش پہاڑوں میں سڑک کا گھماؤ اور نشیب و فراز ہم یوپی والوں کے لئے بڑا ہی جاذب قلب و نگاہ ہے۔

منگلور سے چل کر سب سے پہلے ''اڑپی'' نامی بستی آئی، یہاں بازار اور دوکانیں بارونق ہیں، خاص طور سے بعض ہوٹل بہت صاف ستھرے اور جدید طرز کے ہیں، ایک ہوٹل میں مشروباتِ باردہ کا مشغلہ رہا، پھر یہاں سے چل کر ''کنداپور'' پہونچے، یہاں ایک مسجد اور ایک مدرسہ غوثیہ ہے، مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، مسجد میں عصر کی نماز پڑھی گئی جو دریائے گنگاؤلی کے کنارے پر واقع ہے، یہ دریا

بہت چوڑا ہے اور تھوڑی دور جا کر سمندر میں مل گیا ہے، نماز پڑھ کر ہم لوگ ہوڑی پر جا بیٹھے، ابر چھایا ہوا تھا کچھ کچھ ترشح ہو رہا تھا، چونکہ کشتی گھما پھرا کر چلائی جاتی تھی اس لئے آدھ گھنٹہ سے زائد میں دوسرے کنارے پر پہونچے، جہاں مولانا عبد الحمید صاحب ندوی مدرس جامعہ اسلامیہ، عزیزی مختار احمد جاوید اور دوسرے کئی حضرات جن کے نام یاد نہیں رہے موجود تھے، یہاں سے فوراً روانگی ہوئی کیونکہ مغرب کی نماز آگے کی بستی ''بیندور'' نامی میں ادا کرنے کا ارادہ تھا، یہاں سے دوسری کار پر روانگی ہوئی، جو راستہ میں اکثر رک جاتی تھی، اور اتر کر کچھ بنانا پڑتا تھا، اسی دوران تند و تیز بارش کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور کافی دیر کے بعد ہم لوگ بیندور پہونچے، مغرب کی نماز وہاں کی مسجد میں ادا کی گئی، مقامی حضرات نے چائے وغیرہ سے تواضع کی، پھر اسی حال میں آگے چلے، اندھیری رات، موسلا دھار بارش، بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک، اس پر رَہ رَہ کر موٹر کا خراب ہونا، ہم غریب الدیار مسافروں کو حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد دلا رہا تھا۔

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجرٖیھا و مُرساھا

حالانکہ اس سے تھوڑی ہی دیر پہلے پہاڑی سبزہ زاروں کی حسین شام ہمیں حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد دلا رہی تھی، ؎

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آب رکنا باد وگل گشت مصلیٰ را

بیندور سے روانگی پر بارش ذرا تھمی، تقریباً ۹؍ بجے ہم لوگ آدمیوں کی غیر معمولی بھیڑ بھاڑ میں چلنے لگے، معلوم ہوا کہ سوادِ بھٹکل آ گیا اور لوگ فرطِ محبت میں یہاں تک استقبال کیلئے آ گئے ہیں، آگے بڑھے تو لڑکوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں

کا ایک جم غفیر عقیدت ومحبت کی پوری توانائیوں کے ساتھ چاروں طرف سے موٹر کے گرد جمع ہوگیا اور نعرۂ تکبیر، نصرٌ من اللہ وفتح قریب ، اسلام زندہ باد، اور علمائے کرام زندہ باد کی بے پناہ گونج سے بستی معمور ہوگئی ، اللہ اکبر! اب تک مسلمانوں میں دین اور علمائے دین سے شغف کا یہ عالم پایا جاتا ہے، جیسے ہم لوگ اسلامی ہند کے شاندار ماضی میں پہونچ گئے ہیں، جس میں دین وایمان کی تمام قدریں مسلمانوں میں موجود ہیں، مہمانوں کو موٹر سے اتار کران سے سلام ومصافحہ کیا گیا، اور جلوس کی شکل میں کچھ دور تک یہ کارواں چلا، تقریباً پورا مجمع عصر کے بعد سے سراپا ذوق وشوق بنا ہوا سڑکوں پر بھیگتا رہا اور شرابور ہونے کے باوجود اس کے اخلاص وعقیدت کی حرارت باقی رہی، علمائے دین اور دینی جلسوں کے سلسلے میں آج کا یہ مجمع دیکھ کر ہمیں اپنے بچپن کا دور یاد آ گیا جبکہ ہمارے مدرسہ (احیاء العلوم مبارکپور) کے سالانہ جلسے مولانا شکر اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے زیر انتظام ہوا کرتے اور اسٹیشن سے لے کر مبارکپور تک تین میل کا راستہ عقیدت ومحبت کی بھیڑ بھاڑ اور نعروں کی آواز سے معمور رہا کرتا تھا، اور ہندوستان کے چیدہ چیدہ علماء اور بزرگانِ دین کا استقبال ہوتا تھا، سیاسی جلسوں جلوسوں کی بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ آرائی کا مظاہرہ تو عام بات ہے مگر خالص دینی اور ایمانی تقریبات میں یہ والہانہ انداز بہت دنوں کے بعد نظر آیا، اس مجمع میں سرمایہ دار، تجار، اہل علم، عوام، بوڑھے، جوان، بڑے، بچے، جامعہ اسلامیہ اور ہائی اسکول کے طلبہ واساتذہ سب ہی طبقے اور حلقے کے لوگ موجود تھے، اللہ تعالیٰ اس ظاہری مظاہرے میں باطنی توانائی عطا فرمائے اور سیاسی جلسے جلوسوں کی بھیڑ بھاڑ کی طرح یہ مظاہرہ بے معنیٰ بن کر نہ رہ جائے، ایسے مظاہرے دین سے شغف کی ترجمانی کرتے ہیں اس لئے ان کی بڑی قدر کرنی چاہئے، اہل دین ودیانت اور ارباب علم وفضل کا استقبال اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ خود کوئی عظیم شخصیت رکھتے ہیں بلکہ ان کے علم وفضل کا

احترام مقصود ہوتا ہے، اسی لئے ذمہ دار اہل علم ایسے استقبالی ہنگاموں اور عقیدتمندانہ نعروں سے بہت زیادہ گھبراتے ہیں کہ مسلمان ہمیں کیا سمجھ رہے ہیں اور ہم کیا ہیں، لیڈروں اور دنیاداروں کیلئے یہ باتیں بڑے فخر وسرور کی ہوتی ہیں اور ان کے پھیکے پن پر ان کو رنج ہوتا ہے، مگر ذمہ دار علماء اس صورت حال سے بڑی کشمکش میں پڑ جاتے ہیں، اور عوام کی عقیدت اور اپنی بے مائیگی میں کھو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی ہے کہ: اے اللہ! تو مجھے دوسروں کی نگاہ میں بڑا اور خود میری نگاہ میں چھوٹا بنا ایسے وقت میں یہ دعا ڈھارس بندھاتی ہے۔

ہمارا قیام جناب ڈی، اے ابوبکر صاحب اور ڈی، اے اسمٰعیل صاحب کے دولتکدہ ''ابومحل'' میں ہوا، جن کی کپڑوں کی دوکان نل بازار بمبئی میں ہے، ہمارے میزبان ویسے تو تمام منتظمین جلسہ بلکہ مسلمانان بھٹکل تھے مگر ان دونوں حضرات نے بڑے اخلاص وعقیدت سے مہمان نوازی کی، اور آرام وآسائش کا پورا پورا خیال رکھا، اسلام میں مہمان نوازی کی بڑی حیثیت حاصل ہے، مہمان کیسا بھی ہو مہمان کی حیثیت سے اس کے کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کا پورا کرنا اسلامی اخلاق میں واجب ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے مہمان کی تعظیم وتکریم کرے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایک دن ایک رات تک مہمان کا حق ہے کہ اپنے میزبان سے اپنے حقوق حاصل کرے، اور تین دن تین رات تک میزبانی سنت ہے، اس کے بعد میزبانی اور مہمانی کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں اور اخلاق وتعلقات کام کرتے ہیں۔ ہم لوگ تقریباً تین دن تک اپنے میزبان کے یہاں میزبانی اور مہمانی کے تمام حقوق کے ساتھ بڑے آرام سے رہے، اس درمیان میں دوسرے میزبانوں اور مہمانوں کے یہاں ناشتے اور کھانے کا اہتمام بھی رہا، چنانچہ جناب عبدالقادر بادشاہ شیرائی، جناب شاہ بندری صاحب، محمد حسین

(تاجر کالی کٹ) جناب ڈی، اے محمد امین صاحب، جناب الحاج عبدالغفور صاحب (مصبا کمپنی بمبئی) جناب الحاج محی الدین منیری صاحب، جناب محمد محسن صاحب اور دوسرے حضرات کے یہاں بڑی پُر تکلف دعوتیں رہیں، ان پُر تکلف انواع واقسام کے کھانوں سے اندازہ ہوا کہ ان اطراف میں ذوق اکل وشرب معیاری ہے، چاول، گوشت، مچھلی، ناریل کی چٹنی، سالن،......تقریباً ہر دسترخوان پر ہوتے تھے، روٹی نسبتاً کم ہوتی تھی جو چاول اور گیہوں کی ہوتی تھی، سب سے پہلے راقم نے یہ روٹیاں مروڈ (کوکن) میں کھائی تھیں، اس کے پکانے کا خاص انداز ہوتا ہے، شاول کی اس قدر ہلکی پھلکی اور لذیذ روٹی پکانا ذرا مشکل کام ہے، چاول کی روٹی کا رواج بہت قدیم ہے، تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں بعض علماء ومحدثین کی نسبت ''الخبز رزی'' ملتی ہے، (خبز، روٹی اور رُزّ چاول) یہ حضرات چاول کی روٹیوں کا کاروبار کرتے تھے، اور اس کے پکانے میں کاریگری کی وجہ سے خبز رزی کی نسبت سے مشہور ہوگئے، بھٹکل اگر چہ ساحلی مقام ہے مگر یہاں کوکن اور گجرات کی طرح سالن اور گوشت پھیکا نہیں ہوتا، بلکہ نمک مرچ کی پوری لذت پائی جاتی ہے۔

مولانا علی میاں صاحب برف کا تیز پانی پینے کے عادی ہیں، ان کے لئے خاص طور سے زیادہ ٹھنڈے پانی کا اہتمام کیا جاتا تھا جسے وہاں کی مقامی زبان میں ''شیتل پانی'' کہتے ہیں، یہ لفظ ہر دسترخوان پر بار بار دھرایا جاتا تھا، مولانا بھی ''شیتل پانی'' کہنے لگے، اور یہ لفظ محققین کی گرفت میں آکر معرضِ تحقیق بن گیا، معلوم ہوا کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنیٰ ٹھنڈے پانی کے ہیں، راقم اپنے تفریحی ذوق کے مطابق ہر لفظ کو عربی میں تلاش کرنے کا عادی ہے، چنانچہ میں نے کہا کہ شیتل عربی کے لفظ ''شتاء'' سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ جاڑے کے ہیں، یہاں چائے کا رواج کم معلوم ہوا اور عام طور سے چائے گلاس میں استعمال کی جاتی ہے۔

اربابِ جامعہ اسلامیہ اور بانیان جلسہ نے مولانا علی میاں کی ذات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے اور اپنے اہم علمی ودینی امور ومعاملات کو ان کی موجودگی وسرپرستی میں بروئے کار لانے کے لئے اس طرح دودن کا پروگرام بنایا کہ حیات دوروزہ پروگرام بن کر رہ گئی۔

۷؍اکتوبر کو صبح کا پہلا جلسہ بارش ہوجانے کی وجہ سے ''مولانا ہال'' میں ہوا جس میں منیری صاحب نے خطبہ استقبالیہ سنایا، اور جامعہ اسلامیہ کے طلبہ نے اردو، عربی، کنٹری، ہندی، نوائتی اور انگریزی زبانوں میں تقریریں کیں، جو اسلامیات پر تھیں، عربی ترانہ

فَالْعِــزُّ لنا باجابته　　　ومحمدٌ هو سیـّـدُنا

بہت ہی محبوب ومرغوب تھا، مولانا علی میاں صاحب نے بچوں سے یہ ترانہ بار بار پڑھا کر سنا، ظہر کے بعد پھر دوسرا اجلاس اسی جگہ پنڈال میں ہوا، اس میں زیادہ تر تقریریں طالب علموں کی ہوئیں، پھر رات کا اجلاس سلطانی مسجد میں ہوا، جس میں مولانا علی میاں صاحب اور راقم نے مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کیا، ۸؍اکتوبر کو پھر صبح سے اجلاس شروع ہوا جس میں باقی طالب علموں کی تقریریں ہوئیں، اور ظہر کے بعد ان کو انعامات تقسیم کئے گئے اور عصر سے لے کر مغرب تک مولانا علی میاں کی ایک نہایت پُر مغز، معرکۃ الآراء اور جوش وہوش سے معمور تقریر ہوئی، در حقیقت یہ تقریر اس پروگرام کی روح تھی۔

ربیع الاول ۱۳۸۲ھ میں جامعہ اسلامیہ کا تصور یہاں کے چند دردمندوں کے دل ودماغ میں پیدا ہوا، جس طرح ہر اچھی تحریک ابتداء میں بہت حقیر اور معمولی معلوم ہوتی ہے جامعہ اسلامیہ کی تشکیل بھی بظاہر ایک کھیل معلوم ہوئی، مگر چند دنوں میں وہ بارآور درخت بن گیا اور دینی علوم کا چرچا ہونے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ سال گزرتے

گزرتے اس کیلئے مستقل زمین، مستقل عمارت اور مستقل نظام کا شدید داعیہ مخیّر اور دردمند حضرات کے دل میں پیدا ہوا، اس دینی عمارت کی بنیاد کے پتھر تو کہنا چاہئے کہ ہمارے دوست مکرم الحاج محی الدین منیری، ڈاکٹر علی میا، مولانا عبدالحمید صاحب ندوی اور اسی قسم کے دوسرے حضرات ہیں، مگر ان چند سر دینے والوں کی پشت پر بہت سے زَر دینے والے بھی پیدا ہو گئے ہیں، جو اپنی دولت کا بہترین حصہ اس کارِ خیر میں لگانے میں مسرت اور اطمینان محسوس کرتے ہیں، مثلاً جناب الحاج ایس، ایم سید صاحب، جناب ایس، محسن صاحب، ایم، بی، اے، جناب الحاج صدیقہ محمد صاحب، جناب الحاج ارمازین الدین صاحب، جناب الحاج سعد محمد جعفری صاحب، جناب ڈی، اے ابوبکر واسمٰعیل صاحب، جناب الحاج ایس، ایم سید عبدالقادر صاحب، جناب وامداد عبدالقادر بادشاہ صاحب، جناب قاضی محمد مولیٰ صاحب وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے جامعہ اسلامیہ کے طلبہ کی تقریریں سنیں، ان کی اسلامی شکل وصورت اور طرز ولباس وغیرہ دیکھا، اور حضرات اساتذہ کی محنت وشفقت کو پَرکھا، ساتھ ہی ذمہ دارانِ جامعہ کی دُھن بھی دیکھی، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے چند بندوں نے جو بظاہر ایک کھیل کھیلا تھا وہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آیا، طلبہ میں دین وعلم دین کا ذوق نمایاں ہے، چھ چھ زبانوں میں تقریر کرنا آسان نہیں ہے، جامعہ کے بچوں نے اسے آسان کر دکھایا، اگر ان میں چند بچے بھی دین وایمان کے داعی ومبلغ بن کر نکلے تو جامعہ کامیاب ہے، دینی علوم میں کیفیت دیکھی جاتی ہے، کمّیت نہیں دیکھی جاتی، اگر بغداد کے مدرسہ مستنصریہ سے دو چار ائمہ دین بن کر نکلے تو مدرسہ مستنصریہ کامیاب رہا، اگر وہاں کے مدرسہ نظامیہ سے ایک امام غزالی پیدا ہوئے تو سو فیصدی کامیاب رہا، اگر جامع ازہر قاہرہ سے ایک جلال الدین سیوطیؒ پیدا ہوئے تو وہ کامیاب رہا۔ چہ جائیکہ ان اسلامی معاہد ومدارس سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں علماء، ائمہ، محدثین، فقہاء وفضلاء اور

سرآمدگانِ روزگار پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ جامعہ اسلامیہ بھٹکل یہ اپنے مخلص خدام کی وجہ سے جنوبی ہند کی ان چند بنیادی درس گاہوں میں سے ہوگا جن کا شمار آنے والا مورخ انگلیوں پر کرے گا، اگر پودے کی نحافت ونزاکت کو دیکھ کر درخت کی تناوری اور بارآوری کا اندازہ نہیں ہوسکتا تو مدارس اسلامیہ کی ابتدائی خستگی وبے حالی کو دیکھ کر ان کے شاندار مستقبل پر رائے زنی نہیں کی جاسکتی، پھر جامعہ اسلامیہ بھٹکل تو ماشاءاللہ اپنے پہلے دن سے ثمر باری کررہا ہے۔

دو روز میں بڑی بڑی مصروفیات کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مصروفیات بھی رہیں، اور مختلف مقامات اور اداروں میں حاضری ہوئی، الحاج منیری صاحب کے ''غریب خانہ'' الحاج مختار احمد صاحب کے ''کاشانۂ جاوید'' ڈاکٹر علی ملپا کی ''طیبہ منزل'' مولانا خواجہ بہاؤالدین اکرمی صاحب کے یہاں حاضری ہوئی اور قدیم علماء بھٹکل کی نادر تصانیف اور ان کے قلمی نسخوں کی زیارت واستفادہ، شیر الی کی مسجد میں مختصر سی دینی تقریب، صدیق لائبریری کا معائنہ، اسلامیہ ہائی اسکول بھٹکل میں استقبال وتقریر، نئی مسجد فاروقی کا افتتاح، بھٹکل کے بعض مشائخ سے ملاقات، وغیرہ وغیرہ بڑی پُرمسرت تقریبات تھیں۔

صدیق لائبریری میں مختلف علوم وفنون کی تقریباً پانچ ہزار کتابیں ہیں اور متعدد اخبارات ورسائل آتے ہیں، مرحوم آئی، ایچ صدیق صاحب بھٹکل کے مشہور قومی رہنما اور کارکن گزرے ہیں، یہ یہاں کے پہلے گریجویٹ تھے جنھوں نے بھٹکل کے مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کی، ان ہی کے نام پر یہ لائبریری ہے۔

اسلامیہ ہائی اسکول مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ ہے، جس میں موجودہ نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی اور دینی تعلیم کا انتظام ہے، اساتذہ وطلبہ نے بڑے پُرجوش طریقہ پر اپنے مہمانوں کا استقبال کیا، ہمارے دوست عزیز عثمان حسن صاحب بی

اے، بی ایڈ اس کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور مولانا خیال صاحب عربی اور دینیات کے معلم ہیں، ہم نے تقریباً ہر کلاس میں جا کر بچوں کی وضع قطع اور تعلیمی کیفیت کا جائزہ لیا، اساتذہ مخلص اور محنتی ہیں، اسکول کے ہال میں طلبہ واساتذہ کی طرف سے جلسہ ہوا جس میں مہمانوں کو ہار پھول پیش کئے گئے اور مولانا علی میاں صاحب نے موقع کی مناسبت سے ایک نہایت پُر مغز اور معلوماتی تقریر فرمائی۔

الواء محلّہ میں مسجد فاروقی کے نام سے ایک نہایت حسین وجمیل اور شاندار مسجد تعمیر ہوئی ہے جسے یہاں کے مخلصوں نے بڑے اخلاص وایمانی جذبہ سے تعمیر کرایا ہے، ۸/اکتوبر کو مولانا علی میاں صاحب نے اس مسجد میں پہلی مغرب کی نماز پڑھائی اور ان کی امامت سے اس مسجد کا افتتاح ہوا، مسلمانوں میں عجیب جوشِ مسرت اور جذبۂ عبودیت وعبادت تھا، نماز کے بعد مختصر سا جلسہ رہا جس میں راقم پھر مولانا نے موقع کی مناسبت سے مسجدوں کی تعمیر، ان کے حقوق اور عبادت کے موضوع پر تقریریں کیں۔

یہاں کی پرانی مسجدوں میں سلطانی مسجد کی تعمیر ۱۲۱۱ھ میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ حضرت سلطان ٹیپو کی والدہ نے تعمیر کرایا ہے جو قوم نوائت سے تھیں، مسجد سے متصل ان کا مکان بھی بتایا جاتا ہے، اس کا طرز تعمیر یہاں کی دیگر مساجد کی طرح عادل شاہی انداز لئے ہوئے ہے، اور ستونوں کے بجائے درمیان میں دیواریں ہیں جن کی محرابوں اور کمانوں پر چھت کھڑی ہے، یہاں مسجدوں میں صحن نہیں ہوتا اور اندر کا حصہ بہت سی کوٹھریوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے، وضو کے لئے کنارے پر حوض ہوتا ہے۔

۷/اکتوبر کو رات کا جلسہ قدیم جامع مسجد میں ہوا، جس کی مناسبت سے محلّہ کا نام ''جامع محلّہ'' ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ یہاں کی قدیم ترین مسجد ہے جو آٹھویں صدی میں تعمیر ہوئی تھی اور مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ کے وقت میں موجود تھی، بعد میں اس کی تجدید ہوئی، موجودہ عمارت عادل شاہی طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔

جلسہ کی اصل بنیاد جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھنی تھی، اسی مختصر مگر بڑی دوررَس اور نتیجہ خیز تمنا کے لئے اتنی طویل تمہید باندھی گئی تھی، یہ بھٹکل میں کسی نئے مدرسہ کی تعمیر نہیں تھی بلکہ درحقیقت یہاں کی علمی تاریخ کے روشن اور شاندار ماضی کی تجدید یا نشأۃ ثانیہ تھی، بھٹکل اوراس کے قرب وجوار کے تمام علاقے کسی زمانہ میں ھنور (ھناور) کے علمی ودینی مرکز سے وابستہ تھے اور یہاں کے علماء ھنوری کی نسبت سے مشہور تھے، خود بھٹکل میں بہت سے علماء، فضلاء، مصنفین اور عربی زبان کے ادیب وشاعر پیدا ہوچکے ہیں۔

مولانا خواجہ بہاؤالدین صاحب اکرمی کے کتب خانہ میں یہاں کے علماء کے مخطوطات اور قلمی نوادراس کی شہادت دیتے ہیں، مولانا نے ہمیں ۸/اکتوبر کی صبح کو اپنے دولت کدہ پر ان بیش بہا علمی نوادر کی زیارت کرائی جن میں تقریباً ہر علم وفن کی عربی زبان میں کتابیں موجود تھیں، عربی لغت کی مشہور کتاب ''القاموس'' کا ایک کامل ومکمل قلمی نسخہ نہایت پختہ اور حسین عربی خط میں ان کے خاندانی عالم وبزرگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، احسان وتصوف پر کئی قلمی کتابیں ہیں جومختلف رسائل کا مجموعہ ہیں، عربی میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک نہایت ضخیم اور مفصل کتاب ہے، فقہ شافعی پر متعدد قلمی کتابیں ہیں، مناسک حج پر ایک نہایت جامع کتاب ہے، فقیہ حسن بن فقیہ احمد ھنوری کی ایک کتاب ''الیواقیت الملتمعة فی مناقب الأئمة الأربعة'' قلمی موجود ہے، جس میں چاروں ائمہ فقہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اورامام احمد بن حنبلؒ کے حالات نہایت تفصیل سے اور تحقیق کے ساتھ درج ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے شائع کیا جائے اور ہندوستان کے علمی مفاخر میں اس کا بھی شمار ہو، ان مخطوطات میں عربی زبان میں متعدد قصائد، مراثی اور مناقب وفضائل میں نظمیں اوراشعار ہیں جومقامی علماء وادباء کی عربی شاعری کے ذوق کے آئینہ دار ہیں، اگران

عربی قصائد واشعار کو جمع کرلیا جائے تو سلسلة الشعر العربی فی الهند کی بہت سی سنہری کڑیاں مل سکتی ہیں، افسوس کہ یہ نوادر اور علمی ودینی شاہکار زیب طاقِ نسیاں ہیں اور ان سے عام استفادہ کی صورت نہیں ہے۔ ھنور، بھٹکل اور ان ساحلی علاقوں کے علماء دین اور فقہاء ''الـفـقـيـه'' کے لقب سے مشہور ہوتے تھے، آج بھی حجاز اور دوسرے عرب ممالک میں دینی علماء کے لئے فقیہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جو کثرتِ استعمال سے فــقّــی بھی بولا جاتا ہے، اور سوڈان کے علماء کو مقامی تلفظ میں بگاڑ کر فکّی (فقی) کہتے ہیں، بھٹکل کے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ ابھی بیس سال پہلے تک یہاں دینی وعلمی فضا بڑی خوشگوار و پُر بہار تھی، تقریباً ہر پانچ گھر کے درمیان ایک دینی مدرسہ ہوجاتا تھا جس میں دینی تعلیم ہوتی تھی، مگر زمانہ کی ہوا نے ان چھوٹے چھوٹے گلستانوں کو نذرِ خزاں کردیا، اور مال ودولت کی ہنگامہ خیزی اور تجارت ومعیشت کی مشغولیت نے دینی تعلیم کا چرچا تقریباً ختم کردیا، آخری دور میں دو ایک اہل علم ہوئے جو مایوسی یا فرض شناسی کی رُو میں بہ گئے اور انھوں نے اپنے گوشۂ عافیت کو غنیمت جانا، اللہ بھلا کرے ان دردمندوں کا جن میں اہلِ سَر اور اہلِ زَر دونوں طبقہ کے مخلصین ہیں کہ انھوں نے یہاں ایک بڑے مدرسہ کیلئے جدوجہد کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی کوشش بارآور فرمائی، اب ان کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی بے لوث خدمت اور بے غرض کوشش سے جامعہ اسلامیہ بھٹکل کو جنوبی ہند کے معیاری مدارس کی صف میں لائیں۔

یہ دوروزہ علمی اور دینی ہماہمی جامعہ اسلامیہ کی ذاتی عمارت اور اس کی تاسیس کے لئے تھی، ۹ / اکتوبر کی صبح کو وہ مقدس ساعت آپہونچی کہ شہر سے فی الحال دور مگر چند سالوں کے بعد نزدیک شمال مغرب میں بارہ ایکڑ زمین پر جامعہ اسلامیہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور صدہا سال کی سونی محفل میں پھر علم کی رونق کا سماں بندھ گیا، منتظمین جامعہ نے موٹر بس کا انتظام بھی کرلیا تھا جس کی وجہ سے شہر کے بہت سے حضرات علی الصباح

''جامعہ آباد'' نامی میدان میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ لاؤڈ اسپیکر نصب کیا گیا، قرآن خوانی، نعت خوانی اور اعلان ہوتا رہا، ٹھیک آٹھ بجے جامعہ اسلامیہ اور اس کی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور پُر فضا پہاڑوں سے گھرا ہوا میدان تکبیر و تہلیل کے نعروں سے یوں گونج اٹھا کہ کچھ دوری پر واقع بحرِ عرب کی موجوں نے سنا اور اس کے ساحل نے استقبال کیا، سب سے پہلے مولانا علی میاں صاحب پھر راقم اور اس کے بعد مولانا سید محمد الحسنی نے ایک ایک اینٹ رکھی، مولانا علی میاں صاحب اور راقم نے موقع کی مناسبت سے اسلامی علوم اور مدارس کی اہمیت وافادیت پر تقریریں کیں اور نو بجے یہ علمی جشن ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سنسان ویرانے کو علمی ودینی نغمات سے معمور کر دے، اور روز وشب یہاں **قال اللہ وقال الرسول** کی صدا بلند ہوتی رہے۔

واپسی پر بھٹکل کی بندرگاہ پر حاضری ہوئی جس پر عربوں کا وہ مقدس کارواں اترا تھا جو ساحلِ ہند کے سبزہ زاروں اور پہاڑوں میں رہ بس گیا، راستہ میں سڑک کے مشرق جانب حضرت فقیہ اسمٰعیل کا مزار ہے، جن کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے، تھوڑی دیر رک کران کے لئے ایصالِ ثواب اور فاتحہ خوانی کی گئی۔

منگلور کے مکان کے چھانے کے کھپڑے بہت مشہور ہیں، بھٹکل میں شیخ عبد القادر صاحب نے اس کا بہت بڑا کارخانہ کھولا ہے، راستہ میں اسے بھی دیکھا گیا، جہاں بڑے پیمانہ پر مٹی بھگوئی اور کمائی جاتی ہے پھر مشینوں کے ذریعہ اسے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور سوکھنے کے بعد اسی کارخانہ میں اس کا آوا لگتا ہے۔

اس دو روزہ دورانِ قیام میں احباب ومخلصین سے بالکل ہنگامی طور پر ملنا جلنا رہا، مگر مقامی حضرات کی محبت وعقیدت نے ہمارے دلوں پر گہرا نقش چھوڑا، افسوس کہ ان محبین ومخلصین میں سے بہت کم حضرات کے نام یاد رہ سکے، منیری صاحب تو

ہمارے پرانے رفیق بلکہ کہنا چاہئے کہ صاحبِ خدمت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان میں کام کرنے کرانے کی بڑی صلاحیت دی ہے، دینی کاموں میں وہ ہمہ تن جدوجہد بن جاتے ہیں۔ الحاج مختار احمد جاوید کہنا چاہئے کہ عزیزوں میں سے ہیں، بھٹکل، بمبئی، مکہ، مدینہ ہر جگہ حاجت مند کے کام آنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مختار احمد کو جامعہ اسلامیہ کی جدوجہد میں لگا دیا ہے، ان کا مستقل قیام مکہ مکرمہ میں رہتا ہے اور ایام حج میں ہر جان پہچان والے حاجی کی پکڑ پکڑ کر خدمت کرتے ہیں، ان ہی دونوں کی وجہ سے بھٹکل کے دوسرے بہت سے مخلصین سے تعلقات استوار ہوئے ہیں، مختار احمد کے ایک جگری دوست عزیز نوجوان خطیب ابو محمد صاحب نے بڑے اخلاص ومحبت کا اظہار فرمایا اور چلتی پھرتی ملاقاتوں میں ان کی محبت نے ایک خاص نوعیت اختیار کرلی، اسی طرح ایک اور عزیز نوجوان ضیاء الدین احمد سے للہ فی اللہ بڑا خصوصی تعلق ہوگیا ہے، یہ بھولے بھالے شریف النفس نوجوان سب سے پہلے یادگاری دستخط لینے آئے، میں نے اپنا ایک شعر لکھ کر دستخط کردی، پھر وہ اس ہنگامہ میں جب بھی موقع پاتے پاس آجاتے اور عقیدت ومحبت سے ملتے اور مزید قیام کا تقاضا کرتے رہے، ان کے علاوہ اور کئی دوستوں اور بزرگوں سے قدیم وجدید گہرے مراسم وتعلقات ہیں، مگر افسوس کہ ان مخلصوں کے نام یاد نہیں رہے، عزیزی محمد مولا بھی ہماری آمد کی خبر سن کر، دراس سے بھاگ کر یہاں آگئے تھے، ان تمام مخلصوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ جنھوں نے صرف دین اور علم دین کی نسبت سے اللہ کے لئے محبت کی۔

منیری صاحب، مختار احمد صاحب اور دوسرے بہت سے دوستوں اور بزرگوں کا شدید اصرار تھا کہ جلسہ کے بعد دو چار دن بھٹکل میں رہوں اور یہاں کی تاریخ کی سیر کروں اور دوستوں کو میزبانی کا موقع دوں، میں بھی اس پر راضی تھا مگر بمبئی کی

مصروفیات ، وطن جانے کا انتظام اور سب سے بڑھ کر ان مخلصوں کی مصروفیات جنھوں نے ہفتوں نہیں مہینوں سے رات دن ایک کر کے اتنے بڑے جلسہ کا انتظام کیا تھا، جلسہ کے بعد پھر وہ میرے لئے وقت نکالیں یہ میرے نزدیک نامناسب بات تھی، حالانکہ وہ اس کو پروگرام میں شامل کیے ہوئے تھے، عزیزم مختار احمد کو جلد از جلد مکہ مکرمہ جانا تھا وہ جلسہ ہی کیلئے رُکے ہوئے تھے، ان باتوں کے سبب میں بھی مولانا علی میاں صاحب اور مولانا سید محمد حسنی صاحب کے ہمراہ چلا آیا۔

۶؍ اکتوبر کی شام میں ہم نو وارد مسافر بن کر بھٹکل میں داخل ہوئے اور ۹؍ اکتوبر کی صبح کو جانے پہچانے بلکہ ''اپنے'' بن کر وہاں سے واپس ہوئے ، مگر مخلصین نے دونوں مواقع پر ہمارے ساتھ عقیدت ومحبت کا پُر جوش مظاہرہ کیا، پہلی بار لوگوں کے چہروں پر استقبال کی مسرت تھی اور دوسری بار الوداع کی پژمردگی تھی، مگر قلبی تعلق کی کیفیت پہلے سے زیادہ تھی، منگلور کیلئے روانہ ہوتے وقت راقم کی زبان پر میر کا یہ شعر آیا۔ ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جب راقم نے عربی کا یہ شعر پڑھا ؎

لا مرحباً بغدٍ ولا أهلاً به

اِن كانَ تفريقُ الأحبةِ فى الغدِ

تو مولانا علی میاں صاحب نے اس کا دوسرا مصرعہ مجھ سے پہلے ہی سنا دیا۔ پھر انھوں نے بڑے مؤثر انداز میں فرمایا۔ ؎

وداعِ ہوش کنم ، یا وداعِ یار کنم　　بطاقتے کہ ندانم کدام کار کنم

منگلور میں آکر دوپہر کا کھانا کھایا گیا، جس کیلئے بھٹکل کے ایک تاجر پہلے ہی سے منتظر تھے، پھر ہوائی اڈہ کی طرف روانگی ہوئی ، پونے تین بجے کے قریب وہاں

پہونچ کر ظہر کی نماز ادا کی گئی اور ۳؍بج کر ۱۰؍منٹ پر جہاز نے اپنے بال و پر نکالے، یہ جہاز پہلے جہاز سے بڑا تھا اور براہ راست بمبئی آرہا تھا، تقریباً پورا راستہ سمندر کے اوپر سے طے کیا اور ۵؍بج کر ۵۰؍منٹ پر سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر اترا، جہاں بمبئی کے متلقین اور بھٹکل کے حضرات موجود تھے۔

تھانہ اور بھڑوچ سے لے کر مالا بار بلکہ سیلون تک کے مغربی کنارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت سے اسلامیوں کے مقدس کارواں کی گزرگاہ رہے ہیں، عہد فاروقی میں حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو تھانہ اور بھڑوچ کی فوجی مہم پر روانہ کیا بلکہ بعض روایات کی رُو سے اسی عہد میں سیلون میں بھی مجاہدین کے قدم آئے، جن میں زیادہ تر بحرین وعمان وغیرہ مشرقی عرب کے باشندے قبیلہ بنوعبدالقیس، قبیلہ بنوتمیم، قبیلہ بنواز داور قبیلہ بنواسامہ کے حضرات شریک تھے، اور ان قدوسیوں کے قدم سے یہ کنارے فیضیاب ہوئے، منگلور اور ''ھَنُوَرْ'' اسلامی تاریخ میں بڑے مرکزی مقامات تھے، یہاں عرب مسلمانوں کے بحری قافلے رکتے تھے، تیسری صدی ہجری تک ان سواحل کی تمام تر تجارت ان ہی عرب تاجروں کے ہاتھ میں تھی، قدیم سیاح ومورخ اور جغرافیہ نویس منگلور کو منجلور اور منجنور کہتے ہیں، ھنور بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جہاں عرب ممالک سے بہت سے تجارتی جہاز آتے جاتے تھے، یہاں مسلمان بادشاہ تھا اور اطراف وجوانب کے علاقے اس سے متعلق تھے چنانچہ بھٹکل کا تعلق بھی ھنور ہی سے تھا جو تقریباً بیس میل پر جنوب میں لب ساحل واقع ہے، آٹھویں صدی ہجری میں ھنور اور بھٹکل وغیرہ کے حالات پر مشہور سیاح ابن بطوطہ کے اس بیان سے روشنی پڑتی ہے کہ:

''ھنور میں ہر سمت سے بے شمار جہاز آتے ہیں، یہاں کے باشندے مسلمان اور شافعی ہیں، اگرچہ یہ لوگ صلح پسند ہیں مگر اکثر جہاد میں مصروف

رہتے ہیں، یہاں کی عورتیں بلکہ تقریباً ان تمام ساحلی شہروں کی عورتیں سِلا ہوا کپڑا نہیں پہنتی ہیں بلکہ ایک کپڑا (ساڑی) بدن پر یوں رکھ لیتی ہیں کہ نصف کمر تک باندھ لیتی ہیں اور نصف کو سر میں لپیٹ لیتی ہیں، ھنور کا بادشاہ آج کل سلطان جمال الدین بن حسن ہے جو ایک ہندو راجہ کا باج گذار ہے اس کی فوج میں چھ ہزار سپاہی ہیں، یہاں کے اکثر باشندے حافظ قرآن ہوتے ہیں، ان اضلاع میں جہاں مسلمان تاجر ہوتے ہیں امیر وغریب مسلمان مسافر سب ہی ان کے یہاں اترتے ہیں، ہر طرف سرسبزی اور ہریالی ہے، ہر شخص کے پاس اپنا باغ ہے جس میں اس نے اپنا گھر بنالیا ہے‘‘

ابن بطوطہ کے اس بیان سے آٹھویں صدی کے علاقہ ھنور میں مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی، تمدنی، دینی اور علمی زندگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، الغرض پہلی صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی تک ان ساحلی مقامات پر تمام تر بحری تجارت ان ہی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی مگر بعد میں پُرتگیزیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کرکے مسلمانوں سے تجارت چھین لی، اور ان پر بے پناہ مظالم کرکے ان کو بے دست وپا کرنے کی کوشش کی، بڑے ظلم وستم کے ساتھ عیسائی بنانے کی تحریک جاری کی، اس کی پوری تفصیل علامہ زین الدین ملیباریؒ نے ’’تحفۃ المجاہدین‘‘ میں درج کی ہے، جو بڑی دردناک ہے، اس طرح پرتگیزیوں کے عمل دخل کے بعد ان ساحلی علاقوں کے مسلمان تاجر ناکام بنادیئے گئے۔

ھنور اور بھٹکل کے ساحلی مقامات پر جو مسلمان پائے جاتے ہیں، ان کی اکثریت ان عرب تاجروں کی ہے جو بصرہ، اسیرات، عمان، بحرین، عدن، حضرموت وغیرہ سے براہِ سمندر ہندوستان اور چین تک تجارت کرتے تھے، ان کی بود وباش اور لباس وزبان میں ابتک عربیت کی خوبو باقی ہے، یہ لوگ اپنے ساتھ حجاز کا فقہی مسلک

ہندوستان لائے اور شافعی رہے جس پر اب بھی قائم ہیں، ان کا عام لباس اب بھی تہ بند ہے جو ازار اور فوطہ کے نام سے قدیم زمانہ سے عربوں میں رائج تھا، ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق اب بھی عورتوں میں ساڑی کا رواج ہے، مہمان نوازی اور سیر چشمی کی صفت اب تک باقی ہے، نیز آباء واجداد کا تجارتی پیشہ ابھی تک زندہ وسلامت ہے، یہاں کے تاجر کلکتہ، بمبئی، منگلور، بنگلور، کالی کٹ، مدراس، کولمبو، عرب ممالک اور ملایا وغیرہ میں کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے کونوائت کہتے ہیں، یہ عربی کے لفظ نوتی کی جمع ہے، مسعودی نے ''مروّج الذہب'' میں اور طبری نے اپنی تاریخ میں نوتی اور نوائت سے مراد تجارتی کشتیوں اور جہازوں والے لئے ہیں، ہمارے نزدیک نوائط کا املاء اور تلفظ صحیح نہیں ہے، یہاں کے مسلمانوں کے خاندان اور قبائل کے عوام ابتک عربی انداز میں ہندی تلفظ کے ساتھ محفوظ وموجود ہیں، مثلاً شاہ بندری (جہاز رانی اور ساحل کا ایک عہدہ) معلّمی (جہاز راں کپتان) واموری یہ لفظ عاموری ہے، اس نسبت سے آج بھی عرب میں لوگ موجود ہیں، چنانچہ مجلّہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے ایڈیٹر اور ہمارے دوست الشیخ محمد سعید ''العاموری'' ہیں۔ غالباً یہ حضار کا کوئی قبیلہ ہے۔ اسی طرح رکن الدین، سیدمحی الدین (سیم دین) قاضیا، صدیقہ، سکری وغیرہ خاندان اور قبائل ہیں، قدیم زمانہ میں مذہبی عالم کو فقیہ کہتے تھے، آج کل خلیفہ (خلفو) کہتے ہیں، بھٹکل کے محلوں کے نام سے بھی عربیت کا ظہور ہوتا ہے، سلطانی محلّہ، اسی میں سلطانی مسجد ہے جو ٹیپو سلطان کی والدہ نے بنوائی ہے۔ جامع محلّہ، اسی میں جامع مسجد واقع ہے، خلیفہ محلّہ، یہ کسی مذہبی عالم کی نسبت ہے، مشما محلّہ، الواء محلّہ، شاہولی محلّہ، تکیہ محلّہ، آثار کیری، اسے آج کل اچار کیری (آم کا اچار) کہتے ہیں۔

یہاں پر پردہ کا خوب رواج اب بھی شدت سے ہے، مسلمان عورتیں برقعہ میں

نکلتی ہیں، ہر گھر میں کنواں ہوتا ہے، تقریباً ہر گھر کے دائیں بائیں ناریل وغیرہ کا مختصر باغ ہوتا ہے۔ دورانِ قیام میں صرف ایک فقیر سوال کرتا ہوا ملا تھا، مسلمانوں کی آبادی ایک جانب ہے، کل آبادی پندرہ ہزار ہے، جس میں دس ہزار مسلمان ہیں، اکثر کا ذریعۂ معاش تجارت ہے، کھیتی باڑی اور باغبانی بھی ہوتی ہے۔ چوک۔ میونسپل مارکیٹ وغیرہ کھلے بازار ہیں، گلیاں قدیم زمانہ کی تنگ ہیں، دو ہائی اسکول ہیں، ایک مسلمانوں کا ہے، یہ تحصیل کا صدر مقام ہے یہاں ایک کورٹ بھی ہے، ایک ہسپتال ہے جسے چالیس ہزار کے صرفہ سے مولانا ابوبکر لنگی والے نے بنوایا ہے، کئی ڈسپنسریاں ہیں، ڈاکٹری کے ساتھ طبی طریقۂ علاج بھی رائج ہے، ان دنوں گلی کوچوں میں پانی کے لئے پائپ لگائے جارہے ہیں۔

یہاں قدیم زمانہ کے بعض آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ ''مونی بستی'' میں ایک قدیم جین مندر ہے جس کی عمر ڈیڑھ ہزار سال بتائی جاتی ہے، یہ درحقیقت ایک رانی کا محل تھا جو پتھروں کی سلوں اور لمبے لمبے ستونوں سے بنایا گیا تھا چھت بھی پتھر ہی کی ہے، اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے محل ہیں، بعض پر قدیم زمانہ کی تحریریں بھی پائی جاتی تھیں۔

یہاں بستی کے باہر دکھن جانب ''نماز کا پتھر'' نامی ایک پہاڑی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جن عرب مسلمان تاجر و مبلغ یہاں آئے تو انھوں نے بندرگاہ کے اوپر اسی جگہ پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی، بعد میں اس جگہ لوگ نماز پڑھتے رہے، اب اسے گھیر دیا گیا ہے لوگ تفریح کے لئے یہاں جاتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں، کہنا چاہیئے کہ ان اطراف میں یہی مقام ہے جہاں اللہ کے بندوں نے پہلی بار اللہ کی عبادت کی تھی۔

بھٹکل، ہنور کے ملحقات میں تھا، پہلے اسے ''آباد قلعہ'' کہتے تھے، چنانچہ کئی

قلمی کتابوں کے مصنف جن کو ہم نے دیکھا ''الباد قلی'' کی نسبت سے مشہور ہیں اور ان کے نام کے ساتھ یہ نسبت موجود ہے، کثرتِ استعمال سے آباد قلعہ کے بجائے ''باد قلعہ'' ہوگیا، مگر نویں صدی میں اسے بھٹکل کے نام سے یاد کرتے تھے، ہم نے وہیں ایک عربی کتاب دیکھی اور اس میں ایک بھٹکلی عالم وشیخ حضرت فقیہ اسمٰعیل سکری کے عربی مرثیہ میں ایک عالم نے یہ دوشعر بھی لکھے ہیں۔

ونسبة ذات سكرى بشهرة　　ونسبة دار بهتكلى تعهد

بتسع لمائة ثم تسع واربعين　　من الله موت واجب الفاوق تفقد؟

(فقیہ اسمٰعیل کی نسبت سکری شہرت کی وجہ سے اوران کے وطن کی نسبت بھٹکل ہے، وہ ۹۴۹ھ میں اللہ کو پیارے ہوئے)

باقی رہا یہ سوال کہ اسے بھٹکل کیوں کہتے ہیں؟ اس کے بارے میں مختلف بیانات ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بھٹ اور کلہ دو لفظ ہیں، بھٹ کے معنی سخت سیاہ کے ہیں اور کلہ کے معنی پتھر کے ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ کلہ کے معنی قزاق اور ڈاکو کے ہیں، میں نے ازراہِ تفریح اسے عربی بنانا چاہا اور کہا کہ یہ عربی کا جملہ ''بُهِتَ الْكُلّ'' ہے، (سب لوگ مبہوت رہ گئے) جب مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے اور مقامی لوگوں نے ان کے اخلاق واطوار اور دینداری کو دیکھا تو ان کے بارے میں جو غلط خیالات تھے یک بیک ختم ہوگئے اور سب لوگ مسلمانوں کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے۔ محترمی مولانا علی میاں صاحب نے تفریحی طور سے اس کی عربیت یوں بیان فرمائی کہ یہ اصل میں ''بَيْتُ الْكُل'' (سب کا گھر) ہے، ابتداء میں عرب مسلمان الگ الگ خیموں میں مقیم ہوگئے، پھر ایک بڑا خیمہ نصب کیا گیا اور سب لوگ اسی میں رہنے لگے، اس لئے اسے بیت الکل کہا تھا، یہ دونوں توجیہات تفریحی ہیں۔

کسی نئے مقام پر دوچار دن رہ کر وہ بھی ہنگامی حالات میں وہاں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے، اس لئے بھٹکل یا اہل بھٹکل کے بارے میں یا

اور معاملات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک چلتا پھرتا تاثر ہے، یہ تو آج کل کے یورپ کے محققین کا دستور ہے کہ کسی ملک کا ہفتہ دو ہفتہ دَورہ کیا اور چند مقامات پر آئے گئے اور واپس جا کر نہایت ضخیم کتاب لکھ دی، جس میں ایک ایک کہانی کو اس ملک کی عام روایت ثابت کرتے کراتے ہیں اور جہاں جو چیز دیکھی اسے اس ملک کی عادت وتقلید میں شمار کرتے ہیں، سیر وسیاحت اور تاریخ نویسی کا یہ سطحی ذوق بہت غلط ہوتا ہے، ویسے ہم نے اس سیاحت نامہ میں داستان سرائی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔

(''البلاغ''، بمبئی، جنوری، فروری ۱۹۷۱ء)

☆☆☆☆☆☆☆

۲۴۔ گھنٹے ماتھران میں (مئی ۱۹۶۹ء)

میں نے جلسوں میں شرکت بہت کم کر دی ہے، کیونکہ اس میں لوگوں کو فائدہ کم ہوتا ہے اور میرا نقصان زیادہ ہوتا ہے، گھنٹے آدھ گھنٹے وعظ و تقریر کے لئے کم از کم چار پانچ گھنٹے شہر میں اور دو ایک دن اور بعض مرتبہ تو کئی دن باہر ضائع ہوتے ہیں، لکھنے پڑھنے اور معمولات میں فرق آتا ہے، اور بعض اوقات جلسہ کے انتظام کی خرابی کی وجہ سے دماغ پر بار اور طبیعت میں تکدُّر رہتا ہے، پھر راقم کوئی واعظ نہیں ہے کہ عام واعظوں کی طرح قصہ کہانی، شعر و شاعری، چٹکلہ بازی اور لطائف بیانی سے کام لے اور یہی سب باتیں عام لوگوں کو ہمارے واعظوں کی سطحیت و کم سوادی کی وجہ سے بھانے لگی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنئے! حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی بیان کرتے ہیں کہ:

”حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ہمارے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں جلسہ دستار بندی کے لئے تشریف لائے، میں نے وعظ کے لئے عرض کیا، فرمایا مجھے وعظ کہنا نہیں آتا، میں نے کہا حضرت وعظ تو کہنا ہی پڑے گا، فرمایا تمہارے وعظ سے لوگ مانوس ہیں اور پسند کرتے ہیں، تمہارا وعظ مناسب ہوگا اور میرے بیان سے لوگ خوش نہ ہوں گے، اس سے میرا تو کچھ نہ جائے گا تمہاری ہی اہانت ہوگی کہ ان کے استاذ ایسے بے علم ہیں، میں نے عرض کیا حضرت! اس سے تو ہمارا فخر ہوگا کہ ان کے استاد ایسے ہیں۔“

یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں، ہم چھوٹوں کا حال کیا ہوگا اور کیا ہونا چاہئے، آپ کو تعجب ہوگا کہ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک بڑے جلسۂ سیرت میں تقریر کر رہا تھا، دوسرے

واعظین بھی موجود تھے، میں اپنے انداز میں جیسا کچھ بن سکتا تھا، سیرت رسول ﷺ کے بیان کو اپنے علم و معلومات کے مطابق زیادہ سے زیادہ پُر مغز بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسی دوران میں ایک صاحب نے آکر صدر جلسہ کے کان میں کہا کہ ان صاحب کا وعظ کب بند ہوگا، اس پر صدر صاحب بگڑ گئے کہ ایسے پُر مغز اور معلوماتی وعظ کو کیسے بند کردیا جائے، میں اسے بھانپ گیا۔

ماتھران تاریخ اور محلِ وقوع: مگر اس صورتِ حال کے باوجود مدرسوں اور تعلیمی اداروں کے جلسوں میں بلا تکلف چلا جاتا ہوں، کیونکہ مدرسہ میں بنی ہوئی زندگی مدرسوں میں جاکر تسکین محسوس کرتی ہے چاہے کتنا ہی معمولی اور چھوٹا کیوں نہ ہو، چنانچہ جب ماتھران کے ایک مدرسہ کے جلسہ کی دعوت دی گئی تو میں بے چون و چرا تیار ہوگیا۔ اور ۱۹؍مئی کو وہاں پہونچا، ماتھران بمبئی سے ۶۷؍میل دور جانب مشرق مائل بہ شمال ایک پہاڑی بستی ہے جو انتظامی اعتبار سے ضلع قلابہ کا ایک حصہ ہے، اس کی بلندی سطح سمندر سے ۲۶۳۶؍فٹ ہے۔ مہابلیشور، پنچ گنی اور ماتھران اہل بمبئی کے ''مصائف'' ہیں، مصائف ان مقامات کو کہتے ہیں جہاں بڑے لوگ گرمی کے ایام بسر کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ ماتھران ان سب میں بمبئی سے قریب ہے، پونہ جانے والی ریلوے لائن نیرل اسٹیشن سے چھوٹی پہاڑی گاڑی (چاہے اسے ٹرین کہہ لیجئے) ماتھران جاتی ہے۔ پورا راستہ پہاڑوں کے مہیب نشیب و فراز سے ہوکر گزرتا ہے، ماتھران سے پہلے اس کی یہ سواری ہی سب سے دلچسپ تفریح ہوتی ہے۔ اس کی موجودہ تفریحی حیثیت ۱۸۵۰ء میں بننی شروع ہوئی ہے، اس سے پہلے یہ مقام کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا تھا، البتہ سنا ہے کہ یہاں شیواجی کے زمانہ کا ایک قلعہ ابتک موجود ہے۔ صورت یہ ہوئی کہ ضلع تھانہ کا کلکٹر مسٹر ہیوج میلیٹ ۱۸۵۰ء میں یہاں شکار کے لئے آیا تو اسے یہ جگہ بہت پسند آئی، یورپ کے لوگ ویسے بھی مناظر قدرت

اور جمالِ فطرت سے دلچسپی رکھتے ہیں، مسٹر ہیوج میلیٹ نے اس مقام کو خوبصورت تفریح گاہ بنانے کیلئے گورنر بمبئی مسٹر الفنسٹن سے مدد چاہی اور اس نے بھی اس کی طرف توجہ کی، اس طرح موجودہ ماتھران ۱۲۰؍سال کے قریب ہے۔ کل آبادی لگ بھگ تین ہزار ہوگی جس میں مسلمان دو ڈھائی سو ہیں۔ یہاں معاش ومعیشت اور ترقی کے ذرائع بالکل محدود ہیں، سارا دارومدار سیاحوں پر ہے جو گرمی کے ایام میں خصوصاً مئی، جون میں یہاں آتے ہیں اور قیام کرتے ہیں۔ مسلمان عام طور سے راج گیری، رکشا کشی اور گھوڑے کی سائیسی کرتے ہیں۔ سیاحوں کو رکشوں اور گھوڑوں پر سوار کر کے فی گھنٹہ سیر کرانے کا کرایہ تین چار جتنا روپیہ طے ہو جائے رکشا چلاتے ہیں اور سیاحوں کی سیر وتفریح کے گھوڑے پالتے ہیں، عام آبادی کا حال بھی معاشی اور تعلیمی اعتبار سے اچھا نہیں ہے، مسلمانوں کا حال اور بھی ناقابل اطمینان ہے۔

ریلوے لائن: نیرل سے ماتھران تک کا راستہ ریل کے ذریعہ ۱۴؍میل ہے جو دو گھنٹہ میں خدا خدا کر کے طے ہوتا ہے، اور پیدل کا راستہ صرف سات میل ہے جو اترتے ہوئے صرف ایک گھنٹہ میں ہو جاتا ہے، پیدل کا راستہ اگر چہ معمولی ہے اور سڑک نہیں ہے مگر سنا ہے اچھا ہے، ماتھران کو باہر کی دنیا سے چھوٹی ریل کے ذریعہ ملانے کا سہرا بمبئی کے مشہور اہل خیر سر آدم جی پیر بھائی کے سر ہے، انھوں نے ۱۹۰۷ء میں اپنے سرمایہ سے یہ ریلوے تیار کرائی، سنا ہے کہ سر آدم جی کا بنگلہ ماتھران میں تھا وہ یہاں آتے جاتے تھے، اس وقت نیرل کے بڑے لوگ گھوڑوں، پالکیوں اور ڈولیوں میں اوپر جاتے تھے، ایک مرتبہ عبدالحسین سر آدم جی ماتھران جانے کے لئے نیرل پہونچے، اتفاق سے اسی دن گورنر یا اور کوئی افسر اوپر جانے والا تھا اور تمام گھوڑے، پالکیاں اور ڈولیاں اس کے لئے وقف تھیں، ان کو کوئی سواری نہیں مل سکی اس پر وہ یہ کہہ کر بمبئی واپس چلے آئے کہ جب تک اپنی سواری نہیں ہوگی میں

ماتھران نہیں جاؤں گا اور جب انھوں نے یہ ریلوے بنوائی تو پہلی بار اسی سے اوپر گئے ۔اسے کہتے ’’عزت نفس‘‘ جو بڑوں میں ابھر جاتی ہے تو دنیا کا بھلا ہو جاتا ہے، مال و دولت کی شانداری کا مظاہرہ ایسے وقت میں بہت خوب ہوتا ہے، اور اس کے نام پر انسان کچھ نہ کچھ کر گزرتا ہے۔

۱۹ر مئی کو ڈیڑھ بجے روانگی ہوئی، ماتھران سے ایک صاحب لینے کیلئے آئے، ان کے ساتھ وہاں کے دو ایک اور صاحبان تھے، چار بجے نیرل پہونچے، دوسری طرف پلیٹ فارم پر پرانے زمانہ کی لاری یا ٹرام کی طرح آسمانی رنگ کے چھوٹے چھوٹے ڈبے نظر آئے ۔معلوم ہوا کہ یہی سب مل کر ماتھران جائیں گے، واقعی یہ پہاڑی ریل خود ایک تفریح ہے، اس کی پٹری تین بالشت چوڑی ہے یعنی ٹرام پٹری سے بھی کم، اور اسی کی مناسبت سے چھوٹا آئل انجن لگتا ہے، کرایہ ۱۴ر میل کیلئے سوا تین روپیہ بہت زیادہ ہے، پہلے عام کرایوں کی طرح اس کا کرایہ بھی مناسب تھا، یہ پہاڑی شاخ بھی اب سرکاری ریلوے کے ماتحت ہے۔اس طرح کی چھوٹی ریلیں ہندوستان میں اور جگہیں بھی چلتی ہیں، مگر یہاں کا معاملہ الگ ہے۔ برسات میں تین ماہ مستقل بند رہتی ہے، چونکہ یہ بالکل مست خرام ہے اور بہت آہستہ آہستہ چلتی ہے اس لئے بڑے اور بچے سب ہی کود کود کر چڑھتے اترتے رہتے ہیں، بچے تو عموماً تفریح کے لئے دوڑ دوڑ کر چڑھتے اترتے ہیں، ان کے ہانکنے کے لئے مستقل آدمی چلتے ہیں، چنانچہ نیرل سے دو تین فرلانگ جانے کے بعد گاڑی روکی گئی اور دونوں طرف ریلوے ملازمین نے اتر کر بچوں اور بڑوں کو ہانکنا شروع کیا، بعض بعض کو دوڑا کر دور بھگا آئے، پھر یہ ملازمین آخری ڈبہ کے دونوں پائدان پر کھڑے ہو گئے تاکہ اگر کوئی چلتی ٹرین پر چڑھے تو وہیں سے پائدان پر دوڑ کے اس کے پاس چلے جائیں، چلتی ٹرین میں پائدان کے راستہ سے پوری ٹرین کی سیر برابر ہوتی رہتی ہے، اس سے دلچسپ

منظر ماتھران سے چلتے وقت گاڑی کا تھا، گاڑی چھوٹنے کے وقت دونوں طرف ملازمین ہاتھ میں چھڑی تانتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے دوڑاتے تھے، چونکہ راستہ میں پہاڑی نشیب وفراز اور موڑ آتے ہیں، اس لئے ڈبے چھوٹے چھوٹے ہیں اور ہر دس پانچ منٹ کے بعد پسنجر اور ڈرائیور ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے رہتے ہیں اور سب نظر کے سامنے ہوتے ہیں، گویا اس خطرناک راستہ میں اہل کارواں اور میر کارواں سب ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔

چٹانوں پر زندگی کا تبسم:

پہاڑی راستوں سے بسوں، اور موٹروں میں بارہا سفر کیا ہے اور خوفناک غاروں اور خطرناک چوٹیوں کے درمیان چکی کے دوپاٹ میں اپنے کو پانے کا موقع آیا ہے، مگر بلندی اور نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلا سفر تھا، اس لئے اس کی حیثیت یادگار بن گئی۔ کالی کالی مسطح چٹانوں پر درختوں اور گھاسوں کو دیکھ کر یکبارگی خیال آگیا کہ **فاطر السمٰوات والارض** نے ان پودوں اور اکھوؤں میں اتنی طاقت دی ہے کہ پہاڑوں کے سینوں کو پھاڑ کر یہ باہر نکلتے ہیں اور ان میں سے اپنی خوراک حاصل کر کے بڑھتے ہیں اور ہرے بھرے رہتے ہیں، جب وہ نباتات کو اس طرح زندگی اور روزی دیتا ہے تو حیوانات کو جہاں چاہے اور جیسے چاہے زندگی اور روزی دے سکتا ہے اور دیتا بھی ہے، جس کا مشاہدہ ہر آن اور ہر زمان ہوتا رہتا ہے۔ پتھر کی سخت اور سپاٹ سطح پر حیات دیکھ کر وہ حدیث یاد آگئی جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے ''اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو پتھر پر مادۂ تولید میں نسمہ اور روح ڈال سکتا ہے، جب نبات کو اس کے مناسب زندگی یہاں مل رہی ہے تو حیوان اور انسان کو جس میں اللہ تعالیٰ نے گھاس سے زیادہ طاقت کا مادہ دیا ہے اسے وہ چاہے تو کیوں نہیں پہاڑ اور پتھر پر جاندار بنا سکتا ہے، آپ نے یہ بات اس موقع پر فرمائی تھی جبکہ حضرات صحابہ نے عزل

کی اجازت چاہی تھی اور عرض کیا تھا کہ کھانے پینے کی تنگی کی وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ بچے کم پیدا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ بچے کم زیادہ پیدا کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے، تم کم بچے کی کوئی بھی کوشش کرو مگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو بچہ پیدا ہوکر رہے گا، حتیٰ کہ پہاڑ اور پتھر کی چٹان پر بھی اس مادۂ تولید سے وہ بچہ پیدا کرسکتا ہے۔

پھر اس سے آگے سوچئے کہ جب اللہ تعالیٰ پتھر اور دھوپ کی کھلی آب وہوا میں انسانی زندگی اور جسمانیت عطا کرسکتا ہے تو اگر مادۂ تولید کو کسی محفوظ مقام میں رکھا جائے اور اس کی دیکھ ریکھ کی جائے تو کیا وہاں پر اس میں جسمانیت اور روح نہیں پیدا کرسکتا ہے؟ یہ نلکی زادگی بھی اسی کی قدرتِ کاملہ کا کرشمہ ہے جو جلتے ہوئے سخت پہاڑوں اور دھوپ میں اس کے اندر حیات دے سکتا ہے۔

منزلِ مقصود: ساڑھے چار بجے یہ پہاڑی گاڑی چلی، راستہ میں دو اسٹیشن غالباً ایک کا نام جوماپٹی تھا اور دوسرے کا نام وائر پائپ تھا آئے، یہ اسٹیشن عام اسٹیشنوں کے مقابلہ میں گھروندا معلوم ہوتے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ تمام قاعدہ قانون بہرحال رکھتے تھے، ہم ساڑھے پانچ بجے اتنی بلندی پر پہونچ گئے کہ نیچے کے پہاڑ اور غار مسطح سے نظر آنے لگے جیسے ہوائی جہاز سے معلوم ہوتے ہیں، چونکہ ہوائی جہاز اس سے بھی اوپر اُڑتے ہیں، اسلئے ان میں سے زمین مسطح اور مختلف رنگ کی نظر آتی ہے، یہاں کی سطحیت اس سے کم درجہ کی تھی۔ ساڑھے بجے شام کو ماتھران پہونچے، کافی پہلے سے ٹرین پہاڑی جنگلوں میں چل رہی تھی، نشیب وفراز تو آخر تک باقی رہے، مگر اوپر جاکر نسبۃً کم تھے، اس ٹرین کی مناسبت سے اسٹیشن بھی چھوٹا ہے، کئی حضرات لینے آئے تھے۔ باہر نکلتے ہی بازار اور سڑک تھے، کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار نظر آئے، معلوم ہوا کہ یہ مٹر گشتی کرتے سیاح لوگ ہیں، جن کی وجہ سے یہاں کی معاش ومعیشت کی گاڑی چلتی ہے۔ ظہر کی نماز نیرل اسٹیشن پر پڑھی تھی، وضو باقی تھا فوراً مسجد

میں جا کر عصر کی نماز ادا کی، وہاں پر ملنے والوں میں بمبئی اور باہر کے کئی شاگرد تھے، جو وہاں گرمی گزارنے کیلئے گئے تھے، مقامی حضرات میں جناب حسین میاں دامد والے، ان کے صاحبزادے جناب محمد محسن صاحب پیش امام مسجد ماتھران، جناب محمد سلطان صاحب، جناب ابراہیم اشرف خاں صاحب، خان ہوٹل والے، جناب فقیر محمد پٹیل صاحب ودیگر کئی حضرات تھے، میری یہ پہلی رات تھی جو سطح سمندر سے ۲۶۳۶ رفٹ بلندی پر ہوئی، ایک نظریہ کے مطابق بلندی اور پستی خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ایک کے اعتبار سے دوسرے کا وجود معلوم ہوتا ہے، ماتھران کی یہ بلندی سطح سمندر کے اعتبار سے ہے مگر خود اس کی سطح اپنی ہے اور اس میں بلندی نہیں ہے، بلکہ دوسرے پہاڑوں کی سطح کی بلندی کے مقابلہ میں اس میں پستی ہے، خود زمین گُردی شکل کی ہے اور اس کے فاصلے بلند و پست ہیں، اسی لئے تو طلوع و غروب میں فرق ہوتا ہے اور ہم جس بستی میں رہتے ہیں وہ کسی حصۂ زمین کے مقابلہ میں بلند اور کسی کے مقابلہ میں پست ہوتی ہے۔

ذمہ داروں سے معلوم ہوا کہ محمد علی جناح (بانئ پاکستان) جس زمانہ میں وہاں آتے جاتے تھے انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور معاشی زبوں حالی کو دیکھ کر ''ماتھران مسلم ایجوکیشن فنڈ'' کے نام سے لاکھوں روپیہ جمع کیا تھا خود بھی کافی رقم دی تھی، اسکول کے لئے عمارت بھی بننی شروع ہوئی جو آج کل گودام کے کام آتی ہے، مگر حالات کی ناسازگاری اور ملک کی تقسیم کے باعث یہ فنڈ اور اس کا کام یونہی پڑا رہ گیا اور اس کے لاکھوں روپئے گورنمنٹ کی تحویل میں موجود ہیں جس کا سود ملتا ہے، یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ ماتھران میں مسلمانوں کا اپنا کوئی اسکول نہیں ہے درانحالیکہ اس کیلئے لاکھوں روپیے پڑے ہوئے ہیں، اور انجمن اسلام بمبئی کے بعض ذمہ دار اس میں سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں وہ بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے ہیں حالانکہ جیسے انجمن کے بہت سے اسکول ادھر ادھر چلتے ہیں ماتھران میں بھی ایک

اسکول بڑی کامیابی اور حسن وخوبی سے چل سکتا ہے، پنچ گنی وغیرہ کے اسکولوں کی طرح ماتھران کا اسکول بھی صحت بخش اور پرفضا مقام پر ہونے کی وجہ سے تعلیمی مرکز بن سکتا ہے اور وہاں کے مقامی بچوں کے علاوہ باہر کے لڑکے پڑھ سکتے ہیں، انجمن خیرالاسلام نے بھی سنا ہے کہ اس طرح کے اسکولوں کے جاری کرنے کا کام تیزی سے کردیا ہے، وہ بھی اس کو سوچے، مگر اصل کام ان لوگوں کا ہے جو اس کے فنڈ کے مالک بنے ہیں، اور وہاں کے غریب اور بے زبان لوگوں کا حق ان کو نہیں مل رہا ہے۔

چند سال سے یہاں کے چند باہمت جوانوں اور دوراندیش لوگوں نے مل کر ایک انجمن ''مسلم شوسل آرگنائشن'' قائم کی ہے جس کا مقصد اسکول اور دینی مدرسہ قائم کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی معاشی ومعاشرتی حالت درست کرنا ہے، عورتوں میں صنعت اور دست کاری کا رواج دینا، ان کو سلائی وغیرہ سکھانا بھی شامل ہے، خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جو یہ کام لیکر اٹھے ہیں، وسائل کی کمی کے باعث قدم قدم پر دوسروں کے تعاون کے محتاج ہیں۔

ماتھران میں ایک دینی مدرسہ محمدیہ ایک سال پہلے ۲۴۔مئی ۱۹۶۸ء کو قائم کیا گیا جس کے کئی لوگ ممبر ہیں، مدرسہ محمدیہ کا جلسہ ہوا پہلے بچوں نے پانچوں کلمے، قرآن کی سورتیں، قرأت اور کچھ تقریر سنائیں، ماشاء اللہ ایک سال کے اندر مدرسہ نے کافی ترقی کی ہے، اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو یہ بچے یہ دینی باتیں اور دینی تعلیم کیسے حاصل کرتے، ظاہر ہے کہ کورے کہ کورے رہ جاتے، باہر کی امداد کے بغیر یہاں کا مدرسہ یا اسکول یا اور کوئی قومی وجماعتی کام نہیں چل سکتا، مقامی لوگ غریب، محنت کش اور پس ماندہ ہیں آخر میں میں نے گھنٹہ سوا گھنٹہ ان کے معیار کے مطابق اسلامی تعلیم اور دینی زندگی کی طرف توجہ دلائی، لوگ بڑی دلچسپی سے آخر تک سنتے رہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو دین پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (''البلاغ'' جولائی ۱۹۷۰ء)

گجرات کا علمی سفر (جون ۱۹۶۹ء)

گجرات سے میرا تعلق یوں ہے کہ بمبئی آنے سے پہلے میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں معلم و مدرس تھا، ملک کی تقسیم کی وجہ سے لاہور چھوٹ چکا تھا، خیال ہوا کہ اب خالص علمی زندگی اختیار کی جائے تاکہ جو مزاج مدرسوں کی چٹائیوں پر بنا ہے وہ صحافت کی کرسی کی نذر نہ ہو جائے، اور علمی استعداد و صلاحیت باقی رہے، مگر افسوس کہ ایک ہی سال میں وہاں سے بوریا بستر باندھنا پڑا، اس زمانہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل بڑے الجھاؤ میں چل رہا تھا طلبہ نے دوسرے اساتذہ کی طرح مجھ سے بھی تعلیم حاصل کی، جن میں چند لائق و فائق تھے ان ہی میں عزیز گرامی مولانا عبداللہ اسماعیل صاحب ناظم مدرسہ فلاح دارین ترکیسر، اور اس کے مفتی عزیز گرامی مولانا احمد ابراہیم بیمات صاحب تھے، جو ان دنوں نہایت ذوق وشوق اور اخلاص سے مدرسہ فلاح دارین میں علمی و دینی کام کر رہے ہیں، نیز مولانا تقی الدین صاحب ندوی مظاہری بھی یہیں حدیث کے مدرس ہیں، ان تینوں دوستوں کا بیحد اصرار تھا کہ میں ان کے یہاں آؤں اور ان کے علمی و تعلیمی کاموں کو دیکھ کر ہو سکے تو کچھ مشورہ دوں، ان کا مخلصانہ اصرار ہوتا رہا اور میں بعض مصروفیات کی وجہ سے حاضری سے معذور رہا، اور ۱۲؍ ربیع الثانی ۲۸؍ جون (۶۹ء) کو وہاں حاضری نصیب ہوئی، الحمدللہ کہ میں شہروں کی ہنگامی زندگی میں رہ کر اور بمبئی جیسے علم و تحقیق سے کورے شہر میں مدتوں زندگی گزار کر بھی اپنا ذہن و مزاج نہ بدل سکا، اسی لئے مجھے آج بھی مدرسوں اور ان کے ماحول سے بے حد دلچسپی ہے، مدرسہ فلاح دارین ترکیسر میں پہونچ کر میں نے محسوس کیا کہ میری پہلی

زندگی لوٹ آئی ہے، دودن تک خالص علمی اوردینی فضا میں عجیب سکون واطمینان اورکیف وسرورمحسوس ہورہا تھا، ان تینوں احباب کے علاوہ دیگر مدرسین ومعلمین جیسے مولانا محمد جان صاحب فاضل دیوبند، مولانا محمد یعقوب صاحب ندوی، مولانا ذوالفقار صاحب فاضل دیوبندوغیرہ نہایت اخلاص ومحبت سے پیش آئے، ان احباب کی قدردانی اورحسن سلوک سے مجھے اپنی کم مائیگی اوراپنے ماحول سے الگ زندگی گذارنے کا شدیداحساس ہورہا تھا اور جی چاہا کہ اب اسی ماحول میں زندگی بسر کرنی چاہئے۔

مدرسہ فلاح دارین نہایت پرفضا مقام پربستی کے مغرب میں واقع ہے، عمارتیں نہایت شاندار ہیں، مدرسہ الگ ہے جن میں عربی علوم وفنون کی تعلیم ہوتی ہے ،مکتب الگ ہے جس میں مقامی بچوں اوربچیوں کی پرائمری کی تعلیم ہوتی ہے، دورویہ شاندارعمارتیں اوردرمیان میں وسیع وعریض صحن کالجوں اوریونیورسٹیوں کی عمارت کو شرمارہا ہے، عربی فارسی اور گجراتی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچیوں کوسلائی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مدرسہ کی عظیم الشان مثلث عمارت میں حضرات اساتذہ کی درسگاہیں، دارالاہتمام ،اورکتب خانہ وغیرہ ہے، عربی کی منتہی تعلیم ہوتی ہے، دسویں کلاس تک انگریزی کی تعلیم بھی عربی طلبہ کے لئے ضروری ہے، طالب علموں کیلئے دارالاقامہ نہایت لمباچوڑااورشاندار بنا ہے، جس میں بہت سے الگ الگ کمرے ہیں، مدرسہ کا مطبخ بھی ہے جس سے تقریباً سوطلبہ کوکھانا دیا جاتا ہے، مطبخ میں ہفتہ بھر کے دونوں وقت کے کھانوں کی فہرست لٹکائی رہتی ہے، کھانے کے لئے ایک وسیع ہال میں پلاٹ رکھے ہوئے ہیں، مدرسہ کے وسیع وعریض صحن میں نہایت خوبصورت مسجد تعمیر ہورہی ہے، اس کی تکمیل کے بعد یہ علاقہ علمی ودینی بستی بن جائے گا، عربی درجہ کے طلبہ کی

تعداد تین پونے تین سو ہے، جن میں بہت سے جنوبی افریقہ کے ہیں جو نسلاً گجراتی ہیں اور وہاں سے دینی تعلیم حاصل کرنے یہاں آئے ہیں، طلبہ کا رہن سہن نہایت عمدہ، کپڑے صاف ستھرے اور ہر بات میں سلیقہ مندی ہے۔

سنیچر ۱۲؍ربیع الثانی کو دن میں ۳؍بجے ترکیسر پہونچا اور دوشنبہ ۱۴؍کو دوپہر میں وہاں سے ڈابھیل کے لئے نکلا ان دوتین دنوں میں مدرسہ کے اساتذہ کے حسن سلوک اور بے غرض محبت نے بہت زیادہ متأثر کیا، اور معلوم ہوا کہ آج بھی ہمارے یہاں انسانیت وشرافت کے یہ گہوارے یعنی مدارس اسلامیہ انسانیت سازی کے مرکز ہیں، مگر افسوس کہ اب تمام مدارس عربیہ کا حال بے حال ہورہا ہے، یہاں کا کتب خانہ اگر چہ نیا ہے مگر مولانا عبداللہ صاحب کے علمی ذوق اور حسن انتظام کی وجہ سے بہت ہی شاندار ہے، نادر ونایاب کتابیں موجود ہیں، مصر وشام اور دیگر ممالک کی عربی اور اسلامی مطبوعات کا نہایت اچھا ذخیرہ ہے، میں نے ان ایام میں اس کتب خانہ سے خوب خوب استفادہ کیا، کتب خانہ میری محبوب ترین جگہ ہے، میں جہاں جاتا ہوں پہلے اسی کی تلاش ہوتی ہے، اور جب کوئی نادر ونایاب کتاب مل جاتی ہے تو ساری مصروفیت اسی سے متعلق ہوجاتی ہے۔

دوشنبہ ۱۴؍ربیع الثانی کو عربی کے حضرات مدرسین وطلبہ کا ایک صاف ستھرا اجتماع مدرسہ دارالحدیث میں ہوا، مجھے خطاب کرنے کے لئے کہا گیا، میں نے کہا کہ آپ حضرات مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں میں تو خود آپ حضرات کے یہاں اس لئے آیا ہوں کہ اس ماحول میں کچھ دیکھ کر کچھ سن کر اپنے مزاج میں بشاشت اور تازگی پیدا کروں، اور اپنی تعلیمی وعلمی دنیا کو پھر سے آباد کروں، عربی علوم وفنون کی عظمت و اہمیت اور موجودہ دور میں صحیح زندگی کی ضرورت کو واضح کیا اور بتایا کہ آج دنیاوی علوم وفنون کی درس گاہیں جس سطحیت اور الجھن کا شکار ہیں ان سے توقع نہیں ہے کہ وہ آج

کے بیمار ماحول کو کوئی نسخۂ شفا دے سکیں، بلکہ شرافت وانسانیت اوردین ودیانت کے ہمارے یہی مرکز کچھ کر سکتے ہیں۔

ترکیسر سے ''التبلیغ'' نامی ایک ماہوار رسالہ گجراتی زبان میں شائع ہوتا ہے جس میں زیادہ ترمولا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ ہوتے ہیں،اس کے مدیر محترم مولانا غلام محمد صاحب نورگت ہیں،ان سے پہلے سے ملاقات تھی ،موصوف خود مظاہرالعلوم سہارنپور کے فاضل ہیں اورلڑکے کودارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم دلائی ہے،اس طرح وہ مجمع البحرین کہے جاسکتے ہیں،بہت محبت اوراخلاص سے ملتے رہے اوراپنے دولت کدہ پر بھی لوا گئے۔

ترکیسر میں ایک میرے پرانے عزیز کو بڑے عجیب طریقہ سے میری آمد کی خبر ملی،وہ سورت ضلع کے مکاتب ومدارس کی نگرانی میں یہاں آئے تھے اورکسی سے نہایت دل سوزی سے بتارہے تھے کہ فلاں مقام پر مسلمان جماعت کی دولڑکیاں غیرمسلموں کے یہاں چلی گئی ہیں،ہمارے فلاں استاذ جن دنوں ڈابھیل میں ہم کو پڑھارہے تھے ایسا ہی ایک حادثہ کہیں ہوا تھا تو انھوں نے اس پر یہ شعر کہا تھا۔

اس دور سے غیرت نے بساط اپنی لپیٹی
کافر سے بیاہی ہے مسلمان کی بیٹی

اس پر سننے والے نے کہا کہ آپ کے استاذ اسی ترکیسر میں آئے ہیں اورفلاں جگہ مقیم ہیں وہ بے چارے دوڑے ہوئے آئے ،جانبین کو اس ملاقات سے بے انتہا مسرت ہوئی ،اس وقت میں ان کا نام تک بھول چکا تھا اور پہچان نہیں سکا مگر تھوڑی ہی دیربعد پہچان گیا کہ یہ فلاں لڑکا ہے جو فلاں فلاں کتاب پڑھتا تھا،اسی طرح ترکیسر میں ایک حافظ صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے اور بتایا کہ میں نے آپ سے پڑھا ہے اورآپ اس زمانہ میں میرے گھر آچکے ہیں،قیام ڈابھیل کے زمانہ میں ایک

مرتبہ ترکیسر گیا تھا مگر اب یاد نہیں رہا تھا کہ کون لوا گیا تھا اور کس کے یہاں ٹھہرا تھا، ان حافظ صاحب سے مل کر یہ سب معلوم ہوا۔

علمی اور دینی یاد اور تعلق میں بڑی پائداری اور کشش ہوتی ہے اور یہ کبھی ضائع نہیں ہوتی اسی لئے تو دینی محبت و تعلق کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی افادیت بیان فرمائی گئی ہے۔

دوشنبہ ۱۴ربیع الثانی ۳۰رجون کو ظہر سے پہلے ترکیسر سے ڈابھیل کے لئے روانہ ہوا، ساتھ ایک منتہی طالب علم ڈابھیل تک آئے اور تھوڑی دیر کے بعد چلے گئے، جامعہ اسلامیہ چھوڑنے کے بعد ۱۸رسالہ مدت میں یہاں تیسری بار حاضری ہوئی تھی، اس کے عظیم الشان کتب خانہ سے ضروری اقتباسات لینے تھے، پچھلے کئی سالوں سے یہاں ہمارے ضلع کے مشہور عالم اور صاحب نسبت بزرگ جناب مولانا محمد ایوب صاحب مئوی شیخ الحدیث کے عہدہ پر ہیں، بڑے سیدھے سادے اور بھولے بھالے عالم ہیں، ان کے بھولے پن اور شفقت میں بڑی کشش ہے، مولانا حمد اللہ صاحب لکھنوی مدرس حدیث، مولانا عبدالعزیز صاحب مفتی و ناظم کتب خانہ، مولانا ابرار صاحب دھولیوی اور دوسرے اساتذہ سے خوب ملاقاتیں رہیں، مولانا محمد سعید بزرگ صاحب ناظم جامعہ بڑے اخلاص و محبت سے پیش آئے او بار بار فرماتے رہے کہ بمبئی سے یہ جگہ قریب ہے چلے آیا کیجئے آپ کے لئے کتب خانہ وقف ہے، ان دنوں جامعہ اسلامیہ تعلیم ترقی کے مراتب طے کر رہا ہے، اساتذہ عالم و فاضل ہیں اور طلبہ بھی چار پونے چار سو ہیں، جامعہ کی پرانی مسجد کی جگہ نئی مسجد سنا ہے کہ چار لاکھ کے خرچہ سے بن رہی ہے، طالب علموں کا دارالاقامہ کئی لاکھ کے صرفہ سے نہایت عظیم الشان عمارت کی شکل میں بنا ہے، مسجد اور ہوسٹل کو دیکھ کر خیال ہوا کہ یہ یورپ اور امریکہ کے اسلامک سنٹروں کا نمونہ ہے، اسی شان کی عمارتیں وہاں بنتی ہیں، چونکہ یہ سب افریقہ

کے گجراتی مسلمانوں کی توجہ سے بن رہا ہے اس لئے نقشہ بھی غالباً ان ہی کا ہے۔

دوشنبہ کی شام کو عصر اور مغرب کے درمیان حضرات مدرسین کے ساتھ ایک نشست رہی جو اپنے نتیجہ کے اعتبار سے یادگار رہے، مختلف موضوعات پر اہل علم سے گفتگو رہی۔

یہاں بھی میں نے جاتے ہی کتب خانہ کا رخ کیا جس سے اٹھارہ سال پہلے خوب خوب استفادہ کر چکا تھا اور تاریخ و رجال اور طبقات کی تقریباً ساری کتابیں درس و تدریس کی مشغولیت کے باوجود پڑھ کر ان سے اقتباس لیا تھا، اس موقع پر ایک حسن اتفاق سننے کے قابل ہے، میں نے کتاب الاصنام کلبی کی نکلوائی اور جونہی ورق الٹا تو اس میں آٹھ دس صفحات کی ایک قلمی کتاب نکلی، نظر پڑتے ہی تحریر پہچان گیا کہ میرے نوٹ ہیں جنھیں میں نے اس زمانہ میں ابو علی القالی کی کتاب الامالی سے نقل کئے تھے پرانے دور کی اس یادگار کو دیکھ کر بڑی حیرت اور ساتھ ہی حسرت بھی ہوئی کہ اس کتب خانہ نے میرے علمی شغف کی یادگار کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور یہ کہ اس کے بعد آج تک کسی نے یہ کتاب نہیں اٹھائی۔

افسوس کہ اب ہمارے مدرسوں میں کتب بینی اور مطالعہ کا ذوق وشوق روز بروز کم ہوتا جاتا ہے، یہ یادگار تحریر میں نے کتب خانہ کے ناظم اور جامعہ اسلامیہ کے ناظم کی اجازت سے لے لی۔

منگل ۱۵؍ربیع الثانی کی دوپہر میں طالب علموں کے کھانے کا انتظام دیکھا جدید ہاسٹل کی عظیم الشان عمارت کے پہلے درجہ پر وسیع وعریض ہال ہے جس میں بیک وقت پونے چار سو طالب علم کھانا کھا رہے تھے، سفید کپڑوں میں ملبوس یہ علم کی برات بڑے قرینہ سے کھا رہی تھی، کچھ طلبہ ان کو کھلا رہے تھے، معلوم ہوا کہ ہر جماعت کی باری رہتی ہے، اور وہ اپنی باری کے دن کھلانے کا انتظام کرتی ہے، فرشی نشست تھی

ایک سینی میں چار طالب علم کھاتے تھے، نہ کہیں شور وہنگامہ، نہ کہیں بدنظمی اور بے اصولی، نہ کہیں یہ لاؤ وہ لاؤ کی آواز بس سب لوگ اپنے اپنے کام میں خاموشی سے مصروف تھے، کھانے والے کھانے میں اور کھلانے والے کھلانے میں، ایک طرف چار چھوٹے چھوٹے بچے نظر آئے گویا الگ تھلگ تھے ان پر نظر پڑی تو معاملہ سمجھ میں نہ آیا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بچے افریقی نسل کے ہیں اور ابھی چند دن ہوئے آئے ہیں، وہ اپنی شکل وصورت اور رنگ میں سب سے الگ تھے اور قبائلی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان سب کی عمریں دس بارہ سال کے درمیان رہی ہونگی اور ایک بچہ تو اتنا چھوٹا تھا کہ شاید اب تک بستر پر پیشاب کرتا ہو، بہت ہی قابل رحم معلوم ہوتا تھا، مگر اس کے والدین نے دین کی تعلیم کے لئے اپنے اس جگر گوشہ کو جنوبی افریقہ سے ہندستان بھیجا تھا، ظاہر ہے کہ یہ بچے تعلیم مکمل کر کے ہی واپس ہونگے، ان سے میں نے اردو میں ایک آدھ جملہ پوچھا تو انھوں نے جواب دیا، ان چھوٹے بچوں کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی اور ان پر ترس آیا اور اسی دن شام کو بمبئی واپسی ہوئی۔

(ماہنامہ ''البلاغ'' جون ۱۹۷۰ء)

☆☆☆☆☆☆☆

احمد نگر کا علمی و دینی سفر (اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۶ / اور ۷ / شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ کو دارالعلوم احمد نگر کا سالانہ امتحان اور جلسہ تھا، اس میں شرکت کیلئے ۵ / شعبان مطابق ۱۷ / اکتوبر (۱۹۶۹ء) کو جمعہ کے بعد براہِ پونہ احمد نگر کیلئے روانگی ہوئی۔ ہم لوگ ٹرین سے پونہ پہونچے اور ۸ / بجے رات کوناگپور جانے والی ایک بس پر سوار ہو کر احمد نگر کیلئے راونہ ہوئے، تین گھنٹے کے بعد گیارہ بجے احمد نگر بس اسٹیشن پر پہونچے، دارالعلوم کے دو ذمہ دار حضرات یہاں آ گئے تھے، پونہ کے بعد سے یہ راستہ اندھیری رات، تَرشُّح اور سَر دہوا میں طے ہوا، یہاں سے تانگہ میں سوار ہو کر دارالعلوم کیلئے روانہ ہوئے۔ شہر ختم ہونے کے بعد دو میل پر ایک لق ودَق وسیع صحرا میں ہمیں اتارا گیا، جہاں دور سے روشنی نظر آتی تھی، معلوم ہوا کہ یہی دارالعلوم ہے، دَرحقیقت شہر احمد نگر سے دور میدان میں یہ حضرت محمد اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کی آخری قیام گاہ ہے، جسے مقامی زبان میں ’’خانقاہ عالم گیر‘‘ کہتے ہیں۔ یہ ایک وسیع وعریض احاطہ ہے جو پتھر کی چہار دیواری کے اندر واقع ہے جس میں ایک شاندار مسجد، حوض، کچھ کمرے، بارہ دری اور عالم گیرؒ کا ’’مَغسَل‘‘ ہے۔ یعنی یہیں ذوقعدہ ۱۱۱۸ھ میں آپ کی وفات ہوئی، اور اسی مقام پر آپ کو غسل دیا گیا، اس کے بعد خُلد آباد میں دفن کئے گئے، اس ویرانے کو آباد کرنے والے اساتذہ وتلامذہ نے بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کیا، جاتے ہی سب سے پہلے عشاء کی نماز اسی مسجد میں ادا کی جس میں حضرت عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ آخری ایام میں نماز اور وظیفہ میں

مشغول رہا کرتے تھے، تھوڑی دیر پہلے مولانا محمد عثمان صاحب مالیگانوی اور مولانا شمس الضحیٰ صاحب مالیگانوی تشریف لا چکے تھے، یہ حضرات نماز سے پہلے ہی فارغ ہو چکے تھے، سب نے مل کر کھانا کھایا اور تقریباً دو بجے سوئے، مگر ابتک ہمیں یہ نہ معلوم ہوا کہ ہم شہر سے کتنی دور اور کہاں پر ہیں، سمت کا بھی پتہ نہیں تھا، فجر کی نماز کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ایک شاہی قلعہ نما عمارت ہے جس کی برجیاں، گنبد اور دروازے اس ویرانہ میں اربابِ دین و دیانت اور اہل علم و فضل کیلئے ابتک چشم براہ تھے، یہاں تک کہ یہاں دارالعلوم کا اجراء ہو گیا۔ تفریح کیلئے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ یہ کئی میل کا میدان ہے جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور جگہ جگہ ٹیلے ابھرے ہوئے ہیں اور پانی کے تالاب ہیں اور اس میدان میں ماضی قریب کی بہت سی روایات دفن ہیں، ناشتہ کے بعد تحریری اور تقریری امتحانات شروع ہوئے، رات کو عشاء کے بعد شہر میں پہلا جلسہ ہوا جس میں شرکت ہوئی، اور ختم ہونے پر واپسی ہوئی اور ابتک گویا ہم نے شہر احمد نگر نہیں دیکھا، دوسرے دن باقی امتحانات ہوئے، اور شہر کے اندر باہر تاریخی مقامات کی سیر ہوئی، رات کو پھر دارالعلوم کا جلسہ شہر ہی میں ہوا، اور تیسرے دن بارہ بجے بذریعہ کار احمد نگر سے چل کر آٹھ بجے رات میں بمبئی پہونچے۔

تاریخی پس منظر:

احمد نگر دکن کے ان مرکزوں میں سے ایک ہے جہاں مغل سلطنت کے خلاف طاقتوں نے قبضہ کر کے اپنی اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ یہاں پر بحری حکومت قائم ہوئی تھی، یہ مقام دور دور سے سلسلہائے کوہ سے گھرا ہوا خود ایک قلعہ کے مانند ہے، جس کے درمیان شہر احمد نگر واقع ہے، یہاں کا قلعہ اپنی وسعت اور پائیداری میں جنوبی ہند کے مشہور قلعہ جات میں سے ہے۔ چاند سلطانہ یہیں کے حکمراں خاندان کی بہادر بیٹی تھی، جس کی شجاعت اور بہادری نے احمد نگر کو ایک شاندار تاریخ دی ہے، چاند سلطانہ

برہان نظام شاہ بحری کی ہمشیرہ تھی، سلطان بیجاپور علی عادل شاہ سے اس کی شادی ہوئی تھی۔علی عادل شاہ کے مرنے کے بعد اس کے بھتیجے ابراہیم عادل شاہ کی کفیل ونائب بنی اور سلطنت کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لی، ابراہیم عادل شاہ کے بلوغ کے بعد چاند سلطانہ احمد نگر چلی آئی، اور جب اکبر کے بیٹے مراد نے اپنے والد کے حکم سے احمد نگر پر فوج کشی کی اور قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس بہادر خاتون نے تنہا مقابلہ کیا اور اکبر کی فوج کو شکست دیدی، جب اکبر کی فوج ناامید ہوگئی تو قلعہ کی دیوار کے نیچے سے کئی جگہ سوراخ کر کے ان میں بارود بھر کر بیک وقت داغنا چاہا اہل قلعہ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے سوراخوں میں پتھر بھر دیئے مگر ایک طرف کی دیوار تقریباً سو ہاتھ بارود سے اُڑ گئی اور اس کی ہیبت سے بھگدڑ مچ گئی مگر چاند سلطانہ ننگی تلوار لئے ملبہ کے پاس آئی اور دیوار کا وہ حصہ بھروانا شروع کیا، بہت سے لوگ ناامید ہوکر اور ڈر کر بھاگ گئے مگر چاند سلطانہ وہاں سے اس وقت تک نہ ٹلی جب تک کہ دیوار ایک سو ہاتھ لمبی اور تین سو ہاتھ اونچی نہ ہوگئی، یہ دیکھ کر مراد نے چاند سلطانہ سے صلح کی بات چیت کی اور برار کو نذرانہ کے طور پر قبول کر کے وہاں سے چلا گیا، اس موقع پر تمام موافق ومخالف نے چاند سلطانہ کی بہادری اور دانشمندی کا اعتراف کیا، مگر بعد میں اس کے آدمیوں کو گمان ہوگیا کہ وہ اکبر بادشاہ سے مل گئی ہے، صورت یہ ہوئی کہ اس واقعہ کے بعد جب اکبر نے قلعہ اَسید کا محاصرہ کیا تو چاند سلطانہ کو ہو یقین ہوگیا کہ اب ملک کا بچنا محال ہے، اس لئے یہ تدبیر کی کہ فی الحال اکبر کو احمد نگر سونپ دے اور خود جنّیر میں جا کر مناسب وقت کا انتظار کرے اور احمد نگر واپس لینے کی تیاری کرے، اس تدبیر کو لوگوں نے اس کی چال سمجھا کہ وہ اس طرح سلطنت ختم کر رہی ہے، جس کے نتیجہ میں اس پر حملہ کر کے ۱۰۰۶ھ میں قتل کر دیا اور قلعہ احمد نگر کو اکبر کی یلغار سے محفوظ نہ رکھ سکے، احمد نگر کا چاند سلطانہ ہائی اسکول اس بہادر خاتون کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

احمد نگر بحری سلطنت کی مرکزیت، اپنے قلعہ، چاند سلطانہ، قاضی عبد النبی احمد نگری اور حضرت عالم گیرؒ کے آخری دور میں قیام ومقام کی وجہ سے ہندوستان کے مشہور مقامات میں ہے۔ آخر میں جنگ آزادی کے سپاہیوں کی اسیری قلعہ احمد نگر میں ہوئی جس سے مزید اس کی شہرت ہوئی، اور موجودہ دور میں اسے آزادی کا مرکز مانا گیا ہے۔ مسلم دور سلطنت کے آثارِ قدیمہ شہر کے اندر اور باہر جگہ جگہ گرے پڑے موجود ہیں، سیاحوں، مورّخوں اور محققوں کیلئے یہ شہر بڑی دلچسپی رکھتا ہے، آب وہوا کے اعتبار سے بھی بہت خوب شہر ہے، فوجی اہمیت کے لحاظ سے یہ مقام ہمیشہ مسلّم رہا ہے۔ آج بھی شہر کے مشرق میں کئی میل کا میدان ہندوستانی فوج کا علاقہ ہے، باہر دور دور تک اس کے کاروبار پھیلے ہوئے ہیں، آبادی تقریباً ایک لاکھ ہوگی۔ یہاں کے مسلمانوں کا اندازہ پندرہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ مسلمانوں میں کوئی خاص تجارت یا صنعت وحرفت نہیں ہے، علمی اور دینی اعتبار سے بھی ان کا حال کچھ زیادہ بہتر اور قابل اطمینان نہیں ہے۔ تین دن کے قیام کے دوران میں ہم نے صرف چار گھنٹے شہر اور یہاں کے آثارِ قدیمہ وغیرہ کو موٹر کار سے گشت کر کے ملاحظہ کیا، ظاہر ہے کہ کسی بڑے شہر کے بارے میں مختصر سے معائنہ کے بعد موثق معلومات نہیں دی جاسکتی، خاص طور سے جبکہ پہلے سے بھی معلومات کم ہی ہوں، بلکہ نہ ہونے کے درجہ میں ہوں۔

علمائے احمد نگر:

نویں اور دسویں صدی سے احمد نگر بھی جنوب کے دیگر مسلم علاقوں اور مرکزوں کی طرح اربابِ علم وفن اور اہل فضل وکمال کا گہوارہ رہا ہے، اور آخری دَور تک یہاں نامی گرامی علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہمارے علمی حلقہ میں شیخ عبد النبی احمد نگری صاحبِ دستور العلماء کی وجہ سے اس مقام کی علمیت پہچانی جاتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان سے بہت پہلے سے یہ شہر علماء کا مرکز تھا، اور یہاں کے بحری حکمراں علم وفن کے

قدرداں اور علماء وفضلاء کے ناز بردار تھے۔ برہان نظام شاہ متوفی ۹۶۱ھ کے دور میں شیخ طاہر بن رضی اسمٰعیلی ہمدانی، شیخ شاہ محمد نیشاپوری، ملا علی گل استرآبادی، مُلّا رستم جرجانی، ملا علی مازندانی، شیخ ایوب ابوالبرکہ، ملا عزیز اللہ گیلانی، محمد امانی استرآبادی، مولانا پیر محمد اور سید حسن مدنی جیسے اربابِ فضل وکمال احمد نگر میں موجود تھے اور برہان نظام شاہ ان کی مصاحبت میں علمی زندگی بسر کرتا تھا۔ مولانا پیر محمد شروانی احمد نگر کے علمائے کبار میں سے تھے، برہان نظام شاہ نے ان سے تعلیم حاصل کی تھی، اور اپنا مقرب بنایا تھا، احمد نگر میں ان کی مقبولیت کی دھوم مچی ہوئی تھی، برہان نظام شاہ نے ان کو خواجۂ جہاں دکنی کے پاس اپنا سفیر بنا کر قلعہ پریندہ بھیجا جہاں پہلے سے طاہر بن رضی حسینی اسمٰعیلی شیعی موجود تھے، مولانا پیر محمد نے ان سے محیطی پڑھی اور ایک سال تک رہ کر استفادہ کیا، اور واپس آکر برہان نظام شاہ سے ان کی قابلیت وعلمیت کا تذکرہ کیا تو اس نے ان کو احمد نگر بلاکر بڑی قدر ومنزلت کا مظاہرہ کیا اور ان سے شیعہ مذہب اختیار کیا، شاہی خاندان اور حشم وخدم میں سے تین ہزار آدمی اس کے ساتھ شیعہ بن گئے، منبروں پر بارہ اماموں کے خطبے پڑھے اور خلفائے ثلاثہ پر لعن طعن کیا گیا جس سے احمد نگر میں فتنہ برپا ہوا اور بارہ ہزار مسلمان مولانا پیر محمد پر ٹوٹ پڑے جنھوں نے طاہر کو بلایا اور یہ فتنہ برپا کیا کرایا، نیز برہان نظام شاہ پر انھوں نے حملہ کیا، یہ واقعہ ۹۲۸ھ کے بعد کا ہے۔

شیخ طاہر بن رضی حسینی ہمدانی متوفی ۹۵۶ھ کو اسمٰعیل بن حیدر صفدری شاہ ایران نے الحاد کی تہمت پر قتل کرانا چاہا مگر وہ کاشان سے بھاگ کر ہندوستان چلے آئے، اور گوا کے بندرگاہ سے بیجاپور آئے پھر قلعہ پریندہ میں سکونت اختیار کی جہاں شیخ پیر محمد احمد نگری سے ملاقات ہوئی اور ان کی وجہ سے احمد نگر آئے، برہان نظام شاہ نے قلعہ احمد نگر میں ان کے لئے مدرسہ کھولا، خود درس میں بڑی عقیدت سے شامل ہوتا تھا، ایک

مرتبہ اس کا لڑکا عبدالقادر بن برہان نظام شاہ بیمار پڑا اور جینے کی امید منقطع ہوگئی مگر طاہر بن رضی کے علاج ومعالجہ سے صحت ہوگئی، اسی موقع پر برہان نظام شاہ نے شیعی مذہب قبول کر کے پورے دکن میں اس کی اشاعت کی اور احمد نگر کی مسجدوں بازاروں ، سڑکوں اور خانقاہوں میں سبِّ صحابہ کو رواج دیا جس سے بڑا فتنہ برپا ہوا، اس کی تصنیفات میں کئی کتابیں ہیں، جن میں ایک رسالہ پالکی بھی ہے۔ ۹۵۶ھ میں احمد نگر میں انتقال کیا اور وہیں دفن بھی ہوئے، پھر چند سال کے بعد ہڈیاں کربلا میں دفن کی گئیں۔

شیخ احمد بن ابوبکر بن عبداللہ عیدروس تریمی حضرمی شافعی احمد نگریؒ بافقیہ کی کنیت سے مشہور تھے، آپ اولیاء سالکین میں سے تھے، حضرموت سے احمد نگر آئے، اور دسویں صدی میں وہیں فوت ہوئے۔

امیر جوہر شافعی دکنی احمد نگریؒ متوفی ۱۰۵۶ھ بچپن میں عرب سے ہندوستان آئے، ساتھ میں ان کے ایک بھائی بھی تھے، برہان نظام شاہ نے دونوں کو اپنی تولیت میں لے کر پہلے قرآن کی تعلیم دلائی، پھر شہ سواری اور بہادری کی تعلیم دلائی اور دو سو سواروں کے امیر بن گئے، شافعی مسلک کے بزرگوں میں سے تھے، مشائخ کی صحبت اٹھائی تھی، شیخ عبداللہ عیدروسی سے خرقہ خلافت پایا تھا، نماز، تلاوت اور درود میں رات دن لگے رہتے تھے، آخری دور میں بیجاپور چلے گئے اور وہیں ۱۰۶۵ھ میں فوت ہوئے، آپ کا تذکرہ خلاصۃ الاثر میں موجود ہے۔

حضرت مولانا قاضی عبدالنبی احمد نگری بن عبدالرسول بن ابومحمد بن عبدالوارث عثمانی ہندوستان کے آخری علمی حسنات وبرکات میں سے ہیں، ان کی کتاب دستور العلماء اسلامی علوم وفنون کا دائرۃ المعارف ہے، کئی جلدوں میں حیدرآباد سے چھپ کر شایع ہوئی ہے اور چلپی کی کشف الظنون کے بعد اسلامی علوم وکتب میں دوسری

کتاب ہے، آپ احمد نگر میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں، ان کے انتقال کے بعد شیخ عبداللہ احمد نگری اور سید بخش حسینی کرمانی خیرآبادی سے پڑھیں، پھر گجرات کا علمی سفر کیا اور شیخ قطب الدین عثمانی گجراتی، شیخ محمد حسن بن عبد الرحمٰن صدیقی گجراتی، وغیرہ سے بقیہ درسی کتابیں پڑھیں، نحو اور منطق میں یکتائے زمانہ ہوئے، اور آپ کی علمیت وقابلیت کا شہرہ ہوا۔ اس کے بعد احمد نگر کے قاضی بنائے گئے، ساتھ ہی درس وتدریس میں لگے رہے، آپ سے بہت سے اہل علم نے اخذِ فیض کیا، اور بہت سی کتابیں لکھیں جن میں جامع الغموض ومنبع الفیوض کافیہ کی نہایت مفصل شرح ہے۔ حاشیہ شرح تہذیب، حاشیہ میر زاہد ملا جلال، حاشیہ دستور المبتدی، حاشیہ خلاصۃ الحساب، حاشیہ حُسامی، حاشیہ مطوّل، حاشیہ شرح عقائد وحاشیہ شریفیہ اور ایک کتاب سیف المبتدین فی قتل المغرورین لکھی، ان سب میں دستور العلماء علوم وفنون کی بہت ہی جامع کتاب چار جلدوں میں تھی، جواب چھپ گئی ہے، آپ بارہویں صدی کے علمائے اسلام میں سے ہیں۔

ان علماء وفضلاء کے علاوہ اور بہت سے اہل فضل وکمال احمد نگر میں پیدا ہوئے اور یہاں پر عرب وعجم کے علماء ومشائخ کی انجمن آباد تھی، اور احمد نگر کے قلعہ کے اندر اور باہر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ بادشاہ احمد نگر نے شہر میں ایک بہت بڑا دار العلوم بنوایا تھا جس میں مسجد، درس گاہیں، اساتذہ وتلامذہ کیلئے کمرے، غرض کہ ہر قسم کے لوازم اور سامان راحت موجود تھے، یہ جگہ اب ویران ہے، اور کوٹلہ کے نام سے مشہور ہے، اور یہاں کی علمی تاریخ نے اپنے آپ کو دُہرایا ہے اور خانقاہ عالم گیر میں پھر ایک دار العلوم قائم ہوا ہے۔

مشہور تاریخی مقامات:

احمد نگر میں مسلم آثار وعلائم نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے شروع سے

ملتے ہیں، جن میں قلعہ احمد نگر، بہشتی باغ، فرح باغ، روضہ باغ اور کوٹلہ مشہور ہیں، قلعہ کی سیر اس کے محافظ نگراں جانب محمد حنیف صاحب کی قیادت میں ہوئی، کالے پتھروں کا یہ مہیب قلعہ تقریباً دو مربع میل میں واقع ہے، جو اپنے اکھم پن اور وسعت میں جنوبی ہند کے مشہور قلعہ جات میں ہے، قلعہ کے باہر خندق کی گہرائی ابتک باقی ہے، اندر کوئی قدیم محل صحیح وسالم نظر نہیں آیا، اس میں فوج اور اس کے متعلق امور ومعاملات کا عمل دخل ہے، درمیان میں وہ مقام ہے جہاں کانگریس کے لیڈر قید کئے گئے تھے، چاروں طرف کمرے ہیں بیچ میں لمبا چوڑا صحن ہے، ہمارے لئے وہ کمرہ خاص طور سے جاذبیت رکھتا تھا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے صدیق مکرم کے نام ''غبارِ خاطر'' کے خطوط مرتب کئے تھے، ہر کمرہ کے باہر تختی لگی ہوئی ہے جس پر اس میں رہنے والے لیڈر کا نام اور مدتِ اسیری درج ہے، اور اس کی تصویر بھی آویزاں ہے، بعض جگہ قلعہ کی دیوار میں اندر اندر مکانات، کمرے اور سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر قلعہ غنیم کے ہاتھ سے فتح ہو جائے تو اس میں چھپا جاسکتا ہے، یا اس راستہ سے باہر نکلا جاسکتا ہے، درمیان میں وہ قدیم کنواں بھی ہے جس سے ہاتھی موٹ سے پانی کھینچا جاتا تھا اور اوپر چڑھا کر تمام قلعہ میں نہر کے ذریعہ پہونچایا جاتا تھا، اندر کچھ انگریز فوجی افسروں کی قبریں بھی تھیں۔

احمد نگر کی تمام قدیم عمارتوں میں قلعہ سب سے زیادہ مضبوط عمارت ہے، شہر میں ایک نہایت ہی شاندار عمارت کوٹلہ کے نام سے مشہور ہے جس کے درمیان وسیع وعریض صحن اور تین طرف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ دَروازہ کا حصہ پُرشکوہ عمارتوں پر مشتمل ہے اندر نہایت شاندار مسجد ہے، کہتے ہیں کہ یہ دارالعلوم تھا جس کی موجودہ شکل شہادت دے رہی ہے، مگر اب اس خرابے میں گندے فقیر فقراء اور گرے پڑے لوگ سکونت پذیر ہیں، چھتیں، کمانیں اور دروازے گر رہے ہیں، مسجد نہایت اچھی حالت

میں ہے مگر موجودہ حالت میں یہ مسجد نہیں ہے بلکہ عاشورخانہ یا درگاہ بنی ہوئی ہے، اندر نہایت گندگی ہے، غیر مسلم مردوں اور عورتوں کی آمدورفت رہتی ہے، جن، بھوت اور سایہ چھڑانے کیلئے اس میں عورتیں آتی ہیں، اس کا موجودہ متولی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین کی عظمت سے بالکل ہی محروم ہو چکا ہے۔ کم ازکم مسجد کو تو مسلمانانِ احمد نگر کو ان شرنارتھیوں (پناہ گزینوں) کے ہاتھ سے واگذار کرانا چاہئے، جو اس میں اپنے جھونپڑوں سے زیادہ گندگی کرتے ہیں، مسجد کے بیرونی پھاٹک کے دونوں جانب دو بڑے بڑے سنگین کتبے رکھے ہوئے ہیں جن پر اس عمارت اور مسجد کی تاریخ اور بانی کے نام وغیرہ درج ہیں۔

شہر سے تقریباً دو میل دور شمال میں بہشتی باغ کے نام سے کھیتوں میں نہایت شاندار عمارتیں بنی ہوئی ہیں، جو ویرانی و بربادی کی نذر ہو رہی ہیں، آمنے سامنے پُرشکوہ دو عمارتیں ہیں جن کے درمیان میں کسی زمانہ میں مصنوعی تالاب بنایا گیا تھا، اس تالاب میں شاہی زمانہ کی پختہ نہر کے ذریعہ پانی جاتا تھا، راستہ میں پختہ نہر کا پشتہ ابتک کہیں کہیں دور تک نظر آتا ہے جو چونے اور اینٹ سے بنا ہوا ہے، اور اس کے بیچ میں مٹی کی پکائی ہوئی نہر ہے۔ روضہ باغ کے نام سے شاہی قبرستان ہے جس میں کئی شاندار روضے اور قُبّے ہیں، ان میں اکثر تباہی و بربادی کی نذر ہیں، قبر کا تعویذ غائب کر دیا گیا ہے، دیواروں اور چھتوں پر قرآنی آیات ابتک موجود ہیں، یہاں کی عمارتوں میں صرف ایک عمارت جس میں غالباً بُرہان نظام شاہ کا مزار ہے آثارِ قدیمہ کی تحویل میں ہے، باقی سب کی سب حوادثِ زمانہ کی نذر ہیں، فرح باغ شہر کے دکھن جانب میدان میں نہایت شاندار عمارت ہے جسے برہان نظام شاہ (۹۱۴ھ ۱۵۰۸ء، ۹۶۱ھ ۱۵۵۳ء) نے بنوایا تھا، پہلے اسے جہانگیر خاں نے اپنی نگرانی میں بنوایا مگر بادشاہ کو یہ عمارت پسند نہیں آئی تو نعمت خاں کو دوبارہ تعمیر کا حکم ہوا اور اس نے پہلی عمارت گرا کر بنوانا شروع

کیا پھر صلابت خاں اس کا ذمہ دار ہوا اور اس کے بھتیجے صلابت خاں دوم نے ۹۹۱ھ میں مکمل کرایا، یہ عمارت کسی زمانہ میں بڑی حسین وجمیل رہی ہوگی، اس کے سامنے بھی مصنوعی تالاب تھا اور اب آثارِ قدیمہ کے ماتحت ہے، یہاں کی مشہور عمارتوں میں صلابت خاں کا مقبرہ بھی ہے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے اور ہم اسے نزدیک سے نہیں دیکھ سکے، یہاں کی تمام عمارتیں پتھروں اور پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ دیواروں میں جگہ جگہ مضبوط اور اکھم لکڑیاں لگائی گئی ہیں تا کہ دیوار کا وزن ان پر بھی رہے اور اونچی دیوار بیٹھنے نہ پائے، چھتوں میں بھی لکڑیاں لگی ہوئی ہیں، قلعہ احمد نگر کے علاوہ یہاں کی تمام قدیم عمارتیں بری طرح حوادث کا شکار ہیں اور چار سو سال سے کم ہی کی مدت میں اپنی عمرِ طبعی ختم کر چکی ہیں، قبے، دیوار، چھتیں درمیان سے پھٹ پھٹ گئی ہیں، یہاں کی عمارتوں میں کشتی کے لنگر کا نشان پایا جاتا ہے اور تقریباً ہر عمارت میں ایسی عبارتیں ہیں جن سے شیعیت نمایاں ہوتی ہے، کیوں کہ یہاں کے حکمراں بحری اور شیعہ تھے۔ شہر میں جگہ جگہ اس دور کی مسجدیں اور مقبرے واقع ہیں، کہتے ہیں یہاں ہر حاکمِ اعلیٰ یا فوجی افسر کے نام سے مسجدیں ہیں، شہر میں اس طرح کی کل ۷۰-۷۲ر مسجدیں ہیں۔

خانقاہِ عالم گیر:

ہمارے نزدیک ان تمام قدیم عمارتوں میں سب سے زیادہ کام کی عمارت خانقاہِ عالم گیر ہے، جو شہر سے تقریباً دو میل دور مشرق میں دامن کوہ میں واقع ہے، اور اپنے محلِ وقوع اور پس منظر کے اعتبار سے بڑی پُرسکون، روحانیت بخش اور سحر افزا ہے، جب شہنشاہ محمد اورنگ زیب عالم گیرؒ اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہاں آئے تو فرمایا: ''احمد نگر مقام اختتام است'' یعنی ہمارے سفر زندگی کی آخری منزل احمد نگر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور آپ نے اسی مقام پر زندگی کے باقی دن عبادت وریاضت اور

سفر آخرت کی تیاری میں بسر کیئے۔ اس مقام سے انھوں نے شاہزادہ اعظم کو کو جو خط لکھا تھا، اس میں یہ الفاظ تھے:

''میں بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہوں، جب پیدا ہوا تھا تو میرے ارد گرد بہت لوگ تھے، آج دنیا سے تنہا رخصت ہو رہا ہوں، مجھے دُکھ ہے کہ اپنی رعایا کی بجا طور پر خدمت نہ کر سکا اور میرے شب و روز یونہی بے سود گزر گئے، بیتے ہوئے دن اب لوٹ کر نہیں آئیں گے میرے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے، ہڈی اور چمڑے کے سوا اب مجھ میں رکھا ہی کیا ہے، دنیا میں خالی ہاتھ آیا تھا، گناہوں کا بوجھ لے کے لوٹ رہا ہوں، معلوم نہیں ان گناہوں کی کیا سزا ملے گی، خدا سے رحم و کرم کا طالب ہوں، الوداع اے میرے بیٹے الوداع۔''

اور سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کے نام بھی اسی قسم کا حسرت آمیز خط لکھا، جس میں لکھا تھا کہ:

''وقت آخر آپہونچا ہے، جدھر نظر اٹھتی ہے خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔''

ان خطوط کے لفظ لفظ سے حضرت عالم گیرؒ کی خدا ترسی، احساسِ ذمہ داری اور اعترافِ تقصیر کا ظہور ہوتا ہے، ان کو ہر طرف خدا کا جلوہ آخری وقت اسی مقام پر نظر آرہا تھا حتیٰ کہ اسی مقام میں موت آگئی اور یہیں غسل و کفن دیا گیا، مُغسل کے نام سے یہ مقام مسجد اور بارہ دری کے وسط میں حوض کے سامنے موجود ہے، عالم گیرؒ کے یہاں پر نہلانے اور کفنانے کی شان ان کے اس وصیت نامہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

''میری تجہیز و تکفین ان روپئے سے کی جائے جو ٹوپیوں کی سِلائی سے پس انداز کیئے گئے ہیں، یہ ساڑھے چار سو روپئے ہیں۔ تین سو روپئے قرآن شریف کی کتابت کی اُجرت کے ہیں، ان کو فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا جائے، میں گنہ گار ہوں مجھے برہنہ سر کفنایا جائے، جب کوئی گنہ گار خدا کے حضور میں عجز و انکساری سے

حاضر ہوتا ہے تو اس پر اس کی رحمت ہوتی ہے، میرے کفن میں گاڑھے کی سفید چادریں استعمال کی جائیں، جنازہ کا جلوس ہرگز نہ نکالا جائے، آخرت کی پہلی منزل قبر تک پہونچانے میں جلدی کی جائے، مردے ہمیشہ زندوں کے محتاج ہوتے ہیں۔

یہ باتیں ذوقعدہ ۱۱۱۸ھ کی ہیں اوران پر تقریباً ۲۷۱ رسال گزر چکے ہیں، مگر پونے تین صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی فضا میں وقار و تمکنت اور دین ودیانت کی خوشبو تیر رہی ہے اور اس دارالعلوم کی تشکیل نے عالم گیرؒ کی بے تاب روح اور لرزاں دل کے لئے سامانِ سکون پیدا کردیا ہے، یقیناً عالم گیر کی اس آخری قیام گاہ میں آج **قال اللہ وقال الرسول** کی صدا ان کے حق میں صدقۂ جاریہ بن کر باعثِ اجروثواب ہوتی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم قاضی حشمت اللہ صاحب انعام دار پونا والے کو جزائے خیر دے اوران کے نامۂ اعمال میں صدقۂ جاریہ لکھے جن کے قبضہ میں یہ عمارت تھی اور جنھوں نے ۱۹۶۶ء میں اسے دارالعلوم کے لئے دیدیا، ورنہ یہ عمارت میدان میں بڑی پڑی غارت ہوجاتی اور گنواروں اور چرواہوں کے کام آتی، اس طرح ہندوستان میں ہزاروں شاہی عمارتیں آبادیوں اور ویرانوں میں خاک کا ڈھیر ہورہی ہیں، اگر مسلمان ان کو اپنے دینی، تعلیمی، صنعتی اور معاشرتی امور ومعاملات کیلئے استعمال کریں تو ان کا برمحل استعمال بھی ہو اور لاکھوں کے خرچہ سے نجات بھی رہے، مگر کچھ تباہی کی نذر ہیں، کچھ مجاوروں اور قبر پرستوں کے قبضہ میں ہیں، اور تھوڑی بہت آثارِ قدیمہ کے ماتحت ہیں۔

دارالعلوم:

دارالعلوم احمد نگر چند دیندار اور دردمند مسلمانوں کی بہترین جدوجہد کا ثمرہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں سنہری مسجد احمد نگر میں ایک مدرسہ کی شکل میں ظاہر ہوا، اس دور میں

یہاں کی محترم ہستی جناب مولانا حکیم محمد تقی صاحب خورجوی مرحوم اور اسسٹنٹ کلکٹر جناب عبد العزیز صاحب مرحوم اور دوسرے چند مخلصین نے اس کی نگرانی کر کے پروان چڑھایا، حتیٰ کہ ۱۹۶۶ء میں شہر کے باہر موجودہ عمارت خانقاہِ عالم گیر میں مدرسہ دارالعلوم کے نام سے جنوبی ہند کی ایک مثالی دینی درس گاہ بن گیا، جہاں اسکول کی مروّجہ تعلیم کے بعد درسِ نظامی کے قدیم نصاب کے مطابق عربی اور دینی تعلیم کا معقول انتظام ہے، ابتداء سے لیکر جلالین اور مشکوٰۃ شریف تک تعلیم ہوتی ہے اور پرائمری کے نصاب شہر میں سنہری مسجد میں جاری ہیں، اس دارالعلوم میں بیلگام، سانگلی، کولہا پور بیڑ، اورنگ آباد، پونہ، بمبئی، امراوتی، مالیگاؤں، مدراس، سری رام پور، جامنیر، جام نگر اور شولا پور وغیرہ کے کل ۱۱۲؍ طلبہ ہیں، جن میں عربی درجات کے اَسّی اور حفظ کے بیس طلبہ ہیں۔ خانقاہ اور مسجد کی مختلف عمارتوں میں درس گاہیں، دارالاقامہ، مطبخ اور کتب خانہ وغیرہ واقع ہیں، ہر علم وفن کی ۳؍ ہزار کتابیں ہیں، میرا قیام کتب خانہ میں رہا، اس میں ابن اثیر، مفردات امام راغب اور الکتاب سیبویہ، جیسی نادر ونایاب موجود ہیں جن سے میں نے استفادہ کیا، طلبہ کو مطبخ سے دونوں وقت کھانا اور ناشتہ ملتا ہے نیز ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزیں ان کیلئے مدرسہ فراہم کرتا ہے، اس دارالعلوم کا پہلا سالانہ بجٹ تین ہزار تھا، آج ۵۵؍ ہزار ہے اور یہ سب رقم مسلمانوں کے تبرعات اور چندوں سے پوری ہوتی ہے، اس کی کوئی مستقل آمدنی یا وقف اور جائداد نہیں ہے، اس کے سرپرستوں محترم مولانا حکیم محمد تقی صاحب کا اسم گرامی سرِ فہرست ہے، موصوف بڑے اخلاص سے مدرسہ کی ہر ممکن خدمت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جناب محمد حنیف صاحب گورنمنٹ کنٹراکٹر، جناب عبد الرحمٰن مالک صاحب، اور جھنڈی گیٹ احمد نگر کا باہمت نوجوان طبقہ، مقامی تبلیغی جماعت اور پونہ مالیگاؤں، ڈونڈ وغیرہ کے حضرات، مدرسہ کے اراکین و بہی خواہاں ہیں، الغرض دارالعلوم احمد نگر جنوبی ہند میں دینی علم کی

روشنی کا مینار ہے، مولانا مخدوم حسین صاحب صدر مدرس، مولانا عبدالحق صاحب مظاہری، مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا محمد نسیم صاحب، قاری محمد اسمٰعیل صاحب میواتی، حافظ امیر حمزہ نہایت اخلاص اور ذمہ داری کے ساتھ درس وتدریس اور طلبہ کی تربیت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ جناب محمد شفیع صاحب احمد نگری محاسب ہیں اور بڑے دلچسپ اور بااخلاق انسان ہیں، پہلے اسٹیشن ماسٹر تھے اب اپنا ذاتی کاروبار کرتے ہیں اور مدرسہ کی خدمت میں لگے رہتے ہیں، ساتھ ہی تبلیغی جماعت کے سرگرم رُکن ہیں، مخلص اور مجلسی آدمی ہیں، طلبہ سیدھے سادے ہیں، ان میں نہ اسٹرائک کا جذبہ ہے، نہ ان کی کوئی مانگ ہے، اور نہ کسی قسم کی بے راہ روی ہے، نہایت بے تکلف زندگی بسر کرتے ہیں۔ صبح وشام میدان میں کھیل کود میں رہتے ہیں، دن میں دونوں وقت پڑھتے ہیں اور رات میں مطالعہ کرتے ہیں، ان سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی کیونکہ اب ہمارے مدارس عربیہ کے طلبہ زمانہ کی ہوا کھا کر بے راہ ہونے لگے ہیں مگر یہاں کے طلبہ میں یہ بات نہیں ہے، ان کا تعلیمی معیار بہت اچھا ہے اور ٹھوس استعداد پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، یہاں سے دو عالم اور بعض حفاظ باہر جا کر فارغ بھی ہوئے ہیں، ہمارے خیال میں یہاں کے طلبہ کو دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارنپور یا اسی قسم کی ٹھوس درس گاہوں میں منتہی تعلیم کیلئے بھیجنا مناسب ہے۔

۶/اور ۷/شعبان (۱۸/اور ۱۹/اکتوبر) کو دارالعلوم کا تحریری اور تقریری امتحان تھا میں نے بھی امتحان لیا، طلبہ مجموعی حیثیت سے بہت اچھے تھے اور توقع سے کامیاب معلوم ہوئے، یہ حضراتِ اساتذہ کی محنت وشفقت اور خود طلبہ کے علمی ذوق وشوق کا نتیجہ ہے۔ دوسرے ممتحن حضرات کے بھی یہی تاثرات تھے، مدرسہ کا جلسہ رات میں جھنڈی گیٹ شہر میں ہوا، اور دونوں جلسوں کی صدارت راقم کے ذمہ تھی، پہلے جلسہ میں مدرسہ کے طلبہ نے اُردو اور عربی میں تقریریں کیں، مکالمے پیش کئے، نعت اور

نظمیں سنائیں، آخر میں، میں نے ایک گھنٹہ تک مدرسہ کے بارے اپنے تاثرات ظاہر کئے اور موجودہ دور میں علمِ دین کی ضرورت اور مسلمانانِ احمد نگر کے موقف کے عنوان پر تقریر کی۔ دوسرے جلسہ میں مولانا محمد تقی صاحب نے مدرسہ کی روداد پیش کی اور مولانا شمس الضحیٰ صاحب مالیگانوی اور مولانا محمد عثمان مالیگانوی نے تقریریں کیں، اس کے بعد مولانا ظل الرحمٰن صاحب صدیقی (بمبئی) نے دیر تک مجمع کو خطاب کیا، شہر والوں کی آسانی کے لئے مدرسہ کا جلسہ شہر میں رکھا گیا، کیونکہ مدرسہ کافی دور واقع ہے، مگر ہمارا خیال ہے کہ مدرسہ کا جلسہ آئندہ اسی مقام پر ہونا چاہئے جہاں مدرسہ واقع ہے۔ کھلی فضا اور شاہی عمارات میں دو دن دورات علمی اور دینی جشن بہت خوب رہے گا، اور اس روحانی میلہ میں مسلمان شریک ہو کر یادگار مسرت محسوس کریں گے۔

(''البلاغ''، بمبئی، مارچ، اپریل ۱۹۷۰ء)

☆☆☆☆☆☆☆

کوکن کا علمی سفر (مئی ۱۹۷۲ء)

۲۹۔ربیع الاول سے ۳۔ربیع الثانی (۱۴۔مئی سے ۱۷۔مئی) تک تین دن تک کوکن کے ایک مشہور قصبہ شری وردھن میں گذرے، ان ایام میں وہاں کے مدرسہ حسینیہ کے سالانہ امتحان اور جلسہ میں شرکت ہوئی اس اعتبار سے یہ سفر بہت خوشگوار رہا کہ بہت دنوں کے بعد ایک مدرسہ کے عربی طلبہ و مدرسین اپنے زمانۂ طالب علمی کے انداز میں ملے، روانگی سریتا نامی جہاز سے اور واپسی موٹر کے ذریعہ ہوئی۔

اب سے پندرہ سولہ سال پہلے کوکن کا سفر بہت زیادہ ہوتا تھا اور مختلف دینی و علمی تقریبات میں وہاں کے اکثر مقامات میں آنا جانا تھا، تھانہ، قلابہ، اور رتنا گیری کے ساحلی و جبالی علاقے کوکن کہلاتے ہیں، جو شمال سے جنوب تک لمبائی میں واقع ہیں، اور مغرب سے مشرق تک چوڑائی مختلف مسافتوں میں واقع ہیں، ان میں اکثر عرب نسل کے مسلمان آباد ہیں جن کے آباء واجداد بہ سلسلۂ تجارت یہاں آباد ہو گئے تھے، اور ہند و عرب کے سواحل پر ان کی تجارتی سرگرمیاں جاری تھیں، آخر دور میں پرتگیزیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کر کے بڑا ظلم و ستم کیا، یہاں کے باشندوں سے تجارت چھین لی، ان کو زبردستی عیسائی بنایا اور بے انتہا مظالم کئے، اس کی تفصیل علامہ **زین الدین معبری ملیباری** کی کتاب "**تحفة المجاهدين في اخبار البرتگالین**" میں موجود ہے۔

یہاں کے کئی مسلمان تجارت کے ساتھ بڑے علم دوست اور دیندار تھے، ان میں اچھے اچھے علماء و فضلاء اور اہل اللہ پیدا ہوئے ہیں، وابول خاص طور سے آخری

دور تک علم دین کا مشہور مرکز رہ چکا ہے، بارہویں صدی ہجری میں یہاں ایک عالم قاری علی کوکنی تھے جن کو ''ملا علی قاری کوکنی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ مشہور محدث اور امام ''ملا علی قاری ہروی'' مصنف مرقات شرح مشکوٰۃ کی طرح ہندوستان کے ملا علی قاری تھے، ان کی بعض تصانیف بھی ہیں، اسی طرح یہاں ایک عالم وفاضل علامہ غیاث الدین کوکنی سورت میں سنہ ۱۱۶۱ھ میں موجود تھے، جن سے شیخ عبدالرحمان بن مصطفیٰ مصری متوفیٰ سنہ ۱۱۹۰ھ نے تعلیم حاصل کی، اور سورت میں شیخ محمد فاخر، شیخ غلام علی، حافظ یوسف سورتی، شیخ عزیز اللہ ہندی وغیرہ تھے، جن سے شیخ عبدالرحمان مصری نے حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی ان کا تذکرہ علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی نے معجم المشائخ میں کیا ہے، جس کا قلمی نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام میں موجود ہے۔

ماضی قریب میں رتنا گیری میں مولانا محمد اسماعیل صاحب مشہور عالم ومصنف گذرے ہیں، جنھوں نے اردو زبان میں کئی اہم کتابیں تصنیف کیں ہیں، جن میں سے کئی مطبوع ہیں، انھوں نے رتنا گیری میں ایک مطبع بھی قائم کیا تھا، مگر آخر میں یہ علاقہ علم دین کے برکات وحسنات سے تقریباً محروم ہو چکا تھا، مدرسہ محمدیہ بمبئی کے فیوض واثرات ابھی جلدی تک یہاں نمایاں تھے، اور یہاں کے تعلیم یافتہ علماء کوکن کے مختلف مقامات میں موجود تھے، مگر اہل بمبئی کی بدقسمتی سے یہ مدرسہ اسکول میں تبدیل کر دیا گیا اور دینی وعربی مدرسہ کے بارے میں یہ بدقسمتی یہاں آج بھی باقی ہے، اور جو مدرسے دین کے نام پر قائم ہوتے ہیں ان کو آہستہ آہستہ اسکول بنانے کا کام ہوتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بمبئی جیسے عظیم الشان شہر مین یہاں کے باشندوں میں شاید ہی کوئی متدین اور قابل اعتماد اور ذی استعداد عالم وفاضل یا حافظ وقاری ہو، یہی محرومی کوکن میں بھی عام تھی، مگر پچھلے چند برسوں میں یہاں سے طلبہ دارالعلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل مدرسہ حسینیہ راندیر، ندوۃ العلماء لکھنو وغیرہ سے دینی تعلیم حاصل

کر کے فارغ ہوئے، اتنے وسیع وعریض علاقہ میں کسی بڑے دینی مدرسہ کا نہ ہونا اوراس کا حفاظ قرآن تک سے خالی ہونا بدقسمتی تھی، مگر ہر رات کی صبح ہوتی ہے، اورایسا نہیں ہے کہ کسی جگہ جہالت ہی جہالت رہے، چنانچہ علاقہ کوکن میں حالات میں انقلاب برپا ہوااورایک مردقلندر کی توجہ نے یہاں علم دین کوفروغ دیا، اوردنیاوی تعلیم کے عام ہونے کے ساتھ دینی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دلائی اورایک مدرسہ جاری ہوگیا۔

ہندوستان کے مشاہیر علماءفضلاء میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے کوکن کی کھاڑیوں اور پہاڑیوں میں جا کرعلم دین کی روشنی کا دیا جلایا، اب سے تقریباً بیس سال پہلے شری وردھن کےایک صاحب گئے اورحضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بیعت ہوئے، کہنا چاہئے کہ ان ہی کی وجہ سے حضرت مولانا یہاں تشریف لائے۔

شری وردھن کے پہلے سفر میں راقم بھی قافلہ کے ساتھ تھا، معلوم ہوتا تھا علم وروحانیت کی بارات نکل رہی ہے، اس دن جہاز مدرسہ اورخانقاہ معلوم ہوتا تھا، کوکن اوربمبئی کے بہت سے متوسلین ومعتقدین ہم سفر تھے، جہاز کا پوراعملہ ہمہ تن خدمت بنا ہوا تھا، حضرت مولانا نے اس سفر میں قرآن کی تعلیم عام کرنے اورشکل وصورت شرعی بنانے پر بیحد زور دیا تھااوران کا پوراوعظ اسی موضوع پر ہوا تھا۔

اس کے بعد جب دوسری بارتشریف لے گئے تو اسی بات پرزور دیا اور جب معلوم ہوا کہ خطہ کوکن میں کوئی حافظ قرآن نہیں ہے تو حفظ قرآن کی طرف خصوصی توجہ دلائی اور متوسلین ومعتقدین نے ارادہ کیا کہ مدرسہ حفظ قرآن کا قیام ضروری ہے، چنانچہ دوحضرات نے اخراجات کا بار اٹھایا اور ے۔شعبان ۱۳۸۴ھ کوشری وردھن میں مدرسہ حفظ قرآن کا افتتاح ایک مسجد میں ہوگیا، بارہ مقامی بچوں نے داخلہ

لیا، اور چار سال گذرتے گذرتے یہاں سے تین حفاظ پیدا ہو گئے، جس سے لوگوں کی امید برآئی اور حوصلہ مندی نے مزید اقدام کی ہمت پیدا کی، چنانچہ ۱۱۔ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ کو درجہ فارسی کا افتتاح ہوا جس میں تین مقامی اور دو بیرونی کل پانچ بچے شریک ہوئے پھر بارہ ہو گئے، دوسرے سال عربی کا پہلا درجہ جاری ہوا، تیسرے سال دوسرا درجہ اور اب عربی کا تیسرا درجہ بھی جاری ہو گیا ہے، اس وقت درجات کے لحاظ سے طلبہ کی تعداد یہ ہے، درجہ حفظ میں ۳۸، ناظرہ میں ۱۵، درجہ عربی اول میں ۱۲، دوم ۱۰، سوم میں ۸، طلبہ کی مجموعی تعداد ۸۹ ہے، جن میں ضلع قلابہ کے مختلف مقامات کے طلبہ زیادہ ہیں، اس کے بعد ضلع رتنا گیری کا نمبر ہے، پونہ اور کولھاپور کے بعض طلبہ ہیں۔

مدرسہ اپنی عمارت کے لحاظ سے ابھی ابتدائی حالت میں ہے پھر بھی دو عمارتیں درسگاہ کے طور پر زیر استعمال ہیں، مسجد میں بھی تعلیم ہوتی ہے، دارالاقامہ اور مطبخ کا معقول انتظام ہے، مستطیع طلبہ خوراک کی فیس داخل کرتے ہیں اور غیر مستطیع کا مدرسہ کفیل ہے، اس وقت دارالاقامہ میں ۵۷ طالب علم رہتے ہیں جن میں ۲۸ طالب علم خوراک کی فیس ادا کرتے ہیں، ناظرہ، حفظ، قرأت اور عربی کے لئے قابل اساتذہ ہیں، اور ماشاء اللہ سب کے سب نوجوان اور جوان ہیں، (۱) حافظ عبدالغفور صاحب انتولے (۲) مولانا سید عبد المنعم صاحب نظیر (۳) مولانا عبدالستار صاحب بروڈ (۴) مولانا بشیر احمد صاحب (۵) مولانا قاری یعقوب جان محمد صاحب (۶) مولانا حافظ محمد یعقوب صاحب نہایت حوصلہ مندی اور اخلاص سے تدریسی خدمت انجام دیتے ہیں،

گیارہ حضرات کی مجلس مشاورت یا انتظامی جماعت ہے جو مدرسہ کو بحسن وخوبی چلاتی ہے، اس کے مہتمم اور خزانچی جناب عبدالرحیم حاجی محمد بروڈ صاحب

ہیں، یہ مدرسہ اپنے محرک اور داعی حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے معنون ہے، نام کی نسبت بڑی بات ہے اس ادارہ میں علم دین روحانیت اور مجاہدہ کی روح کارفرما رہے گی، اس کی ابتدائی اٹھان سے پتہ چلتا ہے کہ انشاء اللہ اس کا مستقبل نہایت تابناک ہے، شری وردھن وسط کوکن میں واقع ہے، اور مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، عام طور سے علمی و دینی ادارے شہروں کی ہنگامہ آرائی سے دور رہ کر پرسکون فضاؤں میں پروان چڑھتے ہیں، اراکین و مدرسین ہمارے علم کے مطابق نہایت مخلص اور سرگرم ہیں، یہاں اراکین میں اقتدار کی جنگ اور مدرسین میں باہمی چپقلش اور ناظم و مدرس کی آویزش برائے نام بھی نظر نہیں آئی، ان ہی بیہودگیوں نے آج ہمارے علمی اور دینی اداروں کو بے روح کر دیا ہے اور جیسا کہ عام مسلمان ان کی مدد کرتے ہیں ان کے اندر کے یہ جراثیم ان کو تباہ کرتے ہیں، الحمدللہ کہ یہ بیماریاں یہاں نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ یہ درسگاہ آئندہ علاقہ کوکن بلکہ جنوبی ہند کی ایک مثالی اور معیاری دینی درسگاہ ثابت ہوگی۔

ہم نے تین دنوں میں یہاں کے اساتذہ و تلامذہ اور اراکین اور متعلقین کے اخلاق و اطوار دیکھے، اطمینان ہوا کہ ان کو دین اور دینی علم سے شغف ہے، طلبہ کی وضع قطع مدارس اسلامیہ کے عین مطابق پائی، ظاہری طور سے ان کے لباس صاف ستھرے اور سیدھے سادے ہیں، اساتذہ اپنے طلبہ پر مہربان اور طلبہ اپنے اساتذہ کے فرماں بردار نظر آئے، یہ بات اب مدارس اسلامیہ سے مفقود ہوتی جارہی ہے، آج کل کے بہت سے مدارس کی طرح یہاں کانٹ چھانٹ، چالاکی اور خودغرضی نہیں ہے، جس سے توقع ہے کہ یہ مدرسہ اندرونی بیماریوں سے محفوظ رہ کر روز بروز تندرست و توانا ہوگا، اور یہاں سے علاقہ کوکن میں صحت بخش ہوائیں چلیں گی۔

علمی سلسلے کی درازی اور افادیت کس قدر عام ہوتی ہے؟ اس کا اندازہ اس

مدرسہ میں یوں ہوا کہ راقم کے حلقۂ تلامذہ کے کئی نوجوان عالم یہاں درس وتدریس میں مشغول ہیں، اس کے اولین مدرس حافظ عبدالغفور انتولے مدرسہ مفتاح العلوم بھیمڑی کے ابتدائی طالب علموں میں ہیں جسے راقم نے قائم کیا تھا اور مدتوں اپنی نگرانی میں چلایا تھا، یہ تو براہ راست میری علمی خدمت کا ثمرہ ہیں، میں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں قیام بمبئی سے پہلے تعلیم دی تھی یہاں جن طلباء نے مجھ سے تعلیم حاصل کی اور خصوصیت سے تعلق رکھا ان میں دو عزیز مولانا عبداللہ اسماعیل مہتمم فلاح دارین ترکیسر (سورت) اور مولانا احمد ابراہیم بیمات استاذ حدیث فلاح دارین ہیں جو ابتک اس علمی ودینی رشتہ جگائے ہوئے ہیں، مدرسہ حسینیہ میں دو مدرس ان دونوں عزیزوں کے شاگرد ہیں، اس طرح بعض اور حضرات علمی سلسلہ سے راقم سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں آکر جب ان عزیزوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ان سے معلوم ہوا کہ ان کو میرے تلامذہ کے ذریعہ مجھ سے علمی نسبت ہے تو بے انتہا مسرت ہوئی اور معلوم ہونے لگا کہ یہ مدرسہ بالکل اپنا ہی مدرسہ ہے، اس کا تذکرہ میں نے تحدیث نعمت کے طور پر جلسہ میں اپنی تقریر میں بھی کیا اور بتایا کہ علمی نسبت اور سلسلہ کی برکت کہاں کہاں اور کیسے کیسے پہونچتی ہے اور اہل علم کے رشتے کس کس طرح پھیلتے ہیں، ان عزیزوں نے اپنے شاگردوں کے سامنے اپنے استاذ الاستاذ کی جو خدمت کی اور جس تواضع اور سعادت مندی سے پیش آئے انشاء اللہ اس کا اثر ان کے طلبہ میں کام کرے گا، ہمارے یہاں استاذ اور شاگرد کی نسبت اور علمی رشتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کی استواری کے نتائج بہت خوشگوار ہوتے ہیں۔

یکم ربیع الثانی دوشنبہ کو میں نے عربی درجہ دوم کے طلبہ کا امتحان لیا، یہ بچے کتاب الصرف، شرح مأۃ عامل، القرأۃ الراشدہ، الدرر وغیرہ پڑھتے ہیں، ان کتابوں کے امتحان میں تقریباً سب ہی طلبہ نہایت اچھے رہے، اساتذہ اور طلبہ کی محنت کا جو نتیجہ

امتحان کے بعد سامنے آیا وہ بہت ہی خوش آیند ہے، نیز عربی زبان وادب میں یہ بچے معیاری رہے، میں نے عربی میں ان سے گفتگو کر کے اردو میں ترجمے اور جواب طلب کئے اور اردو میں جملے لکھا کر ان کے عربی میں جوابات لکھوائے، مجموعی حیثیت سے تمام طلبہ نے نہایت کامیابی سے امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

بعد نماز مغرب چند طالب علموں نے تجوید وقرأت کے فن کا مظاہرہ کیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ قرآن کریم کو فن تجوید کے ساتھ سنایا، اندازہ ہوا کہ قرأت وتجوید کے یہ طلبہ بھی اس فن میں بہت کامیاب ہیں، ویسے بھی ان علاقوں میں قرآن پڑھنے کا ذوق بہت عام ہے اور قرأت کی حد تک یہاں کے حضرات قرآن خوب پڑھتے ہیں، اس میں ان کی اس عربیت کو بھی دخل ہے جو ان کے آباء واجداد اپنے ساتھ لیکر آئے تھے، قوموں کا لب ولہجہ قرنہا قرن تک باقی رہتا ہے، عربی کے ممتحنین میں مولانا سید عبدالرزاق صاحب نظر اور مولانا سید شوکت علی صاحب نظر بھی تھے، ان حضرات کا بھی یہی تاثر ہے کہ طلبہ نہایت اچھے اور کامیاب ہیں۔

۲۔ ربیع الثانی سہ شنبہ کو رات میں مدرسہ کا جلسۂ عام ہوا، اطراف وجوانب کے بہت سے حضرات تشریف لائے تھے، ان میں سے اکثر وبیشتر اس مدرسہ سے والہانہ تعلق رکھتے ہیں، اور اس کی ترقی کے لئے اپنے انداز میں خواہاں وکوشاں رہتے ہیں، ان کے قیام وطعام کا وانتظام مسلمانان شری وردھن نے کیا تھا، مسجد کے سامنے مدرسہ کے صحن میں عشاء کے بعد جلسہ ہوا، مولانا سید شوکت علی صاحب نظر نے راقم کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا، وہ خود عالم ہیں اور جانتے ہیں کہ منہ پر تعریف کرنے کی کس قدر شدید ممانعت فرمائی گئی ہے، البتہ اس سلسلے میں موصوف نے یہ بات بہت ہی واضح الفاظ میں جلسہ کے سامنے رکھی کہ ہمارے نزدیک علاقائیت کی کوئی تفریق نہیں ہے، ہم مسلمان ہیں ہمارے نزدیک قوم

وملک اور جغرافیہ کی تفریق وحد بندی غلط ہے، علمی اور دینی امور ومعاملات میں یہ ذہنیت زہر قاتل اور انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے، مدرسہ کے بچوں نے قرأت اور نعتیں سنائیں، اردو، عربی، مراٹھی اور انگریزی میں تقریریں کیں، اس کے بعد مولانا عبدالرزاق صاحب نظر نے نہایت جامع اور بسیط تقریر کی، آخر میں راقم نے جو کچھ بن سکا کہا سنا، جس میں زیادہ زور مدرسہ کی تعمیر وترقی اور اس کی ہر طرح کی امداد پر رہا، اور مسلمانوں سے گذارش کی کہ اس مدرسہ کو کوکن کا مثالی مدرسہ ہونا چاہئے، اور اس کے لئے ہر طرح جد جہد کرنی چاہئے۔

الحمدللہ کہ مدرسہ کے آس پاس کافی زمین ہے جس پر تعمیر کا انتظام ہو رہا ہے اور عنقریب مسلمانوں کے تعاون سے ایک شاندار سہ منزلہ عمارت بننے والی ہے، بمبئی کے اہل خیر حضرات اپنے علاقہ کے اس مدرسہ کی طرف خصوصی توجہ کر کے کم از کم شہر میں نہیں تو باہر ہی ایک اچھا دینی مدرسہ بنادیں جو آگے چل کر اسکول نہ بن سکے، شہر میں تو ایسے مدرسہ کی توقع واقعات کے سامنے فضول ہے، البتہ اس کے باہر یہ کام ہوسکتا ہے۔

آخر میں مدرسہ کے اساتذہ وارا کین اور مہتمم کے حسن اخلاق اور حسن ظن کے سامنے اپنی بے بضاعتی کے اعتراف کی روشنی میں ان کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، جنھوں نے ہر طرح آرام پہونچایا، اہل کوکن کی روایتی ضیافت اور مہمان نوازی مشہور ہے، اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے اور اس کے کارکنوں میں اخلاص وللّٰہیت دے تاکہ وہ اس کی خدمت کا حق کما حقہ کرسکیں۔

(ماہنامہ ''البلاغ'' اگست ۱۹۷۲ء)

☆☆☆☆☆☆☆

سفر غازی پور (مارچ ۱۹۷۴ء)

۲۹ / صفر ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۴ / مارچ ۱۹۷۴ء بروز یکشنبہ شہر غازی پور اور اس کے نواح کا ایک علمی سفر ہوا، اور دو دن اس دیار میں گذرے۔ یہ سفر خاص طور سے مدرسہ دینیہ غازی پور کے ناظم مولانا عزیز الحسن صاحب صدیقی کی دعوت پر بنارس کمشنری کے مدارس عربیہ کی تنظیم واصلاح اور تحفظ کے سلسلے میں ہوا تھا، یہاں پہلی بار حاضری شوال ۱۳۵۹ھ میں استاذی مولانا سید محمد میاں صاحب کی معیت میں ہوئی تھی، اسی سال راقم تعلیم سے فارغ ہوا تھا اور مولانا نے جمعیۃ العلماء کی تنظیم کے سلسلے میں اعظم گڈھ، بنارس، غازی پور، بلیا اور گورکھپور کا دورہ کیا تھا، میں بھی مولانا کے ساتھ ساتھ تھا، اس کے بعد دو ایک بار غازی پور جانے کا اتفاق ہوا، مگر اس کی حیثیت سیر وتفریح کی تھی، اور اب تقریباً ۲۸۔ سال کے بعد اس علمی تقریب سے وہاں جانا ہوا،

چونکہ اس سفر میں دلدار نگر اور بہادر گنج بھی جانے کا اتفاق ہوا، اور وہاں کے مدارس میں کچھ وقت اساتذہ وتلامذہ کے ساتھ گذرا اس لئے جی چاہتا ہے کہ اپنے دیار کے اس علمی سفر کی روداد ناظرین کرام کو بھی سنائی جائے، جو ارباب ذوق کے لئے دلچسپ ہے۔

غازی پور ماضی کے آئینے میں:

دیار پورب میں جونپور کے بعد غازی پور کو مرکزیت واہمیت حاصل رہی اور مسلم دور سلطنت میں یہ دونوں مقام حکومت اور علم وفضل کے مرکز تھے، غازی پور کا نام بتا رہا ہے کہ اس شہر کی نسبت غازی سالار مسعود یا ان کے کسی رفیق غازی کی طرف ہے، اس

کے قریب بنارس میں ملک علوی کے نام پر علوی پورہ ہے، خود ضلع غازی پور میں ملک قاسم کے نام پر قاسم پور ہے اس لئے خیال ہے کہ یہ شہر بھی کسی غازی کے نام پر ہے، مسلم عہد میں سب سے پہلے اس کی مرکزی حیثیت لودھیوں کے دور میں نمایاں ہوئی جبکہ لودھیوں نے جونپور کی شرقی سلطنت ختم کر کے جونپور اور غازی پور کو دیار مشرق کا دارالامارۃ بنایا، اس وقت غازی پور کا حاکم نصیر خاں لوحانی، اور میر عدل یعنی منصف اعلیٰ حضرت شیخ محمود بن حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۹۰۵ھ تھے، جو شاہ تھن کے نام سے مشہور ہیں، تزک جہانگیری میں متعدد مقامات پر غازی پور کا تذکرہ موجود ہے، نویں صدی سے لیکر آخری دور تک یہ شہر مرکزیت کا حاصل رہا، یہاں تک کہ ۱۱۳۰ھ میں بادشاہ دہلی سلطان محمد شاہ کی طرف سے وزیر الممالک نواب سعادت علی خاں اودھ کا صوبہ دار ہوا اور اس نے آتے ہی جونپور، الہ آباد، بنارس، غازی پور وغیرہ کو اودھ میں شامل کر کے یہاں کے علماء وفضلاء کی معافیاں اور جاگیریں بند کر دیں جس سے عام تباہی پھیل گئی، نوابی عہد کا تیسرا حکمراں نواب شجاع الدولہ ۱۷۶۳ء میں حاکم ہوا، اس کے زمانہ میں سلطان محمد شاہ نے بکسر کی جنگ کی شرائط صلح کی رو سے شہر غازی پور کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا، یہ پہلا دن تھا جب غازی پور انگریزوں کے زیر اقتدار آیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے جونپور اور گورکھپور کی طرح غازی پور کو بھی اپنا ضلع بنایا۔ ۱۸۲۰ء کی ابتداء میں دیوگاؤں، نظام آباد، ماہل، کوڑیا، تلھنی، اترولیا، گوپال پور کے پرگنوں کو گورکھپور سے الگ کر کے جونپور میں شامل کیا گیا اور سگڑی، گھوسی، چکیسر، سورج پور، بلہابانس، قریات متو پور، چریا کوٹ، محمد آباد گوہنہ، مئو، نتھو پور کے پرگنوں کو غازیپور میں ملا دیا گیا اور ۱۸/دسمبر ۱۸۳۲ء میں اعظم گڈھ کو مستقل ضلع قرار دیکر اس میں آٹھ تحصیلیں رکھی گئیں جو جونپور اور غازی پور سے کٹ کر اس میں شامل ہوئیں۔

اس طرح اعظم گڈھ ضلع بننے سے پہلے ہم لوگ ضلع گورکھپور کے بعد ضلع غازی پور میں تھے، اور غازی پور موجودہ اعظم گڈھ کے مشرقی حصہ کا مرکز تھا۔

علماء ومشائخ:۔

آٹھویں صدی کے آخر میں جونپور کی آبادی کے بعد دیارِ مشرق میں علماء ومشائخ قریہ قریہ شہر شہر آنے لگے اور بہار و بنگال تک علم وفضل کی روشنی پھیل گئی اس دور میں غازی پور کا علاقہ بھی علماء ومشائخ کا مرکز بنا، خاص طور سے زمانیہ، سید پور بحری آباد اور نونہرہ وغیرہ ارباب فضل وکمال سے معمور تھے، حضرت شیخ محمود بن حضرت شیخ حسام الدین عرف شاہ تھن غازی پوری مانکپوری متوفی ۹۰۵ھ، مولانا احمد بن ابوالفتح غازی پوری (ولادت ووفات در غازی پور زمانیہ) اپنے دور کے مشہور عالم ومدرس تھے، حضرت شیخ محمد افضل الہ آبادی متوفی ۱۱۲۴ھ کا وطن سید پور غازی پور تھا، اوائل حال میں جونپور آئے، آخر میں الہ آباد میں قیام کرکے وہیں مسجد اور خانقاہ بنائی، شیخ جمال الدین ہانسوی کے خاندان سے ایک بزرگ شیخ ابراہیم محمد آباد گوھنہ تشریف لائے، اکبر بادشاہ تسخیر بنگالہ کے سفر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے خلفاء میں ایک بزرگ مخدوم شیخ بڈھن ساکن اپچولی ضلع غازی پور ہیں ہمارے دیار کے مشہور بزرگ شاہ ابوالغوث گرم دیوان لہراوی متوفی ۱۱۷۸ھ کے خلفاء میں شاہ معشوق علی غازی پوری مشہور شخصیت کے مالک ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور اور دیار میں علمی ودینی خدمات انجام دی ہیں، آخری دور میں مدرسہ حنفیہ جونپور کے مقابلہ میں مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور علماء وفضلاء اور اساتذہ وتلامذہ کا مرکز رہا، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی نے اسی مدرسہ میں رہ کر نامی گرامی شاگرد پیدا کئے، بعد میں اس مدرسہ سے کئی مبارک پوری علماء نے فیض اٹھایا اور کئی حضرات نے یہاں کی علمی ودینی مسند کو زینت دی، راقم کے ننہال کے علماء میں مولانا مفتی عبدالعلیم صاحب رسولپوری، مولانا محمد شعیب

صاحب رسول پوری اور مولانا محمد یحیٰ صاحب رسول پوری نے پچاس ساٹھ برس تک غازی پور کے سرچشمہ سے طالبان علم کو سیراب کیا، سرسید مرحوم نے اپنی ملازمت کے زمانہ میں غازی پور میں محمڈن اسکول اور کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، ڈاکٹر سید محمود کو بھی اس شہر سے تعلق تھا، الغرض جونپور کے بعد غازی پور ہمارے دیار کا قدیم مرکزی مقام رہا ہے مگر وہ بھی جونپور کی طرح ایک بے رونق شہر ہو کر رہ گیا ہے۔

مدرسہ دینیہ میں تنظیمی جلسہ:

مولانا عزیز الحسن صاحب ناظم مدرسہ دینیہ اور مولوی مولا بخش مبارکپور تشریف لائے، اور جلسہ کی دعوت دی میں نے منظور کر لی، اس کے بعد ہی جناب الحاج مولانا محمد اسلم صاحب اعظمی اور مولانا قاری فیاض احمد غازی پوری ناظم مدرسہ مخزن العلوم دلدار نگر ضلع غازی پور تشریف لائے اور غازی پور کے بعد دلدار نگر کی دعوت دی، میں نے اسے بخوشی منظور کر لیا، بات یہ ہے کہ میں مدرسہ کے ماحول کا آدمی ہوں، اور اپنے کو ہمیشہ مدرسہ کا آدمی سمجھا، جہاں رہا پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ رکھا، ایسے مواقع پر بڑا انشراح ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے ماحول اور فضا میں آ گیا ہوں، حالات نے مجھے مدرسہ سے الگ رکھا مگر میں مدرسہ سے الگ نہیں رہا، والحمد للہ علیٰ ذٰلک

۲۹ صفر مطابق ۲۴ مارچ کی صبح بذریعہ بس غازی پور روانہ ہوا، مئو میں مولانا حبیب الرحمان ندوی ادروی صدر مدرسۃ المساکین بہادر گنج مل گئے اور کہنے لگے کہ میں بھی غازی پور چل رہا ہوں اور وہاں سے واپسی پر آپ کو بہادر گنج مدرسۃ المساکین میں چلنا ہے، یہ قصبہ ضلع غازی پور میں اعظم گڈھ کی مشرقی سرحد سے متصل ہے، وہاں حاضری کا موقع اب تک نہیں ہوا تھا، خیال ہوا کہ غازی پور کے بعد دلدار نگر جانا ہے

دوسرے دن واپسی میں دو چار گھنٹے کیلئے یہاں بھی رک جانا بہتر ہے، مولانا موصوف نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں ایک ساتھ غازی پور گئے، دس بجے مدرسہ دینیہ میں حاضری ہوئی، جہاں بنارس، جونپور، بلیا اور غازی پور کے چودہ مدارس عربیہ کے صدور اور نظماء کے علاوہ اور بہت سے علماء و مدرسین حضرات موجود تھے۔

جلسہ کا انتظام مدرسہ کے دارالاہتمام میں تھا، مہمانوں کی تواضع، ان کے آرام اور حسن انتظام کا خاص خیال رکھا گیا تھا، مولانا عزیزالحسن صاحب ماشاء اللہ متحرک وفعال جواں سال عالم ہیں، اور اجتماعی واصلاحی کاموں میں بڑی سلیقہ مندی سے حصہ لیتے ہیں، پھر یہ جلسہ تو ان ہی کی دعوت پر ان کے مدرسہ میں ہوا تھا، مدرسہ کے اساتذہ وتلامذہ اور متعلقین نہایت ذمہ داری اور اخلاص سے متعلقہ امور میں حصہ لے رہے تھے۔

رسمی تحریک صدارت اور تائید کے بعد قرآن کریم کی تلاوت سے جلسہ کا آغاز ہوا، اور راقم نے صدارتی تقریر کی، یہ تقریر درحقیقت احتساب تھی، اپنی کمزوریوں کا پتہ چلا کر ان کو دور کرنا اس جلسہ کا مقصد تھا، اس لئے میں نے ذرا کھل کر بات کی، اور کہا کہ اس ملک مین ہمارے مدارس عربیہ کو دو قسم کے خطرات سے واسطہ ہے، ایک بیرونی خطرہ جو سیکولر، قومیت اور حکومت کی طرف سے ہے اور تعلیمی معیار اور اساتذہ کے حقوق کے نام پر حکومت کی نیت اقلیتی تعلیمی اداروں کے بارے میں ٹھیک نہیں ہے، جیسا کہ کوٹھاری کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا اور حکومت سے سفارش کی ہے کہ ایسے تعلیمی اداروں کو حکومت اپنے قبضہ میں لے لے۔ نیز اس ملک میں جو عام رجحان کام کررہا ہے اس کا رخ ہمارے ملی ودینی اور مذہبی اداروں کے بارے میں کچھ اچھا نظر نہیں آتا، ایسے خطرات کا مقابلہ اجتماعی طور پر ہونا چاہئے، اور جس طرح مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں کامیاب کنونشن ہوا، اس کے لئے بھی زبردست احتجاج ومظاہرہ

کی ضرورت ہے، اور دوسرا خطرہ خود ہمارے مدارس کی اندرونی خرابیوں سے پیدا ہورہا ہے، یہ اندرونی خطرہ بیرونی خطرہ سے کئی گنا زیادہ نقصان دہ ہے، اور اس کے غلط اثرات ونتائج ظاہر ہورہے ہیں۔ ہمیں نہایت کھلے طور سے اعتراف کرنا چاہئے کہ ہمارے مدارس کا اخلاقی تعلق کمزور ہورہا ہے جو دینی مدارس اور دینی تعلیمی کے حق میں بنیاد ہے اور جس کے بغیر لکھنا پڑھنا تو آسکتا ہے مگر علم دین نہیں آسکتا، آج ہمارا مطمح نظر خدمت نہیں کارگذاری بن گیا ہے، تکثیر شہرت تکثیر چندہ، اور تکثیر طلبہ پر پوری کوشش ہورہی ہے، مگر تعلیمی واخلاقی معیار پر توجہ نہیں ہے، چھوٹے سے چھوٹے مدرسہ میں اونچی سے اونچی تعلیم کا ذوق عام ہے حتیٰ کہ دو چار طالب علموں کو لے کر دورۂ حدیث کا انتظام کیا جاتا ہے اور نیچے درجوں کے مدرسین اونچے درجہ کی کتابیں پڑھاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علموں میں علمی استعداد وصلاحیت پیدا نہیں ہوتی اور نیچے درجہ کے طالب علموں سے توجہ ہٹ کر اونچے طالب علموں پر توجہ مرکوز ہوجاتی ہے، اس صورت حال کی وجہ سے طلبہ کا تعلیمی معیار گرجاتا ہے، یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آج کل طلبہ بدمحنت ہوتے ہیں، ان میں ذہانت وفطانت نہیں ہوتی اور وہ ہر اعتبار سے چوپٹ ہوتے ہیں، اس قسم کے طلبہ کی محدود تعداد ہر زمانہ اور ہر مدرسہ میں پہلے بھی رہا کی ہے، اور یہ بات نہیں ہے کہ آجکل تمام طالب علم ایسے ہی آتے ہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ حضرات اساتذہ نے طلبہ کے ساتھ علمی شفقت ومحبت اور اخلاص ومحنت کا وہ برتاؤ کم کردیا ہے جو اس تعلیم کے لئے ضروری ہے اور جس کے بغیر اس کی افادیت ظاہر نہیں ہوتی ہے۔

موجودہ اقتصادی ومعاشی بحران کے دور میں ہمارے مدرسین واساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ یقیناً نہایت اہمیت اختیار کرگیا ہے، اور ہمیں سنجیدگی سے ان کے مشاہرہ اور ضروریات پر غور کرکے صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہئے، مگر اس کا

مطلب یہ نہیں ہے کہ مدارس عربیہ کارخانے اور فیکٹریاں ہیں اور ان کے مدرسین مزدور ہیں اور ان کے مسائل کو سرمایہ داروں اور مزدوروں کی سطح پر حل کیا جائے، اسکولوں اور کالجوں میں یہی ذہنیت کام کررہی ہے مگر مدارس عربیہ اسلامیہ کا مزاج اس ذہنیت سے میل نہیں کھاتا، ان کی بنیاد اخلاص وایثار پر ہے جو سب سے مقدم ہے، یہ حقیقت بظاہر تلخ معلوم ہوتے ہیں مگر احتساب میں ان پر نظر رکھنا ضروری ہے، لہذا ضرورت ہے کہ ہم اہل مدارس مل کر اپنے تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے پر توجہ دیں، جہانتک عام مسلمانوں کے تعاون کا تعلق ہے، اس گئے گذرے حال میں بھی وہ ہمارے مدارس کی پوری امداد کرتے ہیں، اور بلا شبہہ مدرسوں کے نام پر مسلمانوں کی دولت کا ایک معتدبہ حصہ خرچ ہوتا ہے، عرب اور دیگر مسلم مما لک میں اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان کے یہ مدارس عام چندوں پر چلتے ہیں اور وہاں کے مسلمان ان کے لئے اتنی رقم دیتے ہیں جو اخراجات کے لئے کافی ہوتی ہے، اسے بہت بڑا فضل خداوندی سمجھ کر اس سے زیادہ سے زیادہ دینی وعلمی خدمت کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے۔

یہ جلسہ احتساب کے لئے تھا اس لئے ان تلخ حقائق کو اپنے بزرگوں اور دوستوں کے سامنے پیش کرنے میں ''معذرت'' کا انداز بالکل نہیں تھا، اس کے بعد دوسرے حضرات نے بھی تقریریں کیں اور مدارس کی تنظیم واصلاح پر زور دیا، مختلف مقامات سے آئے ہوئے ذمہ داران مدارس پورے اخلاص وانشراح سے تشریف لائے تھے اور ان کی باتوں اور چہروں سے اصلاح حال کی تیاری ظاہر ہورہی تھی، اس لئے ان تنقیدوں کو بڑے انشراح سے سنا گیا، بلکہ دوسرے حضرات نے بھی بعض دیگر اہم امور ومعاملات میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیا، اس کے بعد معمولی اختلاف کے بعد کئی اہم تجاویز پیش کر کے پاس کی گئیں، اور جن مدارس عربیہ کے ترجمان اور

نمایندے آئے تھے ان پر مشتمل ایک مجلس منتظمہ بنا کر دوسرے حضرات کو اس میں شامل کرنے کا کام مجلس کے سپرد ہوا، اس اصلاحی تنظیم کا نام ''وفاق المدارس العربیہ بنارس کمشنری'' رکھا گیا، یہ کام اور اقدام اگر چہ فی الحال محدود پیمانہ پر ہوا، مگر ہمارے خیال میں پورے ملک میں مدارس اسلامیہ کی تنظیم واصلاح کے بارے میں یہ پہلا اقدام ہے جس میں مدارس عربیہ کے ذمہ داروں نے کھلے الفاظ میں اور کھلے دل سے تنظیم واصلاح کی بات کی، ورنہ خیال تھا کہ مدرسوں کی موجودہ اکائیاں وحدت میں ضم ہونے کیلئے تیار نہیں ہوں گی اور ہر ایک اپنے مستقل وجود پر مصر رہے گا، مگر الحمدللہ کہ یہ گمان غلط ثابت ہوا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تنظیم کو کامیاب فرمائے اور دوسرے مدارس اسلامیہ اس طرز پر اصلاحی و تنظیمی قدم اُٹھائیں، اس اجلاس میں نہ مدرسین وملازمین کی تنخواہ کی بات آئی، نہ مالی مشکلات اور چندہ کی فراہمی پر غور کیا گیا، نہ اساتذہ وتلامذہ کے کسی مطالبہ کا نام آیا، بلکہ صرف علوم اسلامیہ کی افادیت، اساتذہ وتلامذہ کے اخلاق وکردار کی بلندی اور اس راہ میں حائل ہونے والی کوتاہیوں کو دور کرنے کی بات رہی، یہ اجلاس باہمی الفت ومحبت اور علمی ودینی ربط وتعلق کا بہترین مظہر تھا اور ہر فرد یوں مسرور ومطمئن تھا جیسے اس کے دل کی بات کہی جارہی ہے۔

تقریباً تین گھنٹے تک اجلاس کی کارروائیاں جاری رہیں اور دعا پر جلسہ برخواست ہوا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے کھانے سے فراغت ہوئی، اس کے بعد عصر تک باہمی ملاقاتیں اور مختلف موضوعات پر گفتگوئیں رہیں۔ کئی نادیدہ احباب سے ملاقات ہوئی، جلسوں کے موقعوں پر بزرگوں اور دوستوں کی ملاقات بجائے خود بہت مفید ثابت ہوتی ہے، جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر ان بزرگوں اور دوستوں کا تذکرہ کیا جائے جو یہاں آئے تھے، اور جن سے ملاقاتیں ہوئیں، مگر دامن قرطاس کی کوتاہی مانع ہورہی ہے۔

مدرسہ دینیہ:

ظہر اور عصر کے درمیان مدرسہ دینیہ کی جدید عمارتوں اور اس کے مختلف علمی اور تعلیمی شعبہ جات کو تفصیل سے دیکھا۔ حضرت مولانا ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور میں مدرسہ کو ترقی دی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا عزیز الحسن صاحب کے جواں سال عزم وحوصلہ نے ہر اعتبار سے مدرسہ کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے۔ درس گاہیں، دارالاقامہ، کتب خانہ، مطبخ، دارالاہتمام اور مسجد تقریباً سب ہی میں جدت وترقی ہے۔ مولانا موصوف ملکی اور سیاسی امور ومعاملات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، جمعیۃ العلماء اتر پردیش کے سکریٹری ہیں، مگر مدرسہ کی ذمہ داری سب پر مقدم رکھتے ہیں۔

دلدارنگر کی جانب:

اس کے بعد پروگرام کے مطابق ہمارا قافلہ دلدارنگر کے لئے روانہ ہوا، جس میں راقم کے علاوہ الحاج مولانا محمد اسلم صاحب صدر مدرس مدرسہ مخزن العلوم دلدارنگر، مولانا قاری محمد فیاض صاحب ناظم مدرسہ مذکور، مولانا محمد مسلم صاحب بمھوری مدرس مدرسہ حسینیہ شاہی مسجد لال دروازہ جونپور، مولانا ضیاء الحسن مئوی، مدرس مدرسہ مظہر العلوم بنارس، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ندوی صدر مدرسۃ المساکین بہادرگنج شامل تھے۔ مغرب سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے شہر کے جنوب میں دریائے گنگا کے پل پر آئے جو کئی فرلانگ تک پیپے سے بنایا گیا ہے، یہاں مدرسہ دینیہ کے ارکان واساتذہ نے ہمیں نہایت عزت واحترام سے رُخصت کیا، پل پار کرنے کے بعد کئی فرلانگ ریت میں چلے جس پر لوہے کی چادریں بچھا کر سڑک بنائی گئی ہے، اور گاڑیاں بے تکلف اس دریائی ریگستان سے گذرتی رہتی ہیں۔ آخر میں پھر دریا کا حصہ آیا جس پر پیپے کا چھوٹا سا پل ہے، برسات کے زمانہ میں یہ سب دریا بن جاتا ہے، اس پار تاڑی گھاٹ

ریلوے اسٹیشن ہے ،یعنی غازی پوراور اسٹیشن کے درمیان دریائے گنگا اور اس کا ریگستان ہے،قبیل مغرب ہم اسٹیشن پہونچے، عجیب منظر تھا۔دریااور ریگستان کی شام، بادل،گرج، چمک اور تند وتیز ہوا، ہمارے چند ڈبوں کی ٹرین اپنی پوری آن بان کے ساتھ آئی اور معلوم ہوا کہ ابھی چھ بجے جانے والی ہے،دلدارنگراور تاڑی گھاٹ کے درمیان ایک اسٹیشن ''نگسر'' نام کا ہے بس ان ہی دو اسٹیشنوں کے درمیان یہ برانچ لائن ہے،اوردن میں تین مرتبہ گاڑی آتی جاتی ہے،دریا کے اس پار کا علاقہ مع دلدار نگر کے کمسار وبار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،اس کی سرحدیں ایک طرف بنارس سے اور دوسری طرف صوبہ بہار سے ملتی ہیں ،مشہور تاریخی مقام بکسر یہاں سے بہت قریب ہے،''نگسر'' اسٹیشن کے نام سے اندازہ ہوا کہ کسی زمانہ میں اس کا ہم قافیہ ''بکسر'' ایک ہی علاقہ میں رہا ہوگا،ٹرین کے گارڈ جناب محمد یحییٰ خاں صاحب کو جب ہم لوگوں کی آمد کی خبر ملی تو وہ خود بڑے عقیدت مندانہ انداز میں آ کر ملے، چائے سے تواضع کی ،اور کہا کہ آپ حضرات اطمینان سے مغرب کی نماز ادا کریں،اس کے بعد گاڑی چلے گی ، چنانچہ اسٹیشن پر نماز باجماعت ادا کی گئی اور ساڑھے چھ بجے ٹرین روانہ ہوئی ،سوادِ شام کا سایہ،دریا، ریگستان اور فضا میں گھنا ہو چکا تھا ، بارش، چمک، گرج اور تند وتیز ہوا میں ٹرین روانہ ہوئی ،اس وقت اپنا یہ دیار عجائبات وطلسمات کی سرزمین معلوم ہو رہا تھا اور بہادر مسلم راجپوتوں کے علاقہ کمسار وبار کے رُعب وجلال میں نغمات واشعار کے حسن وجمال کی رنگینی آرہی تھی۔

مغرب اور عشاء کے درمیان ہم لوگ دلدارنگر پہونچے ،بستی اسٹیشن سے متصل ہے،اس سے گزر کر مدرسہ مخزن العلوم میں پہونچے، مدرسین وطلبہ انتظار کررہے تھے، پہونچتے ہی پُر تکلف چائے نوشی کے بعد عشاء کی نماز ادا کی گئی پھر کھانا کھایا گیا۔

مدرسہ مخزن العلوم دلدارنگر:

جیسا کہ معلوم ہوا گنگا کے اس پار کا علاقہ کمسار و بار کے نام سے مشہور ہے، اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہ ہوسکی، اس میں راجپوت مسلمانوں کی آبادیاں اور ان کی بڑی بڑی بستیاں ہیں، یہی لوگ اس علاقہ کے زمیندار و کاشتکار ہیں، یہ لوگ اپنے ڈیل ڈول اور شکل وصورت میں ممتاز ہیں، بہادری اور عزم وحوصلہ میں بہت آگے ہیں، انگریزی دور میں ان کو بہت سی مراعات حاصل تھیں جہالت اور قدیم رسم ورواج میں بہت آگے تھے، یہ علاقہ فصیحی خاندان کے پیروں کا مرکز تھا جنگ وجدال اور بدعات و خرافات کے اس علاقہ میں صحیح عقائد واعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، ہمارے علم میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے پہل یہاں اصلاح وارشاد کی خدمت انجام دی، مولانا مرحوم کے متوسلون ومتعلقون کا ایک حلقہ بنا، اس کے بعد دینی تعلیم کا چرچا ہوا، اور چند علماء پیدا ہوئے، وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہے، یہاںتک کہ فاضل نوجوان مولانا قاری فیاض احمد صاحب دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر آئے اور انھوں نے یہ مدرسہ قائم کیا، قاری صاحب اسی علاقہ اور ان ہی مسلم راجپوتوں میں سے ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس مدرسہ کے قائم کرنے کے سلسلے میں کیا کیا دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں اور لوگوں نے مخالفت میں کیسے کیسے حربے استعمال کئے، جن حالات میں یہ مدرسہ قائم ہوا ہے اگر کسی دوسرے علاقہ کا کوئی عالم ان سے گذرتا تو پہلے ہی دن وہ ناکام ہوکر یہاں سے چلا جاتا، ابتداء میں مدرسہ مخزن العلوم دلدار نگر بازار کی ایک مسجد میں قائم ہوا، اس کے دوایک سال کے بعد بستی کے باہر ایک پرفضا میدان میں مسلم راجپوت انٹر کالج کے قریب ایک وسیع وعریض جگہ خریدی گئی اور مدرسہ کی جدید شاندار عمارتین اور ایک عظیم الشان مسجد بنائی گئی، اللہ کی شان کہ اس کے بعد مدرسہ کے اردگرد بہت بڑی جگہ چک بندی کے سلسلے میں جدوجہد کے بعد مل گئی، جس کے چاروں طرف دیوار بنادی گئی، اور درمیان مین مدرسہ اور مسجد

کی عمارتیں ہیں، یہ سب کام دس بارہ سال کے اندر اندر ہوا ہے، اور کہنا چاہئے یہ سب مولانا قاری محمد فیاض صاحب کی جدوجہد اور اخلاق وایثار کا ثمرہ ہے، کالج کی عمارتوں کے بالمقابل مدرسہ اور مسجد کی عمارتیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہمارے علماء کا ذوق تعمیر بھی کتنا ستھرا اور بلند ہوتا ہے، اور وہ مسلمانوں کے تعاون سے معمولی رقم اور قلیل مدت میں کتنا شاندار کارنامہ انجام دیتے ہیں، یقین جانئے اگر بمبئ جیسے شہر میں ایسی عمارت کسی اسکول اور کالج کی بنتی تو اس میں کتنے لوگ بن جاتے اور لاکھوں کا غبن نکلتا جسے یہ کہکر نظرانداز کردیا جاتا کہ کھایا ہے تو کام بھی کیا ہے، مختصر مدت میں کئی درسگاہیں، دارالاقامہ، مطبخ اور شاندار مسجد کی تعمیر مسلمانوں کے چندے سے معمولی بات نہیں ہے، اور چونکہ ابھی تعمیری دور چل رہا ہے اس لئے نامکمل عمارتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے جگہ جگہ چمن بندی ہے، قسم قسم کے گل بوٹے لگائے گئے ہیں جن سے اہل علم کے حسن انتظام اور حسن ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

یہ مدرسہ علاقہ کمسار وبار میں علم دین کا چراغ ہے، جس کی روشنی ہر طرف پھیل رہی ہے، مخالفتوں کا طوفان ختم ہو چکا ہے، کئی مدرسین تعلیم وتدریس میں مشغول ہیں، طلبہ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے، ابتدائی تعلیم کے علاوہ اونچی عربی کی تعلیم کا معقول انتظام ہے، اور نہایت اخلاص ومحنت سے پڑھاتے ہیں طلبہ پڑھتے ہیں، اردو اور عربی میں تقریر وتحریر کا سلسلہ ہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر خاص توجہ ہے، ہمارے محترم اور بزرگ مولانا محمد اسلم صاحب صدر مدرس ہیں، موصوف کا خاندانی تعلق شیوخ مبارکپور سے ہے، ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب کے ہم سبق ہیں، دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی ہے، اس سال حج وزیارت کی دولت سے بہرہ ور ہوئے ہیں، اصلاحی اور علمی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں، بظاہر ''خشک'' مگر درحقیقت ''تر'' ہیں، بڑے بے تکلف اور بااخلاق عالم ہیں، فاضل

نوجوان مولانا قاری فیاض احمد صاحب مدرسہ کے بانی ہیں، اوران کے دم قدم سے یہ علاقہ گلزار علم بن رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان دوحضرات کوزیادہ سے زیادہ خلوص وخدمت کا حوصلہ دے۔

بعد نماز فجر مسجد میں اساتذہ وتلامذہ کا جلسہ ہوا جس میں طالب علموں نے اردو اورعربی زبان میں تقریریں کیں، جن میں مہمانوں کے استقبال اور مدرسہ کے احوال تھے، مولانا ضیاء الحسن نے عربی میں جوابی تقریر کی، راقم نے اپنے انداز میں طالب علموں کو خطاب کیا، یہ جلسہ اگرچہ مختصر تھا مگر اس میں بہت سے کام کی باتیں کہی گئیں، باہر کے لوگ یقین نہیں کرسکتے کہ دور دراز علاقوں میں اتنے بڑے بڑے مدارس اپنے کیف وکم کے ساتھ جاری ہوں گے، اوران کا سرمایہ توکل علی اللہ اور مسلمانوں کی امداد ہوگا، ان کے سامنے عربی مدرسہ کا تصور مکتب سے زیادہ نہیں ہے، اورشاندار عمارتیں ان کے نزدیک صرف اسکول، کالج اوردوسرے تعلیمی وفنی اداروں کی ہوتی ہیں، اگر یہ لوگ جاکر ان مدرسوں کو دیکھیں توان کو اس کا یقین آسکتا ہے۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد مدرسہ کی عمارتوں اوراس کے شعبوں کو دیکھا، مدرسین اورطلبہ میں اسلامی وضع قطع، سادگی محنت اورعلم وعمل کا ذوق وشوق نظر آیا۔

سفر بہادر گنج اور مدارس میں حاضری

اس کے بعد نو بجے دن میں ہمارا قافلہ مختلف راہوں پر لگا، مولانا حبیب الرحمان صاحب ندوی اور میں غازی پور آکر بہادر گنج کے لئے روانہ ہوئے، بہادر گنج ضلع غازی پور کا مشہور صنعتی قصبہ ہے، جو مئو سے دس میل پر جنوب مشرق میں واقع ہے، اورمعاشی ومعاشرتی اورعلمی اعتبار سے گویا اعظم گڈھ کا علاقہ ہے، یہاں کے مشہور اورنیک وصالح عالم مولانا محمد احمد صاحب تھے، جو استاذی مولانا شکر اللہ

صاحب کے تلمیذ خاص تھے، اورانھوں نے دورۂ حدیث مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا مرحوم سے پڑھا تھا، ہمارے بچپن میں مدرسہ کا جلسۂ دستار بندی ہوا تھا جس میں ان کی بھی دستار بندی ہوئی تھی، اسی موقع پر ان کو دیکھا تھا اس کے بعد ملاقات نہ ہوسکی، تین چار سال ہوئے انتقال کر گئے۔

ہمارے دیار سے بہت قریب اور علمی تعلقات ہونے کے باوجود ابتک بہادر گنج حاضری کا اتفاق نہیں ہوا تھا، سوچا کہ اس سفر میں یہاں بھی چند گھنٹے کے لئے حاضری ہوجائے، اس لئے مخلصین بہادرگنج کی دعوت پر انشراح کے ساتھ لبیک کہا، تقریباً بارہ بجے دن میں ہم دونوں موٹر کے ذریعہ وہاں پہونچے، سڑک پر مخلصوں اور بزرگوں نے خوش آمدید کہا، ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس قصبہ میں علم وعلماء سے عقیدت اور علمی ودینی رجال سے محبت کا ذوق ہے، چونکہ مدرسۃ المساکین کے صدر اور اراکین نے خصوصی دعوت دی تھی، اس لئے سب سے پہلے وہاں حاضری ہوئی، اہل مدرسہ اور اراکین نے نہایت خلوص ومحبت کا مظاہرہ کیا، مدرسۃ المساکین یہاں کا سب سے پرانا مدرسہ ہے، جس سے علمی ودینی فیض قصبہ اور اطراف وجوانب میں عام ہورہا ہے، کئی علماء یہاں پیدا ہوئے، معلوم ہوا کہ مدرسہ کا یہ نام حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا ہے، اور حضرت یہاں تشریف لا چکے ہیں، یہاں اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم ہوتی ہے اور مقامی طلبہ کے علاوہ بیرونی طلبہ بھی رہتے ہیں، مدرسہ کی طرف سے ایک استقبالی جلسہ ہوا، جس میں مدرسین اور طلبہ نے تقریریں کیں اور اپنے جذبات وخیالات کو نہایت اچھے انداز میں بیان کیا، راقم نے بھی طالب علموں کو خطاب کر کے ان کے مناسب کچھ باتیں کہیں، ظہر سے پہلے مدرسہ ہی میں کھانا کھایا گیا، جس میں مہمانوں کے علاوہ مدرسہ کے اراکین شامل تھے، ظہر کے بعد مدرسہ کا جلسہ ہوا، جلسہ کے بعد معلوم ہوا کہ راقم کو ایک اور مدرسہ میں

حاضر ہونا ہے، جو پرانی گنج محلہ میں واقع ہے (اس کا نام یاد نہیں رہا) اس کی حیثیت اگر چہ مکتب کی ہے، مگر تعلیم مکتب سے اوپر کی ہوتی ہے، تمام درجات بچوں سے بھرے ہوئے تھے اور کئی مدرسین کام کرتے ہیں، یہاں بھی ایک مختصر اور باوقار تقریب رہی جس میں اعیان وارا کین بھی شریک تھے، بعد میں مختصر سی تقریر بھی رہی، چونکہ وقت کم تھا، اور ایک تیسرے مدرسہ فیضان العلوم میں جانا تھا اس لئے وہاں سے نکل کر سیدھے جامع مسجد میں حاضری ہوئی مدرسۂ مذکور اسی سے متصل واقع ہے عصر کی نماز پڑھ کر مدرسہ میں گئے یہاں بھی تعارفی تقریب اور چائے نوشی کے بعد کچھ کہنے سننے کا معاملہ رہا، دوپہر سے شام تک وقت بہادر گنج کے گلی کوچوں کو طے کر کے یہاں مدرسوں میں حاضری اور ان کے اساتذہ وتلامذہ سے ملنے اور مدرسوں کی کارگذاری دیکھنے میں گذرا۔

مدرسہ فیضان العلوم یہاں کا قدیم مدرسہ ہے جس سے بڑے بڑے اہل علم فیضیاب ہو چکے ہیں، قصبہ کے شمال مغربی حصہ میں واقع ہے، شمال میں چند قدم پر دریائے ٹونس بہتا ہے، درمیان میں صرف ایک کھیت ہے، کئی مدرس تعلیمی خدمت انجام دیتے ہیں، ہم نے مدرسہ کی مطبوعہ روداد بھی دیکھی، یہاں کا مطبخ کا بھی انتظام ہے، اور طلبہ کی اچھی خاصی تعداد رہتی ہے، افسوس کہ وقت کی کمی کے باعث ان مدارس کے اساتذہ وتلامذہ سے تفصیلی ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔

ان تمام مصروفیات میں قصبہ کے متعدد احباب برابر شریک رہے، اور آج کا پورا دن انھوں نے ہماری معیت یا خدمت میں صرف کیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، ہر جگہ یہی اصرار رہا کہ رات میں ایک جلسۂ عام ہو جس میں آپ شرکت کریں، مگر راقم اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے اس کے لئے تیار نہ ہو سکا، خیال تھا کہ چار بجے دن میں بہادر گنج سے نکل کر پانچ بجے تک مئو پہونچ جائیں گے اور وہاں سے

مغرب کی نماز تک یا کچھ آگے پیچھے گھر لوٹ آئیں گے مگر مغرب تک ہمیں کسی طرح اپنے مخلص دوستوں اور بزرگوں سے فرصت نہ مل سکی اور مغرب کے بعد موٹر ملی جس سے مئو آگئے ، یہاں سے مولانا حبیب الرحمان صاحب ندوی کا ساتھ چھوٹا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنی اپنی راہ لی۔

حج سے واپسی کے بعد مبارکپور میں تقریباً ڈھائی ماہ قیام رہا، اس درمیان میں متعدد علمی اور دینی مقامات وتقریبات میں آنا جانا ہوا، چنانچہ مدرسہ حسینیہ شاہی مسجد لال دروازہ جونپور، مولانا آزاد تعلیمی مرکز اسرہٹہ جونپور، مدرسہ اسلامیہ دیوگاؤں، مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، مدرسہ حسینیہ انجان شہید، جامعۃ البنات جین پور، وغیرہ میں حاضری ہوئی، اگر ان تمام اداروں کا مختصر تعارف کرایا جائے تو یہ روداد سفر بہت طویل ہو جائے گی۔ (ماہنامہ ''البلاغ'' جون، جولائی ۱۹۷۴ء)

☆☆☆☆☆☆

بارہ دن جنوبی ہند میں (فروری ۱۹۷۵ء)

جنوبی ہند کے علمی سفر کی خواہش ایک مدت سے تھی، اس درمیان میں اس دیار کے کئی مقامات سے مختلف دینی اور علمی تقریبات کے موقع پر دعوت بھی ملی مگر جانے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ مہاراشٹر کے آگے بیلگام، ہبلی اور بھٹکل کا سفر وہاں کے مدارس کے سلسلے میں ہوا تھا، پہلے سفر حج ۱۳۷۵ھ میں مرحوم ڈاکٹر عبدالحق صاحب، مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری، مولانا عبدالوہاب، مولانا عبدالباری حاوی اور میں ایک ہی کشتی کے سوار تھے، ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ میں رجال السند والہند کے نام سے کتاب مرتب کر رہا ہوں تو مدراس آنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ وہاں عربی مخطوطات کا نہایت نادر کتبخانہ ہے، آپ آیئے میں ہر طرح کا انتظام کردونگا اور آپ کی مدد کرونگا، اس کے بعد بمبئی میں جب بھی تشریف لاتے ملاقات کر کے مدراس آنے کی دعوت دیتے، ایک مرتبہ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس بنگلور کی طرف سے دعوت نامہ ملا، میں نے منظور بھی کر لیا مگر نہ جاسکا، چند ماہ پہلے مدرسہ باقیات صالحات ویلور کا صد سالہ جشن تھا اس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا، اس کے علاوہ بنگلور، مدراس، کیرالہ وغیرہ سے مختلف مواقع پر دعوت نامہ آیا اور حیدرآباد تو کہنا چاہئے کہ خود ہی حاضری کا شوق وارادہ رہا کیا، مگر کہیں جانے کا اتفاق نہ ہوسکا، بعض اوقات خیال ہوا کہ ایک ماہ کے لئے جنوبی ہند کے علمی دورہ پر نکلوں اور ادھر کے کوئی صاحب ساتھ ہوں مگر یہ خیال بھی حد سے آگے نہ بڑھ سکا، اس کی وجہ اپنی مصروفیات کے علاوہ وسائل کی قلت، نئے دیار میں غربت وتنہائی کا احساس اور سفر کی طرح طرح کی

مشکلات کا تصور تھا۔

اسی درمیان میں ۲۲۔۲۳۔فروری ۱۹۷۵ء مطابق ۱۰۔۱۱۔صفر ۱۳۹۵ھ شنبہ یکشنبہ کو بنگلور میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس طے پایا، اور خیال ہوا کہ اس میں شرکت کر کے اسی سفر میں جنوبی ہند کا ضمنی سفر کر لینا مناسب ہے، اسی خیال سے عزیزم (مولوی) ظفر مسعود سلمہ کو وطن سے بمبئی بلالیا، اور بنگلور پہونچنے پر حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی سے ملاقات ہوگئی اور وہ بھی آمادۂ سفر ہو گئے، ان کے ساتھ بھی ایک صاحب تھے اس لئے چار ہم سفر ہو گئے۔

(مولوی) ظفر مسعود کو چونکہ اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں بنگلور کے ریشم اور کتان کے تاجروں سے ملنا جلنا تھا، وہ ایک دن پہلے ہی بمبئی سے ایک وفد کی معیت میں بنگلور چلے گئے، اور اپنی کاروباری مصروفیت سے فرصت لے لی۔

میں ۲۰۔فروری کو صبح ۸۔بجے بمبئی کے چند احباب کے ساتھ میرج ایکسپریس سے روانہ ہوا، نو بجے رات میں میرج سے بنگلور جانے والی گاڑی پر سوار ہوئے چونکہ چھوٹی لائن کی گاڑی تھی اس لئے سیٹ رزرو ہونے کے باوجود تنگی محسوس ہو رہی تھی، میرج کا نام مغل دور میں مرتضیٰ پور تھا جو کتابوں میں ملتا ہے، یہ گاڑی رات بھر چل کر دن کو تقریباً چار بجے بنگلور پہونچی، اس کی بیشتر مسافت صوبہ کرناٹک میں طے ہوئی، راستہ بھر ہمارے ذوق کے مطابق کھانا نہیں ملا، چاول اور دہی ملا کر پڑیہ میں کھانا بکتا تھا حتیٰ کہ گاڑی میں اسی قسم کا کھانا تیار ہوتا تھا، راستہ عموماً میدانی اور ہرا بھرا تھا، آس پاس کی بعض آبادیوں میں مسجد کے مینارے ٹرین سے نظر آتے تھے ، دیہات عموماً صاف ستھرے اور ہرے بھرے نظر آتے تھے، اسٹیشنوں پر بھیڑ بھاڑ بالکل نہیں رہتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر بہت کم کیا جاتا ہے، بنگلور اسٹیشن پر ظفر مسعود، مولوی قاری حسین احمد مبارکپوری اور دوسرے رضا کار موجود تھے، پندرہ

بیس منٹ میں ہم لوگ ’’ہندوستانی ہوٹل‘‘ پہونچ گئے جہاں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کے دفاتر اور مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام تھا، اس ہوٹل کے مالک جناب سید حسین صاحب ایک مخیّر مسلمان ہیں، ہوٹل بہت بڑا چار منزلہ ہے، نہایت صاف ستھرا اور آرام دہ ہے، ہر کمرے میں ضرورت کی چیزیں مہیا ہیں، معلوم ہوا کہ چھوٹا کمرہ جس میں ایک آدمی کے قیام کا انتظام ہے اس کا کرایہ بارہ روپیہ روزانہ ہے، اور بڑا کمرہ جس میں دو آدمیوں کا انتظام ہے پچیس روپیہ کرایہ ہے، سامنے ہوٹل کے مالک نے مسجد بھی بنوائی ہے، متصل ہی ان کا مکان بھی ہے، عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مجلس استقبالیہ کی طرف سے ایک بڑے کمرے میں ملاقات کا انتظام ہوا، اطراف ملک سے آئے ہوئے سینکڑوں علماء، فضلاء، فقہاء، مفتیین، وکلاء اور قانون داں سے ملاقات اور دید وشنید ہوئی، جن میں بیشتر سے پہلے سے جان پہچان تھی، اور کتنے اپنے بڑے اور معاصر تھے، ہمارے ضلع اعظم گڈھ کے اہل علم میں حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی، مولانا ابواللیث اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی بحیثیت ارکان کے آئے تھے، مولانا فقیر اللہ صاحب مبارکپوری کے پوتے عزیزی مولوی قاری حسین احمد مع اہل وعیال کے بنگلور میں رہتے ہیں، وہ دوران قیام میں ہمارے ساتھ رہے ان کی وجہ سے کافی سہولت رہی، محترم الحاج محی الدین منیری بھی بھٹکل سے آگئے تھے، اس قسم کے بڑے جلسوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوجاتی ہے، اور پرانی یادوں میں تازگی آجاتی ہے، بنگلور کے اہل علم میں مولانا ابوالسعود صاحب ناظم جامعہ سبیل الرشاد، مولانا عبدالجمیل خطیب، مولانا شہاب الدین ندوی وغیرہ پہلے سے متعارف تھے، اور چونکہ یہاں کے روزنامہ ’’پاسبان‘‘ میں ’’اچھی باتیں‘‘ کے عنوان سے روزانہ میرا ایک مضمون ’’انقلاب‘‘ سے نقل ہوتا ہے اس لئے اخبار بیں طبقہ غائبانہ طور سے واقف تھے، پھر جنوبی ہند میں ’’البلاغ‘‘ کے پڑھنے

والے زیادہ ہیں اس لئے اپنے متعارفین کا یک حلقہ یہ بھی تھا، دوتین دن تک دیدہ ونادیدہ دوستوں اور بزرگوں سے خوب ملاقاتیں رہیں، اور یہ دینی وعلمی میلہ اس اعتبار سے بھی بہت دلچسپ رہا، ہندوستانی ہوٹل دارالعلم والعلماء معلوم ہوتا تھا اس سے چنددن پہلے کیرالہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہوئی تھی جس میں ہندوستان بھر سے نمایندے شریک ہوئے تھے، ان میں سے کئی حضرات واپسی پر مسلم پرسنل لا کے اجلاس میں بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے، شیخ عبداللہ بھی آئے تھے، مگر چونکہ ان کو ۲۴۔فروری کو کشمیر میں اپنی وزارت تشکیل کرنی تھی اس لئے جلسہ کی کاروائی میں شریک نہ ہوسکے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسے اور کارروائیاں

۲۲۔فروری کو صبح ناشتے کے بعد ہوٹل کی چوتھی منزل کے وسیع ہال میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا پہلا جلسہ ہوا جس میں اطراف ملک سے آئے ہوئے ارکان ومندوبین نے مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا اپنا تعارف کرایا، میں نے جب کہا کہ میں قاضی اطہر مبارکپوری کے نام ونسبت سے پکاراجاتا ہوں اور بمبئی میں رہ کر لکھنے پڑھنے کا دھندہ کرتا ہوں تو پورا مجمع اس جملہ سے محظوظ ہوا، بمبئی کاروبار اور دھندے کی جگہ ہے اس لئے میں نے دیدہ ودانستہ یہ جملہ استعمال کیا تھا، ویسے مجمع میں کھڑے ہوکر اپنا تعارف کرانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا، اس کے بعد جنرل سکریٹری نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مفصل رپورٹ پیش کی جس میں اس کے پہلے اجلاس سے لیکر دوسرے اجلاس تک حیدرآباد اور تیسرے اجلاس الہ آباد کی رپرٹ تھی اور اس مدت میں بورڈ نے جو خدمات انجام دیں ہیں ان کا تذکرہ وتعارف تھا، بورڈ کے اراکین ومندوبین کا دوسرا اجلاس ظہر کے بعد اسی ہال میں شروع ہوا جس میں بحث ومباحثہ اور ترمیم وتنسیخ کے بعد تجاویز پاس ہوئیں اور تیسرا جلسہ ۲۳۔فروری کی صبح کو ہوا اس

میں کئی تجویزیں پاس کی گئیں، اس درمیان میں راتوں کو اراکین عاملہ کے جلسے بھی اسی ہال میں ہوا کرتے تھے، تجاویز میں حکومت کے متبنیٰ بل ۱۹۷۲ء کے سراسر غیر اسلامی ہونے اور اس کے مضمرات کے اسلامی عائلی قوانین کے سراسر خلاف ہونے کی تجویز نہایت اہم اور مفصل تھی جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے، ایک تجویز حکومت کے اس مسودہ قانون کے خلاف تھی جس میں عورت کو طلاق دیدینے کے بعد تا نکاح ثانی اس کے نان ونفقہ کو اس کے سابق شوہر ضروری قرار دیا گیا ہے، اسلامی قانون کی رو سے ایام عدت کے نان ونفقہ اور سکنیٰ کے بعد سابقہ بیوی کا کوئی حق سابق مرد پر نہیں رہ جاتا ہے۔

ایک تجویز کے ذریعہ ان کتابوں کی چھان بین کا انتظام کیا گیا جن کو عدالتیں محمڈن لا کا ماخذ سمجھ کر ان ہی سے مسلمانوں کے عائلی قوانین کا فیصلہ کرتی ہیں، حالانکہ ان میں توجیہ اور مفہوم کی غلطیاں ہیں، ایسی کتابوں کو دیکھ کر ان کے اغلاط پر نشان دہی کرنا اور صحیح معنی ومفہوم ظاہر کرنا ضروری قرار دیکر ایک رکن کو جو موجودہ قوانین اور شرعی قوانین کے عالم ہیں اس کام کا ذمہ دار بنایا اور یہ کہ وہ دوسرے ارکان سے مدد لیکر کام چھ ماہ میں مکمل کرلیں۔

ایک تجویز کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا کہ پورے ملک میں ’’یوم تحفظ قانون شریعت‘‘ منایا جائے اور ایسے اجتماعات کئے جائیں جن میں مسلم پرسنل لا کے بارے میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو واضح کیا جائے، اس کی تفصیل کے لئے مجلس عاملہ ہر صوبے میں طریق کار پر غور کرے۔

نیز طے پایا کہ عالمی سطح پر مسلم پرسنل لا کا ایک اجلاس منعقد کیا جائے جس میں عالم اسلام کے علماء وفضلاء اور ماہرین قانون شریک ہوں، اس لئے چند افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی گئی جو طریق کار پر غور کرکے مجلس عاملہ کو اپنی رپورٹ پیش کرے

گی، ایک تجویز مسلم پرسنل لا بورڈ کے انتقال کرنے والے ارکان کی تعزیت میں پیش کرکے ان کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے دو کھلے اجلاس رات میں عیدگاہ عبدالقدوس کے میدان میں ہوئے، جہاں تاحد نظر انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور روشنی ہی روشنی تھی، جلسہ گاہ کو نہایت قرینے سے سجایا گیا تھا، جس سے عقیدت ومحبت اور خلوص ومحنت کا مظاہرہ ہو رہا تھا، دونوں جلسے مغرب کی نماز کے بعد سات بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک ہوئے، دور دور سے آئے ہوئے مسلمان بڑے جوش وخروش اور عزم وحوصلہ سے ان جلسوں میں شریک رہے، مقررین حضرات نے اپنے اپنے انداز میں ہوش اور جوش کی باتیں کیں، پہلے جلسہ میں خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی گئی جسے فاضل نوجوان مولانا اشرف علی اشرف سعودی نے کہا تھا، یہ نظم ہر اعتبار سے بہت خوب رہی اس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

شیعہ واہلحدیث ان میں ہیں اور سنی بھی — دیوبندی بھی ہیں اسلامی وتبلیغی بھی
کانگریسی بھی ہیں، جمعیتی، اور لیگی — مختلف فکر کے مداح بھی اور داعی بھی
ہو کے آپس میں یہ سب شیر وشکر آئے ہیں
پیشوایان حرم بن کے خضر آئیں

بورڈ میں یوپی ہے آسام بھی ہے ایم پی بھی ہے — اس میں بنگال بھی گجرات بھی دہلی بھی ہے
اس میں میسور بھی مدراس بھی اے پی بھی ہے — اس میں کیرل بھی ہے کشمیر کی وادی بھی ہے
بمبئی بھی ہے، بہاری بھی اتر آئے ہیں
پیشوایان حرم بن کے خضر آئیں

جناب مولانا ابوالسعود صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا پرمغز اور بسیط مطبوعہ خطبہ استقبالیہ سنایا، بنگلور کے اخبارات سالار اور آزاد نشیمن وغیرہ نے ان

جلسوں اور کاروائیوں کو تفصیل کے ساتھ شائع کیا، اور اپنے تعاون سے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا، یہ اخبارات بالالتزام روزانہ صبح کو مہمانوں کی قیام گاہ میں پہونچائے جاتے تھے۔

باہر سے آنے والے تمام مہمانوں کی خدمت اور خاطر تواضع پر جامعہ سبیل الرشاد کے طلبہ مقرر کیے گئے تھے جنھوں نے نہایت سلیقہ مندی اور ذمہ داری سے یہ خدمت انجام دی، ان طلبہ کی وضع قطع میں دینی وعلمی وقار تھا، اور ان میں علم دین کی جھلک پائی جاتی تھی، انھوں نے رات دن ایک کر کے مہمان نوازی اور جلسہ کے انتظام میں بڑی خوبی پیدا کی، مولانا ابوالسعود صاحب اور دیگر اساتذہ بھی ہر وقت خاطر تواضع میں لگے رہتے تھے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مدارس عربیہ کے اساتذہ وطلبہ انتظامی امور میں زیادہ باصلاحیت نہیں ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی خام خیالی اس طرح کی انتظامی صلاحیت کے مظاہرے سے دور ہوسکتی ہے، جلسہ کے اختتام پر جب یہ طلبہ اپنے مختصر سامان لیکر دس دس پانچ پانچ کر کے اپنے مدرسہ میں جا رہے تھے تو بہت سے مہمان ان کو حسرت بھری نظر سے دیکھ رہے تھے اور دعائیں دے رہے تھے۔

دفتری انتظام بھی بہت خوب تھا اور اس میں کام کرنے والے حضرات بھی ہر کام میں نہایت مستعدی اور ذمہ داری سے خدمت انجام دے رہے تھے، جلسہ گاہ تک مہمانوں کے آنے جانے کے لئے گاڑی کا انتظام تھا، شہر کے بعض مخیّر مسلمانوں کی طرف سے مہمانوں کی دعوتیں بھی اسی ہوٹل میں ہوئیں، چنانچہ ۲۲۔فروری کو بعد ظہر جناب سید نور برادرس آٹو انجیرنگ ورکس بنگلور کی طرف سے دعوت ہوئی، اور ۲۳ر فروری کو ظہر کے بعد ہوٹل کے مالک جناب سید احمد صاحب کے گھر پر جو پاس ہی تھا بڑی پر تکلف دعوت ہوئی، نیز اس درمیان میں شہر کے مختلف تعلیمی اور دینی اداروں میں چائے نوشی کی دعوتیں ہوئیں، ۲۳۔فروری کو بعد نماز عصر جمعیۃ علماء بنگلور کا ایک

خصوصی جلسہ ہوا جس میں جمیعۃ علماء کے شہری ارکان اور حلقہ ءجمیعۃ کے مہمان شریک ہوئے، یہاں بھی چائے نوشی کا انتظام تھا، اسی طرح مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل، امارت شرعیہ وغیرہ کے جلسے اس موقع پر شہر میں ہوئے، اور مہمانوں نے ان میں شرکت کی، الغرض تین دن تک شہر بنگلور میں بڑی چہل پہل رہی۔

سلطان ٹیپو کے مزار پر

۲۳۔فروری کو مسلم پرسنل لا کا اجلاس ختم ہوگیا، ۲۴۔فروری دوشنبہ کو سرنگا پٹم اور میسور وغیرہ جانے کا پروگرام بنا، ظفر مسعود نے اپنے ایک متعارف تاجر سے موٹر کا انتظام کیا اور انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ دس گیارہ بجے تک موٹر ہندوستان ہوٹل پہونچ جائے گا چنانچہ موٹر آیا مگر ایسا بگڑا کہ فوری طور سے نہ بن سکا اور ہم لوگ بس سے روانہ ہو سکے، مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی اور بعض دوسرے لوگ بھی ساتھ تھے، بنگلور سے ساٹھ ستر میل سرنگا پٹم ہے جہاں ٹیپو سلطان کا قلعہ اور مزار وغیرہ ہے، سڑک کے مغربی جانب قلعہ ہے، اندر مسجد ہے اس میں ظہر ادا کی گئی، پاس ہی وہ جگہ ہے جہاں میر صادق کی غداری کی وجہ سے سلطان ٹیپو انگریزی فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہوکر گرے تھے، آگے ایک مندر ہے جسے سلطان مرحوم نے یہاں قبضہ کرنے کے بعد باقی رکھا تھا، سڑک کے مشرق میں ان کا مزار ہے، شاندار عمارت میں تین مزارات ہیں، بتایا گیا کہ سلطان کی وصیت کے مطابق ان کو ان کے والد اور والدہ کے ساتھ دفن کیا گیا ہے، اس کے مغربی جانب شاندار مسجد ہے، یہاں عجیب شان وشوکت کا احساس ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شجاعت وسطوت اس در کی پاسبانی کرتی ہے، حظیرہ کے دروازہ کے دائیں بائیں دونوں جانب سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق فارسی میں تاریخی اشعار خط نستعلیق میں جلی حرفوں میں کندہ ہیں، مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد وہیں ایک موٹر والے سے جو بندرابن گارڈن جا رہا تھا بات چیت

کر کے عصر کے بعد بندرابن گارڈن میں پہونچے جو یہاں سے دس بارہ میل پر واقع ہے، یہ مقام جنوبی ہند کا مشہور تاریخی مقام ہے جو مہاراجہ میسور اور اس کے مسلمان وزیر کے ذوق کی لطافت کا بہترین مظاہرہ کر رہا ہے اس کے مغرب میں دریا پر بہت اونچا بند باندھا گیا ہے اور بہت بڑے باغ میں رنگ برنگ کے پھول لگائے گئے ہیں، درمان میں پانی جمع کر کے بہت بڑی پختہ جھیل بنائی گئی ہے جس میں موٹر لانچ سے سیر کرائی گئی جاتی ہے، جھیل میں راستہ نکالا گیا ہے جگہ جگہ فوارے ہیں سر شام فواروں کے ساتھ رنگ برنگ کی روشنی کا منظر عجیب وغریب ہوتا ہے، دور دور سے روزانہ ہزاروں آدمی یہاں سیر وتفریح کو آتے ہیں، بنگلور میں سرنگاپٹم، میسور، اور بندرابن کی سیر وتفریح کرنے والے سیاحوں کے لئے بہت سی موٹر کمپنیاں آرام دہ اور خوبصورت بسیں چلاتی ہیں ان سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے، اس گارڈن، جھیل اور پھولوں کی کیاریوں کو دیکھ کر دہلی کے لال قلعہ کا اندرونی منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ وہاں کا چمن اجاڑ کر یہاں لگا دیا گیا ہے، مسلم پرسنل لا کے جلسہ میں آنے والے بہت سے مہمان اس تفریحی مقام میں صبح ہی سے موجود تھے، مغرب کی نماز اسی باغ میں ادا کی گئی، اس کے بعد میسور آئے، یہ شہر بھی نہایت صاف ستھرا خوبصورت اور ہرا بھرا ہے، مہاراجہ میسور بہت باذوق تھے انھوں نے اس شہر کے حسن تعمیر میں اپنے ذوق سے کام لیا ہے، گیارہ بجے رات میں بنگلور واپسی ہوئی، آج بھی قیام وطعام کا انتظام ہندوستان ہوٹل ہی میں تھا، چنانچہ کھانا کھا کر عشاء کی نماز پڑھی اور آرام کیا۔

جامعہ سبیل الرشاد

۲۵؍فروری ۱۳؍صفر سہ شنبہ کو یہاں کی مشہور دینی اور علمی درسگاہ جامعہ سبیل الرشاد کے اساتذہ وتلامذہ سے ملنے اور ان سے خطاب کرنے کا موقع ملا، شہر کے باہر

شمال مشرقی کنارے پر جامعہ سبیل الرشاد واقع ہے، جس کے بانی اور مہتمم مولانا ابوالسعود صاحب ہیں، ان کے خلوص ومحنت کی وجہ سے پندرہ سال کی مدت میں یہاں ایک نہایت شاندار دینی درس گاہ بن گئی ہے اسی جگہ پر پہلے چمڑے کی دباغت کا کام ہوتا تھا مگر چند ہی سالوں میں اس کی شاندار عمارت تیار ہوگئی ہے جو نہایت خوبصورت اور پرفضا مقام پر ہونے کی وجہ سے بڑی جاذبیت رکھتی ہے، جامعہ کے آس پاس نہایت کشادہ زمین واقع ہے، اندروسیع وعریض صحن ہے، مغرب اور شمال میں باقاعدہ عمارتیں بن چکی ہیں، شمال میں مدرسہ کی عمارت سے کچھ دور نہایت شاندار مسجد بنائی گئی ہے، تقریبا دوسو طلبہ یہاں تعلیم وتربیت حاصل کررہے ہیں، چونکہ بنگلور کے مسلمان مخیّر تاجر اس جامعہ کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اس لئے تعمیراتی اخراجات اور دیگر اخراجات میں پریشانی نہیں ہے۔

جمعیۃ الرشاد کے نام سے طلبہ کی انجمن ہے، اکثر طلبہ اپنے ذوق کے مطابق جمعرات کو وعظ وارشاد کے لئے باہر چلے جاتے ہیں بقیہ طلبہ جمعہ کی رات مسجد میں گذارتے ہیں، یہاں آکر طبیعت میں بڑا انبساط ونشاط ہوا، کتب خانہ بھی مدرسہ کی کم عمری کے اعتبار سے نہایت شاندار ہے اور بہت سی کام کی کتابیں ہیں، راقم کی تصانیف بھی یہاں نظر آئیں، مدرسہ کے طلبہ ومدرسین نے مسلم پرسنل لا کے اجلاس کی کامیابی میں نہایت تندہی اور خلوص سے نمایاں خدمات انجام دیں، باقیات صالحات ویلور اور دارالعلوم عمرآباد کی طرح جامعہ سبیل الرشاد بنگلور بھی جنوبی ہند کے مشہور دینی مدارس میں شمار ہوتا ہے اور اپنی تازہ دم خدمات کی وجہ سے بڑی کشش رکھتا ہے، ناشتہ اور چائے نوشی کے بعد مسجد میں طلبہ ومدرسین کا اجتماع ہوا جس میں مولانا حبیب الرحمان صاحب اور میں نے اساتذہ وتلامذہ کے حقوق وآداب اور علم دین کے موضوع پر خطاب کیا، کچھ وقت کتب خانہ میں بھی گذرا اور چونکہ گیارہ بجے وانمباڑی

کے لئے سفر کرنا تھا، اس لئے وہاں سے تقریباً دس بجے ہندوستان ہوٹل آ گئے۔

شہر بنگلور

۲۱ فروری جمعہ کی شام کو بنگلور آئے اور آج ۲۵ فروری سہ شنبہ کو یہاں سے نکلنے کا وقت بھی آ گیا، مگر ہم اس ''شہر رنگ وبو'' کے بارے میں ناظرین کو کوئی معلومات نہیں دے سکے کیوں کہ چار روزہ مصروفیات نے اس خوبصورت اور روایتی شہر میں گھومنے پھرنے کا موقع ہی نہیں دیا، ایک دن شام کو تھوڑی دیر کے لئے مشہور تاریخی تفریح گاہ لال باغ میں جانا ہوا تھا، جہاں قسم قسم کے پھول پتے درخت بہت زیادہ ہیں، یہ باغ سیکڑوں سال قدیم ہے اور میلوں میں پھیلا ہوا شہر کا خوبصورت ترین مقام ہے، شام کو یہاں بڑی چہل پہل رہتی ہے، پھول اور سرسبزی کے اس دیس میں ''لال باغ'' قلب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے علاوہ اور کئی خوبصورت باغات اور گارڈن ہیں، جن میں رنگ برنگ کے پھولوں کی تختہ بندی نہایت قرینے سے کی گئی ہے، اسمبلی کی جدید عمارت اور اس کے آس پاس پھولوں کی کیاریاں بڑی دلکش ہیں، معلوم ہوا کہ یہاں کے بہت سے علاقے مشہور انگریزوں کے نام پر ہیں کیونکہ جب وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوتے تھے تو بنگلور آ کر بقیہ زندگی گذارتے تھے، اور اس شہر کے جمالیاتی پہلو کو اپنے ذوق کے مطابق خوب خوب واضح کرتے تھے، شہر صاف ستھرا، سڑکیں اور گلیاں وسیع، عمارتیں خوبصورت اور جدید دکانیں بڑی اور سجی ہوئی، لوگ عام طور سے با اخلاق، بامروت، ملنسار اور اچھی طبیعت کے ہیں، مسلمانوں میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی بیداری ہے، ان کے اپنے اسکول، کالج اور تعلیمی ادارے اور ان کے لئے اوقاف ہیں، تجارت میں آگے ہیں، دولتمندی کے ساتھ دینی، ملی اور قومی کاموں میں خرچ کرنے کا جذبہ ہے، کسی مقام میں دو چار دن رہ کر وہاں کے بارے میں صحیح معلومات نہیں دی جاسکتی ہیں، زیادہ سے زیادہ اپنے

تاثرات ظاہر کیے جاسکتے ہیں جوضروری نہیں ہے کہ صحیح ہوں کیونکہ مسافروں اور سیاحوں کی نظرعبوری اوروقتی ہے، اگراس کے ساتھ علم ومعلومات کا جوڑ ہوتو بات وزنی ہوتی ہے مگر یہاں تو معلومات حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

۲۵؍فروری سہ شنبہ کو دوپہر سے پہلے بذریعہ ٹرین وانمباڑی کیلئے روانگی ہوئی، ٹرین کا نام غالبا بندرابن اکسپریس تھا جوکافی تیز رفتاراورآرام دہ تھی، چنداسٹیشنوں کے بعدایک اسٹیشن پراترے جہاں سے بذریعہ کاروانمباڑی روانہ ہوکرعصرتک منزل مقصود پرپہونچے، شہرمیں داخل ہوتے ہی ایک شاندارمسجد سامنے نظرآئی جس میں نمازعصرکی جماعت ہونے والی ہی تھی، ہم لوگوں نے یہیں نمازادا کی، اس کے بعد مدرسہ نسواں انجمن خیرخواہ عام میں گئے، صوبہ مدراس تامل ناڈو میں مسلمان بچیوں کی تعلیم وتربیت کا یہ ادارہ بہت قدیم ہے جس کی تفصیلات آئینۂ وانمباڑی نامی ضخیم کتاب میں موجود ہے، اس میں جنوبی ہند ہی نہیں بلکہ دیگرممالک کی بچیاں بھی تعلیم وتربیت پاتی ہیں، اوران کیلئے ہرقسم کا بہترین اوراطمینان بخش انتظام ہے، دیرتک اس مدرسہ کی کارگذاری دیکھی، طالبات سے قرأت، تقریراوردینی معلومات سنیں، ان کے رہنےسہنے کے انتظامات دیکھے، واقعی یہ ادارہ اپنی نوعیت کا واحدادارہ جوایک مدت سے نہایت کامیابی اورعمدگی سے چل رہاہے، اس کی عمارت نہایت شانداراورآرام دہ ہے، اسی میں درس گاہ اورقیام گاہ ہےاورجملہ ضروریات مہیاہیں، معاینہ کے رجسٹرمیں اپنی رائے لکھی جس میں مشاہیرہند مولاناظفرعلی خاں اورسیدسلیمان ندوی وغیرہ کے آراء ہیں۔

اس کے بعد مجلس العلماء نامی ایک ادارہ کی کارروائی اورمنشورات دیکھیں، یہ انجمن وانمباڑی کے علماء نے قائم کی ہے، اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دینی اورتبلیغی خدمت کی جاتی ہے، مختلف دینی موضوعات پرکتابچے اوررسالے شائع کیے جاتے ہیں، عشاء کے بعدایک مسجد میں جلسہ ہواجس میں میں نے اورمولانا حبیب الرحمان

صاحب نے تقریریں کیں۔

صبح کو یہاں کے قدیم ترین مدرسہ معدن العلوم میں حاضری ہوئی، ۱۳۰۵ھ میں یہاں مدرسہ فیض عام پھر مدرسہ معدن العلوم قائم ہوا، جس میں مولانا محمد صادق صاحب فاضل جامع ازہر متوفی ۱۳۰۸ھ جیسے عالم وفاضل نے درس دیا ہے، نیز اور دیگر کئی مشہور اساتذہ نے یہاں تعلیمی خدمت انجام دی ہے۔

مدرسہ کی عمارت قدیم طرز کی ہے جس کے درودیوار سے علم واخلاق کا ظہور ہوتا ہے، کئی قابل اساتذہ درس دیتے ہیں، اچھا خاصا کتب خانہ ہے جس میں کئی نادر اور نایاب امہات کتب ہیں، تھوڑی دیر کتب خانہ کی سیر کی، مختصر سا جلسہ ہوا جس میں مدرسین وطلبہ اور شہر کے علماء واعیان شریک تھے، موقع کی مناسبت سے میں نے طلبہ کو خطاب کیا، پھر مولانا انظر شاہ کشمیری نے خطاب کیا، مولانا حبیب الرحمان صاحب نے دعاء فرمائی، اس کے بعد پر تکلف ناشتہ اور چائے نوشی ہوئی، چونکہ ویلور جانا تھا اور وقت بہت کم تھا اس لئے مدرسہ معدن العلوم سے جلد واپسی ہوئی راستہ میں مدرسہ کی خریدی ہوئی نئی زمین دیکھی جو شہر کے کنارے ایک پر فضا مقام پر ہے، اس جگہ مدرسہ کی جدید عمارتیں بنائی جائیں گی۔

۲۶۔فروری چہارشنبہ کو تقریبا نو بجے یہاں سے بذریعہ موٹر کار جنوبی ہند کی مشہور قدیم درس گاہ ''مدرسہ باقیات الصالحات'' ویلور کے لئے روانگی ہوئی، راستہ میں بعض مشہور مقامات ومدارس آئے مگر وقت کی کمی کی وجہ سے ان میں حاضری نہ ہوسکی اور تقریبا بارہ بجے ویلور پہونچے جہاں پہلے ہی مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم پہونچ چکے تھے، مدرسہ ''باقیات صالحات'' کے بانی مولانا عبدالوہاب صاحب قادری ویلوری رحمۃ اللہ علیہ نے مکہ مکرمہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا وہ

صاحب نسبت بزرگ تھے،ان کے حالات میں ''مجدد جنوب'' نامی کتاب شائع ہوچکی ہے۔

مولانا عبدالوہاب صاحب نے ابتداء میں اپنے گھر پر تعلیمی سلسلہ شروع کیا، اس کے بہت دنوں کے بعد مدرسہ باقیات صالحات کی مستقل عمارت تیار ہوئی اوراسی میں تعلیم دینے لگے،گذشتہ سال مدرسہ کا صدسالہ جشن بڑے دھوم دھام سے منایا گیا تھا،جس میں شرکت کا دعوت نامہ بھی موصول ہوا تھا مگر حاضری نہیں ہوسکی تھی، یہاں کے اساتذہ میں مولانا شاہ سید محمد صبغۃ اللہ صاحب بختیاری سے راقم کو پہلے حج میں نیاز حاصل ہوا،ڈاکٹر عبدالحق صاحب مدراسی،مولانا عبدالباری صاحب حاوی مدراسی وغیرہ سے بھی اسی سفر میں پہلی ملاقات ہوئی تھی،ہم سب ایک ہی جہاز میں تھے اورحجاز مقدس میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی ،مولانا بختیاری صاحب نسبتاذی استعداداور بزرگ عالم ہیں،فراغت دارالعلوم دیوبند سے کی ہے،باغ وبہار قسم کے عالم ہیں،کئی سال سے یہاں تعلیمی خدمت انجام دیتے ہیں،بعض دیگر اساتذہ سے بھی پہلے ملاقات تھی ،افسوس کہ وقت کی کمی کے باعث یہاں بہت مختصر قیام رہا،مولانا بختیاری نے اس مختصر اور ہنگامی ملاقات میں ایک بار پھر پیش کش فرمادی کہ تم یہاں آکر رہواور جنوبی ہند کے اہل علم کے حالات قلمبند کرو،دوپہر کا کھانا مدرسہ ہی میں کھایا گیا،اس دیار میں ویلور علمی ،دینی اورتاریخی مقام ہے، یہاں ماضی میں بڑے بڑے علماء وفضلاء اوراہل اللہ گذرے ہیں،آج بھی ان کے برکات و حسنات سے یہ سرزمین شاداب ہے،انگریزوں نے ٹیپوسلطان کی شہادت کے بعدان کے خاندان کواسی جگہ رکھا تھا، یہاں ایک قدیم قلعہ بھی ہےاورسب سے زیادہ مشہوروہ اسپتال ہے جو پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحداسپتال ہےاس میں دل اور دماغ وغیرہ کا آپریشن ہوتا ہے، جسے عیسائی مشنری چلاتی ہے،دنیا کے مختلف ممالک

کے مریض یہاں بغرض علاج آتے ہیں، ان دنوں سنا ہے کہ اسپتال میں ہڑتال تھی، اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ عزیزی مولوی خالد کمال مبارکپوری سلمہٗ سے گھانا (مغربی افریقہ) میں ایک مشنری اسپتال کے لوگوں نے بتایا تھا کہ جنوبی ہند میں ہمارا ایک اسپتال ہے جس میں دل اور دماغ وغیرہ کا آپریشن ہوتا ہے، آپ بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ وہ اسپتال یہی ہے۔

وانمباڑی اور ویلور وغیرہ کا علاقہ آرکاٹ کے نام سے مشہور ہے، آج بھی شمالی آرکاٹ اور جنوبی آرکاٹ ضلع کی حیثیت سے مشہور ہیں اور یہاں گوپامئو کا ایک خاندان حکمراں تھا جس میں کئی نواب و امراء گذرے ہیں اور سب کے سب علم دوست اور علم پرور تھے، یہاں کی سلطنت والا جاہی کے نام سے مشہور تھی جس میں نواب محمد علی والا جاہ کے بعد نواب عمدۃ الامراء بہادر تخت نشیں ہوئے تو انگریزوں نے ریاست پر قبضہ کر کے نواب کے لئے آمدنی کا پانچواں مقرر کر دیا، اس کے بعد نواب عظیم الدولہ، نواب اعظم جاہ اور نواب غلام غوث خاں نے گری پڑی حکومت سنبھالی اور اپنی استعداد بھر علمی و دینی خدمت کی، نواب محمد علی والا جاہ نے بحر العلوم ملا عبد العلی فرنگی محلی کو دعوت دیکر بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ بلایا اور اپنے مدرسہ کی مدرسی دی، اس زمانہ میں کرناٹک یا آرکاٹ کے ان نوابوں کی وجہ سے پورا علاقہ دار العلم والعلماء بنا ہوا تھا، بحر العلوم ملا عبد العلی فرنگی محلی، قاضی نظام الدین احمد صغیر، مولوی امین الدین احمد خاں بہادر، مولوی ولی اللہ ترچناپلی، مولا سید شاہ ابو الحسن قربی ویلوری، مولانا سید شاہ عبد اللطیف ذوقی، مولانا باقر آگاہ ویلوری مدراسی، مولانا محمد غوث شرف الملک بہادر، مولوی غلام محی الدین معجز، مولانا عبد القادر ناظر، قاضی ارتضٰی علی خاں بہادر، مولوی عبد الوہاب مدار الامراء بہادر، مولوی محمد صبغۃ اللہ، قاضی بدر الدولہ بہادر، قطب ویلور سید شاہ عبد اللطیف قادری ویلوری، مولوی تراب علی لکھنوی، مولوی محمد حسن علی ماہلی

اعظم گڈھی، مولانا عبدالقادر آتوری، مولانا عبدالوہاب ویلوری بانیٔ مدرسہ باقیات صالحات وغیرہ اس علاقہ کے مشاہیر اصحاب علم دوست تھے، جن کے دم سے اس علاقہ میں ہر طرف علمی اور دینی رونق تھی اور والا جاہی نوابوں کی علم دوستی کا فیض عام تھا۔

افسوس کہ جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ دارالسلام عمرآباد میں حاضری نہ ہوسکی حالانکہ بنگلور کے سفر میں اس میں حاضری کا حتمی ارادہ تھا، مگر درمیان میں نئے پروگرام کی وجہ سے اس سے محرومی رہی، حالانکہ وانمباڑی سے ویلور جاتے ہوئے چند میل دوسری سمت جاکر یہاں پہونچ سکتے تھے، یہاں ہمارے یہاں کے دو خاندان رہ بس گئے ہیں اور تعلیمی وتدریسی خدمت انجام دیتے ہیں، ایک مولانا عبدالسبحان صاحب ساکن مئو جو یہاں کے پرانے مدرس ہیں اور یہیں متاہل ہوکر آباد ہوگئے ہیں، دوسرے ہمارے رشتہ دار مولوی ظہیر الدین صاحب حسین آبادی جو یہاں مدرس ہیں انھوں نے بھی یہیں بود و باش اختیار کرلی ہے، حسن اتفاق کہ دونوں صاحبوں سے مدراس میں ملاقات ہوگئی۔

بہرحال ۲۶۔فروری کو ویلور سے قبل ظہر بذریعہ ریل مدراس کے لئے روانگی ہوئی، وانمباڑی میں مولانا عبدالباری صاحب حاوی مدراسی مرحوم کے صاحبزادے مولانا عبدالباقی سلمہ سے ملاقات ہوگئی جو اسی سال حج و زیارت سے واپس آکر احباب سے ملاقات کے لئے آئے تھے، ان کے والد مرحوم اور خود ان سے پہلے سے تعارف و تعلق ہے، بلکہ ایک گونہ عزیزانہ تعلق ہے ان سے ملاقات کے بعد مدراس کا سفر بہت آسان ہوگیا، وہ صبح کی گاڑی سے مدراس پہونچ گئے اور جب ہم لوگ چار بجے کے قریب مدراس اسٹیشن پر پہونچے تو حسب مشورہ و وعدہ موصوف اسٹیشن پر آگئے، اس سلسلہ میں ان کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی ان کی گاڑی لیٹ پہونچی جس کی وجہ سے وہ ہمارے بعد پہونچ سکے، ہم لوگ اسٹیشن ہی پر ان کے انتظار میں رکے رہے

اوران کے ساتھ ان کے مکان واقع بڑی میٹ پہونچے، تھوڑی دیر کے بعد ان کے ساتھ کتب خانہ محمدیہ مدراس میں پہونچے جہاں مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی کو امام ابن اثیر جزری کی حدیث کی مشہور کتاب جامع الاصول کو دیکھنا تھا، یہ کتب خانہ مخطوطات ونوادرات کے بارے میں ہندوستان ہی میں نہیں دنیا میں شہرت رکھتا ہے اس کی عمر تقریبا چارسو سال ہے، قلمی اور نادر کتابوں کے علاوہ دیگر نوادرات بھی موجود ہیں خاص طور سے نوابان کرناٹک اور سلطان ٹیپو سے متعلق بہت سے فرامین اور تحریریں یہاں پائی جاتی ہیں نیز بادشاہوں اور امراء کے سکے اور بعض استعمالی سامان موجود ہیں، کچھ دنوں پہلے یورپ سے کوئی نوجوان مستشرق یہاں آیا تھا اور اس کو فارسی کے مخطوطات سے کام لینا تھا، مگر فارسی زبان نہیں جانتا تھا اس لئے ایران جاکر چھ ماہ میں فارسی زبان سیکھی پھر واپس آکر اپنے علمی اور تحقیقی کام کی تکمیل کی اور پورے طور سے فارسی کے مخطوطات سے فائدہ اٹھایا، اس واقعہ میں اہل علم وتحقیق کے لئے عبرت ہے، یہاں پچاسوں ہزار کتابیں ہیں، ڈاکٹر محمد غوث صاحب نے ہمیں امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب احکام الذمیین کا وہ واحد اور نادر نسخہ دکھایا جو دنیا میں صرف اسی کتب خانہ میں ہے، نیز بیروت کا چھپا ہوا وہ مطبوعہ نسخہ بھی دکھایا جو اسی قلمی نسخہ سے شائع کیا گیا ہے، اس کے مقدمہ میں اس کتب خانہ محمدیہ اور ڈاکٹر محمد غوث صاحب کا شکریہ ادا کیا گیا ہے جن کے علمی تعاون سے یہ کتاب چھپ سکی ہے، نیز اس کتب خانہ میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک قلمی تصنیف دیکھی جس پر ان کے دست مبارک سے کئی سطروں میں سرخ روشنائی سے اجازت درج تھی، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی تحریر دیکھ کر دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا۔

محترم ڈاکٹر محمد غوث صاحب کمال ذوق وشوق سے نوادرات نکال کر زیارت

کراتے رہے، یہ موصوف کی علم دوستی اور علم واہل علم کی قدرشناسی ہے، مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی نے جامع الاصول کی بعض عبارتیں نقل کیں، ڈاکٹر صاحب نے وہ کتاب بھی دکھائی جواس کتب خانہ کی پہلی کتاب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتب خانہ دسویں صدی ہجری میں قائم تھا، اس وقت کتابیں غیر مرتب تھیں کیونکہ جدید فہرست تیار ہورہی تھی، کتب خانہ محمدیہ اور مدرسہ محمدی کے سرپرست مولانا سید عبدالوہاب صاحب چیف قاضی مدراس باوجود پیرانہ سالی اور ضعف کے ملاقات کے لئے تشریف لائے، تقریباً بیس سال ہوئے مولانا مصوف سے بمبئی میں ایک دعوت میں نیاز حاصل ہوا تھا جب وہ یہاں تشریف لائے تھے، اس وقت کافی ضعیف اور کمزور ہوچکے تھے، اب تو ان کی ذات بابرکات سلف صالحین کی یاد بن کر رہ گئی ہے۔

کتب خانہ محمدیہ جاتے ہوئے مولانا محمد یوسف کوکن عمری لکچرار عربی فارسی واردو مدراس یونیورسٹی کے یہاں حاضری ہوئی مگر موصوف سے ملاقات نہ ہوسکی واپسی پر ملاقات ہوئی، مولانا محمد یوسف کوکن عمری عربی وانگریزی کے عالم اور قدیم وجدید کے سنگم ہیں، علم وتحقیق اور لکھنے پڑھنے کا ذوق سلیم رکھتے ہیں، ایک زمانہ میں دارالمصنفین اعظم گڈھ میں مولانا سید سلیمان ندوی کی زیر سرپرستی رہ کر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح پر معلومات فراہم کیں اور بعد میں امام ابن تیمیہ پر نہایت مبسوط ومستند کتاب شائع کی جو اردو زبان میں اپنے موضوع پر پہلی مستقل کتاب ہے، قاضی بدرالدولہ پر بھی ایک مفصل کتاب لکھی ہے، نیز بحرالعلوم ملا عبدالعلی فرنگی محلی پر محققانہ مقالہ شائع کیا، موصوف نے اردو میں تصنیف وتالیف کے لئے جنوبی ہند میں ایک ادارہ بھی قائم کیا ہے، سیمیناروں اور اسٹڈیز کانفرنسوں میں شریک ہوکر عالمانہ ومحققانہ مقالہ پڑھتے ہیں، ان سے پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی جب وہ حج وزیارت کو گئے تھے اسی موقع پر مجھے اپنی قیمتی تصنیف ''امام ابن تیمیہ'' عنایت کی تھی، اس کے بعد

مختلف مواقع پر ملاقاتیں ہوتی رہیں، اور اب تو ان سے ایک خاص علمی تعلق ہو گیا ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدر آبادی فرنساوی سے خاندانی تعلق رکھتے ہیں۔

ان کے یہاں دیر تک علمی مجلس رہی اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا، ساتھ ہی پر تکلف چائے نوشی بھی رہی، مولانا حبیب الرحمان صاحب کو اور مجھ کو اپنی جدید تصنیف ''کرناٹک میں فارسی'' (انگریزی) پیش کی اس کتاب کو کن صاحب نے بڑی تحقیق و تلاش کے بعد نہایت مستند و معتبر طریقہ پر مرتب کیا ہے اس موضوع پر اتنی ضخیم کتاب ان کے علمی ذوق کی دلیل ہے، کتاب کا ظاہری حسن و جمال بھی قابل دید ہے۔

تقریبا نو بجے رات میں وہاں سے واپسی ہوئی اور عشاء کی نماز کے بعد مولانا عبدالباقی صاحب کے یہاں کھانا کھا کر آرام کیا گیا، ۲۷۔ فروری کو فجر کے بعد ملا بحرالعلوم عبدالعلی فرنگی محلی کے مزار پر مولانا حبیب الرحمان صاحب وغیرہ گئے، میں اس لئے نہیں جا سکا کہ ظفر مسعود سلمہ کو انفلائنزا کا شدید حملہ ہو گیا تھا، ناشتہ کے بعد جمالیہ کالج میں حاضری ہوئی جو جنوبی ہند میں قدیم و جدید کا مشہور مرکز ہے، اور جہاں عربی کے ساتھ عصری تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

چلتے چلاتے دو تین درسگاہوں سے گذرے جہاں اساتذہ عربی کی تعلیم دے رہے تھے، ہندوستان کے علاوہ ملائشیا وغیرہ کے طلبہ بھی موجود تھے، طرز تعلیم اور نشست وغیرہ بالکل جدید طرز پر تھی، لڑکے کرسیوں پر بیٹھے تھے، آگے تپائی تھی اور استاذ سامنے کرسی پر عربی زبان میں عربی کی کتابیں پڑھاتے تھے چونکہ ہم شمالی ہند والے مدرسوں کے پرانی طرز تعلیم اور پرانی طرز بود و باش سے مانوس ہیں اس لئے ہم کو طلبہ و اساتذہ کے لباس اور وضع قطع سے مناسبت پیدا نہ ہو سکی، اور عجیب سا معلوم ہونے لگا، واپسی پر دارالعلوم عمرآباد کے ناظم صاحب کے یہاں پر تکلف چائے نوشی

اور علمی گفتگو رہی، موصوف جواں عمر کے ساتھ عزم وحوصلہ میں بھی جوان ہیں، اور علمی ودینی معاملات میں بڑے باحوصلہ ہیں، موصوف نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کوفون کر کے ظفر مسعود کوان کے یہاں اپنے آدمی کے ساتھ بھجوایا، ڈاکٹر صاحب نے بڑی توجہ سے دیکھ کرفورا دوادی جوزوداثر اور مفید تھی، اس بارے میں موصوف میرے ذاتی شکریہ کے مستحق ہیں۔

حسن اتفاق کہ جمالیہ کالج میں میری والدہ مرحومہ کے خالہ زاد بھائی مولانا ظہیرالدین حسین آبادی مل گئے اور تھوڑی دیر ساتھ رہا، وہاں سے مولانا عبدالسبحان مئوی اعظمی کی ملاقات کے لئے یہاں کے مشہور اسپتال میں گئے جو بغرض علاج داخل ہوئے تھے، یہ دونوں حضرات دارالسلام عمرآباد میں مدرس ہیں، اور علاقۃً مدراس ہی میں رہ بس گئے ہیں۔

مدراس کے مشہور تاجرومخیّر جناب پیش امام عبدالقادر صاحب اینڈ کمپنی بڑی سیٹ مدراس کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا، موصوف نہایت مخلص اور دیندار تاجر ہیں، اور دینی وعلمی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، راقم سے ان کو غائبانہ دینی وعلمی تعلق ہے۔

مدراس کے قیام اور اس کی مصروفیات میں مولانا عبدالباقی صاحب کے خلوص ومحبت کا بڑا دخل ہے، موصوف نے ہمارے لئے نہ صرف اپنی کاروباری مصروفیات کو بند رکھا بلکہ ہماری خدمت میں رات ودن مصروف رہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، ۲۷۔فروری کوظہر کے بعد حیدرآباد کے لئے روانگی ہوئی۔

(قاضی صاحب حیدرآباد کے احوال تحریر نہ کرسکے، اور یہ مضمون جتنا شائع ہوا تھا پیش کردیا گیا۔)

(ماہنامہ ''البلاغ'' جولائی، اگست ۱۹۷۵ء)

☆☆☆☆☆☆☆

مہاراشٹر سے شوراشٹر تک

ایک علمی وتاریخی سفر (جون ۱۹۷۹ء)

بہت دنوں سے کاٹھیاوار اور شوراشٹر کے علمی وتاریخی سفر کی بات چیت چل رہی تھی، مگر کل امر مرھون باوقاتہ یعنی ہر کام اپنے وقت کا رہن ہوتا ہے اور جب وقت آتا ہے تو ہوتا ہے، چنانچہ یہ کام بھی اپنے وقت پر ہوا، محترم الحاج ابراہیم موتی والا صاحب بہت دنوں سے اصرار کررہے تھے کہ میں ان کے وطن دھوراجی جاؤں اور اسی سفر میں جوناگڈھ وغیرہ بھی دیکھوں، مگر اس کا موقع اس وقت آیا جب ان کے چھوٹے صاحبزادے محمد جمیل کی شادی ۸۔ جون کو ہوئی، اور اس بہانہ سے یہ سفر ہوا، جمعرات ۱۹؍ربیع الاول ۵؍جون کو صبح ۶۔ بجے شوراشٹرا ایکسپریس سے روانگی ہوئی، اور براہ دیرم گام ۶۔ جون کی صبح کو ۹۔ بجے دھوراجی پہونچا اور اسی راستہ سے سہ شنبہ ۲۴؍ربیع الاول ۱۰؍جون کو واپسی ہوئی۔

دھوراجی سرکاری انتظام کی رو سے صوبہ گجرات کا حصہ ہے، مگر علاقائی تقسیم کے اعتبار سے کاٹھیاوار میں شامل ہے، جس سے متصل ہی شوراشٹر کا ساحلی علاقہ واقع ہے، اور مانڈل، جوناگڈھ، سومناتھ، جام نگر، پوربندر، راج کوٹ، مہسانہ، ویراول، بھاؤنگر، منگرور وغیرہ اس میں شامل ہیں، کاٹھیاوار جزیرہ نما ہے جو ہندستان کے مغربی ساحل پر واقع ہے، شمال، جنوب اور مغرب تینوں طرف پانی سے گھرا ہوا ہے، شمال میں کچھ کا ریگستان اور خلیج کچھ، جنوب اور مغرب میں بحر عرب اور مشرق میں خلیج کھمبائت اور گجرات خاص کے ضلع احمد آباد کا حصہ واقع ہے، کاٹھیاوار ہمیشہ سے

راجوں اور نوابوں کا مرکز رہا ہے، اور چھوٹی ریاستیں جگہ جگہ قائم رہا کی ہیں، انگریزوں نے یہاں کی ریاستوں کو سات درجوں میں تقسیم کر کے ان کے درجات ومراتب قائم کیے تھے، یہاں کل بائیس ہندوریاستیں تھیں۔

دوسری صدی ہجری میں کاٹھیاوار کے بعض علاقوں پر عرب مسلمانوں کا عمل دخل ہو گیا تھا مگر چونکہ مقامات کے نام بگڑے ہوئے ہیں اس لئے صریحی طور سے اس کا پتہ نہیں چلتا، مانڈل بڑودھ اور بعض دوسرے مقامات کے نام عربی تاریخوں میں ملتے ہیں جہاں عرب فاتح آئے اور سندھ کے عباسی حاکم ہشام بن عمر جہازوں کا بیڑا لیکر بڑودھ کے کنارے آئے تھے، مرأت مصطفیٰ آباد (تاریخ جوناگڈھ) میں ہے کہ سلطان محمود غزنوی سے پہلے کسی مسلمان سردار کا ملک کاٹھیاوار پر چڑھائی کرنا مشہور نہیں ہے، مگر محمد شفیع اللہ شاہ صاحب سیاح نے گھوگھ کے ایک عربی طغرا سے جو سنگ مرمر پر کندہ ہے، لکھا ہے کہ ۵ ھ اسماعیل نامی سپہ سالار لشکر جرار لیکر گھوگھ پر اترا اور وہاں ہندوراجہ سے سخت لڑائی ہوئی، طرفین سے بہت آدمی مارے گئے، سپہ سالار موصوف اور اس کے ساتھ سردار یعقوب مدنی وغیرہ بھی شہید ہو گئے، گھوگھ کا نام شامی لکھا ہے، کندہ کی تحریر اب پڑھی نہیں جا سکتی مگر اس کا سِیَر کی کتب عربیہ میں پتہ مل سکتا ہے (حاشیہ مرأت مصطفیٰ آباد صفحہ ۴۹، ۵۰) اور تاریخ سندھ میں ہے کہ نوساری میں پول کیشی عہد کا کتبہ برآمد ہوا ہے، جس میں درج ہے کہ عرب لشکر نے سندھ، کچھ، سورسٹھ، چاوڑا، موریا (مارواڑ) اور بھیلمان کو پریشان وحیران کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ سندھ اور گجرات میں مسلمان فاتحوں اور مجاہدوں کی آمد پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ہوئی، اور ان دونوں کے کاٹھیاوار اور شوراشٹر کے ساحلی علاقوں میں وہاسی دور میں آئے جیسا کہ ان تحریروں اور کتبوں سے معلوم ہوا ہے اور سلطان محمود غزنوی سے پہلے کی چار صدیاں مسلمانوں سے خالی نہیں رہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے سومناتھ پر مسلسل حملوں کی وجہ سے اس کی اہمیت ان کے مقابلہ میں نہیں رہی اور سب سے اہم واقعہ اسی کو قرار دیکر پہلے کے تمام واقعات کو نظر انداز کر دیا گیا، ورنہ غزنوی فتوحات سے پہلے ان علاقوں میں اسلامی فتوحات ہوئی ہیں، چنانچہ تیسری صدی ہجری میں بمبئی کے قریب دولت ماہانہ سندان (سنجان) کے دوسرے حکمراں نے پالی تھانہ تک کو فتح کیا تھا جو علاقہ جونا گڈھ میں ایک پہاڑی مقام ہے اور جہاں ایک مندر ہے، اس زمانہ میں پالی تھانہ بحری ڈاکوؤں کا اڈہ تھا اور اس مرکز سے یہ لوگ سندھ اور گجرات میں آنے والے تجارتی جہازوں کو لوٹتے تھے جن کو عربی میں ''مید'' کہتے ہیں، عربی جغرافیہ کی کتابوں میں اس علاقہ کو بھی بحری ڈاکوؤں کا علاقہ بتایا گیا ہے، یہ تمام علاقہ ساحلی جنگلوں، جھاڑیوں اور پہاڑیوں سے معمور ہے اور ان میں جرائم پیشہ اور قبائلی زندگی بسر کرنے والے لوگ رہتے تھے، بلکہ اب بھی یہ صورت حال باقی ہے اور ان علاقوں کے قبائلی اپنے راجوں اور نوابوں کے خلاف قتل وغارت کے لئے صف آرا ہو جاتے تھے، چنانچہ جونا گڈھ اور دوسری ریاستوں میں ان ڈاکوؤں سے مقابلہ رہا کرتا تھا یہی وہ علاقہ ہے جس میں سومناتھ واقع ہے جو ہندو عقیدہ کی رو سے چاند دیوتا کا مندر ہے اور جسے سلطان محمود غزنوی کے حملوں نے عالمی اور تاریخی حیثیت دے دی ہے ورنہ دوسرے مندروں اور استھانوں کی طرح یہ بھی ایک قدیم مندر اور استھان تھا، محمود نہ ہوتا تو اسے وہ شہرت ومقام حاصل نہ ہوتا جو حاصل ہے۔

دھوراجی ویرم گام اور پور بندر کے درمیان مشہور شہر ہے جو پہلے مانڈل کے راجہ کے علاقہ میں تھا، شہر صاف ستھرا ہے سڑکیں کشادہ اور مکانات لمبے چوڑے اور خوبصورت ہیں، شہر کی مجموعی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ ہوگی، مسلمان اکیاون فیصدی ہیں یہ شہر مسلمانوں میں میمن برادری کا گویا مرکز ہے اور یہاں کے میمن تاجر

دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں یہاں ہر میمن لاکھ پتی سے کم نہیں معلوم ہوتا، علی حزیں نے بنارس کے بارے میں کہا تھا۔

''ہر برہمن پسر لچھمن ورام است اینجا''

بالکل اسی طرح یہاں ہر میمن دولت مند معلوم ہوتا ہے، چونکہ عام طور سے یہاں کے لاکھ پتی اور کروڑ پتی سیدھے سادے لباس میں ہوتے ہیں، اسی لئے انکو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کی حیثیت کیا ہے؟ ان تاجروں کے محلے عموماً خاموش اور سنسان ہوتے ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر و بیشتر بال بچوں سمیت ہندوستان کے کسی شہر یا دنیا کے کسی ملک میں رہتے ہیں اور کسی موقع سے آتے جاتے ہیں، شہر میں ۳۴ مسجدیں ہیں، مسلمانوں کے طرح طرح کے ادارے ہیں مدرسہ رونق اسلام، مدرسہ احمدیہ، مدرسہ حاجی جمال، مسلم مڈل اسکول، یتیم خانہ اسلامیہ، دارالیتامیٰ، مسلم بورڈنگ ہاؤس، مسلم گیسٹ ہاؤس، اور دو زنانے اسپتال ہیں، جانو حسن اسپتال اور ایک اور اسپتال، یتیم لڑکوں کے لئے یتیم خانہ اسلامیہ ہے، جس میں یتیم لڑکوں کی تعلیم اور خورد و نوش اور قیام و طعام کا انتظام مفت ہوتا ہے، دارالیتامیٰ یتیم لڑکیوں کیلئے ہے جہاں ان کے لئے تعلیم، قیام، طعام کا پورا پورا انتظام ہے، اور ساتھ ہی دست کاری سکھائی جاتی ہے، جب کسی یتیم لڑکی کی شادی کی جاتی ہے تو دارالیتامیٰ کے سرپرست حضرات کی طرف سے ہر قسم کا انتظام کیا جاتا ہے اور جہیز میں ضروری سامان کے علاوہ ایک ہزار کی رقم نقد دی جاتی ہے، یہ تمام ادارے یہاں مخیّر تاجروں کی طرف سے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ ان میں کوئی مسلم کالج نظر نہیں آیا جہاں اونچی تعلیم ہوتی ہو، اسی طرح دینی اور اسلامی تعلیم کا کوئی بڑا مدرسہ نہیں ہے جس میں عربی کی اونچی تعلیم ہوتی ہو، یہاں کے لوگ عموماً اصطلاحی ''سنی'' ہیں یعنی وہابی کے مقابلہ میں سنی ہیں جن کی سنیت نیاز، فاتحہ، میلاد اور قیام کے مجموعہ کا نام ہے، جن جن لوگوں سے میری

ملاقات ہوئی تقریباً سب ہی نے سب سے پہلے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو اور کہاں تعلیم پائی ہے اور جب معلوم ہوتا کہ میں مبارکپور ضلع اعظم گڈھ کا رہنے والا ہوں تو خوش ہوتے کیونکہ وہاں کے کئی جاہل مولوی دھوراجی وغیرہ میں آتے جاتے ہیں اور خوب اینٹھتے ہیں، مگر جب معلوم ہوتا کہ میرا علمی تعلق دوسرے علمی طبقہ سے ہے تو فوراً ایک خاص ذہن ومزاج کی روشنی میں بات کرنے لگتے۔

محترم الحاج ابراہیم مجھے اپنے ساتھ جونا گڈھ، مانگرور، سومناتھ، بھاؤنگر وغیرہ کی تاریخی سیر وسیاحت کرانا چاہتے تھے مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے صرف جونا گڈھ کا سفر ہوسکا، ہم لوگ ۹؍جون کی دوپہر میں موٹر کے ذریعہ جونا گڈھ پہونچے جو دھوراجی سے جانب شمال چند میل پر گرنار پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، یہ شہر تاریخی ہے اور ایک زمانہ تک اسلامی روایات اور مسلم اقتدار کا مرکز رہ چکا ہے، نوابان جونا گڈھ نے یہاں اپنے آثار وعلائم چھوڑے ہیں، شہر کے گرد شہر پناہ اب تک موجود ہے، بعض بعض جگہ سے توڑ دی گئی ہے اور باہر دور تک نئی آبادی ہوگئی ہے، شہر کے کل آٹھ دروازے ہیں، ساتویں دروازے کا نام دھارا گڈھ ہے، اس کے قریب بارہ شہیدوں کا مزار ہے، اسی کے قریب مائی گھڑیچی ایک جگہ ہے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسے ساتویں صدی (۶۸۵ھ) میں عفیف الدین ابوالقاسم بن علی ایرجی نے بنوایا ہے، یہ شخص حاجیوں کے جہاز کا ناخدا اور منتظم اعلیٰ معلوم ہوتا ہے، اس مسجد میں یہ عبارت کندہ ہے، **''امر ببناء هذا المسجد المبار الصدر المفضل المعظم المنعم المؤيد المكرم ملاذ الصدور والنواخيذ عماد حجاج الحرمين عفيف الدنيا والدين ابو القاسم بن علی الایرجی راجیاً من الله رضوانه تقبل الله منه وغفر له ولوالديه فی سنة خمس وثمانين وستمائة''**

شہر جونا گڈھ کا اسلامی نام مصطفیٰ آباد ہے، شیخ غلام احمد بن شیخ غلام محمد نے

مرأت مصطفیٰ آباد کے نام سے جوناگڈھ کی نہایت مفصل تاریخ لکھی ہے، جس میں پرانوں کے دور سے لیکر ۱۳۵۰ھ تک کے حالات درج ہیں، خاص طور سے نوابان جوناگڈھ کی تاریخ بہت مفصل ہے، اور بڑے سائز پر نہایت عمدہ کاغذ اور اعلیٰ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

جوناگڈھ کی کل آبادی ایک لاکھ ہوگی جس میں شاید دس ہزار مسلمان ہوں، مسلمانوں کا معاشی ودینی حال ابتر ہے، افسوس کہ یہاں کے نوابوں نے ان کی طرف توجہ بہت کم کی اور عیش وعشرت میں رہ کر سب کچھ کھودیا، نہ خود فائدہ اٹھا سکے اور نہ اپنے لوگوں کو فائدہ پہونچایا یہ حال تقریباً ہندوستان کی تمام مسلم ریاستوں کا رہا۔

ہم لوگ سب سے پہلے یہاں کی جامع مسجد میں پہونچے اور ظہر کی نماز ادا کی گئی، یہ عظیم الشان جامع مسجد ۱۳۱۱ھ میں بنی ہے، نہایت کشادہ اور خوبصورت ہے اندر ستونوں کی کثرت ہے اوپر گنبدوں کی قطار ہے، اس کا طرز تعمیر غالباً کاٹھیاواری ہوگا، مگر اسے دیکھتے ہی مجھے مسلمانوں کا اندلسی طرز تعمیر یاد آیا اور معلوم ہوا کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے قرطبہ یا غرناطہ کی کسی مسجد میں آگئے ہیں، اس کا احاطہ بہت وسیع ہے، اتر جانب نوابوں اور وزیروں کی قبریں ہیں، نوابوں کی قبریں ایک گنبدی مقبرے کے اندر ہیں اور وزیروں کی اسی طرح دوسرے مقبرے میں ہیں، معلوم ہوا کہ نواب جوناگڈھ کی طرف سے جامع مسجد وغیرہ پر دو گاؤں وقف تھے جن کی آمدنی سے ان کا کام چلایا جاتا تھا، مگر حکومت گجرات نے ان اوقاف کو حیلہ بہانہ سے چھین لیا ہے، اور سالانہ کچھ رقم مقرر کردی ہے، جو ظاہر ہے کہ راجوں اور نوابوں کے صرف خاص اور الاؤنس کی طرح کچھ دنوں میں ختم کردی جائے گی، جامع مسجد کے امام وخطیب مولانا حسین احمد میاں صاحب نوابی دور سے ہیں، نہایت بااخلاق اور صحیح العقیدہ بزرگ ہیں ان کی تحویل میں دو نہایت گراں قدر تحفے ہیں، ایک قلمی قرآن مجید ہے

جسے نواب صاحب نے جامع مسجد کو دیدیا تھا، یہ قرآن مجید فن خطاطی ونقاشی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، سبحان اللہ! خط یاقوتی میں رنگ برنگ کی روشنائی سے جلی اور خفی حروف میں خاص اہتمام کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، بس جی چاہتا ہے کہ دیکھتے ہی رہیے، نہ دل کو سیر ہوتی ہے نہ آنکھوں کی تشنگی بجھتی ہے، اس حسین وجمیل قرآن کے لکھنے والے بزرگ خطاط کی بے نفسی اور گمنامی کا یہ عالم ہے کہ نہ کہیں کاتب کا نام ہے اور نہ سن کتابت درج ہے، اگر اس قرآن کریم کو بلاک فوٹو آفسیٹ کے ذریعہ چھاپا جائے تو عالم اسلام کے لئے بہترین تحفہ ہوگا۔

دوسرا تحفہ ایک دعاء ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کی تحریر بتائی جاتی ہے یہ تحریر نہایت عمدہ عربی خط میں اور بعد میں دوسرے خط میں آپ کا نام بطور کاتب کے درج ہے، مگر اس کا خط اور اس کے حروف کی شان کتابت پانچویں صدی کی بالکل نہیں ہے بلکہ بہت بعد میں ایسا نستعلیق عربی خط لکھا گیا ہے، اس لئے اس تحریر کو حضرت جیلانی کے دست مبارک کی طرف منسوب کرنا محل نظر ہے، ویسے اس کے بارے میں زمانۂ حال کے کئی علماء کی دستخطیں الگ کاغذ پر ہیں کہ یہ تحریر شیخ عبدالقادر کی ہے، مگر اس کی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی اور قرائن سے یہ نسبت صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے، ویسے یہ تحریر بہرحال متبرک ومقدس ہے۔

جامع مسجد کے پاس مدرسہ مہابت کسی زمانہ میں اسلامی اور دینی علوم وفنون کا مرکز تھا، اور اس میں علماء وفضلاء درس دیتے تھے، آج اس کی شاندار عمارت میں کوئی ہندی یا گجراتی اسکول ہے، یہی حال بہاء الدین کالج کا ہے کہ وہ نوابی دور میں بڑا پرشکوہ تعلیمی ادارہ تھا اس کی عمارتوں سے بڑی شان ظاہر ہوتی تھی آج وہ بھی کہنے کو تعلیمی ادارہ ہے مگر نہایت معمولی طور پر ہے۔

نوابان جونا گڈھ کے محلات اب سرکاری دفاتر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں،

ان کے قصور و باغات سے ویرانی و تباہی آشکارا ہے، گرنار پہاڑ کے دامن میں محکمہ آب رسانی اور باغ عام ہے، اوپر اور نیچے میرن داتار کا چلہ بتایا جاتا ہے، ویسے چلہ ،قبر اور مزاران اطراف میں عام ہے مذہب میں داخل ہے شہر جونا گڈھ اپنے تمام محاسن و مفاخر سے خالی ہوتا جارہا ہے، جانوروں کے عجائب گھر میں یہاں کے شیر ببر اب بھی ہیں جن میں اکثر جونا گڈھ کے گرنار پہاڑیا پالن پور وغیرہ سے پکڑے گئے ہیں، وقت کی کمی کی وجہ سے جونا گڈھ کے مزید تاریخی آثار نہ دیکھے جا سکے۔

قیام دھوراجی کے ایام میں میرا زیادہ وقت محترم الحاج کے ذاتی کتب خانہ میں گذرا، موصوف ہمارے قصبہ کے ایک عالم مولانا محمد اسماعیل اصلاحی مبارکپوری مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، مولانا مرحوم نے رنگون اور دھوراجی میں رہ کر مدتوں دینی تعلیم دی ہے، ان کی تعلیم و تربیت نے الحاج کے مزاج کو علمی بنا دیا ہے، وہ بچپن سے دار المصنفین اعظم گڈھ کی مطبوعات اور رسالہ معارف کے خریدار ہیں، تاریخ وادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں، ان کا ایک ذاتی کتبخانہ ہے جس میں عربی ، فارسی اور گجراتی و انگریزی کی اچھی اچھی کتابیں، عربی، فارسی اور سندھی کی قلمی کتابوں کا بھی ذخیرہ ہے جو نوادرات پر مشتمل ہے، میں چار روزہ قیام میں اس کتب خانہ سے فیض یاب ہوتا رہا، انھوں نے اپنے ایک دوست سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ کراچی میں مولانا عبدالعزیز میمنی راج کوٹی نے ایک علمی مجلس میں فرمایا کہ ہندوستان میں عربی زبان کے دو عالم اور مصنف آج کل خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اس وقت سے میں نے قاضی صاحب سے علمی ربط پیدا کرنا شروع کیا اور آپ آج میرے وطن میں آئے ہوئے ہیں پھر چونکہ میرے استاذ ایک مبارکپوری بزرگ ہیں اس لئے قاضی صاحب سے اور بھی ربط قائم ہوگیا۔

مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ **ابوالعلا المعری وما الیه** کے مصنف، ابوعلی قالی بغدادی کی کتاب الامالی کے محشی وشارح اور عربی زبان وادب کے عالمی عالم ومشہور ہونے کی وجہ سے عرب ممالک اور مستشرقین یورپ تک میں علمی وتحقیقی شہرت کے مالک ہیں، اور پاکستان کے ادارہ تحقیقات علمیہ کے صدر ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پران سے اپنی پہلی ملاقات کا مختصر تذکرہ کردوں، غالبا ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ صابوصدیق انسٹی ٹیوٹ شیفر روڈ بمبئی میں آج شام کو عربی شاعری اور فارسی ایرانی کے موضوع پر مولانا موصوف ایک مجلس مذاکرہ میں گفتگو کریں گے، میں دیر سے پہونچا، ہال ٹیچروں، پروفیسروں اور جدید تعلیمیافتہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور مولانا اپنے خاص انداز میں باتیں کر رہے تھے، جگہ نہ ہونے کی وجہ سے میں ایک کونے میں میز ہی پر بیٹھ گیا، مجھے تنہا دیکھ کر انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل جناب شہاب الدین دسنوی صاحب بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے، اور جب مجلس مذاکرہ ختم ہوئی تو موصوف نے مولانا سے میرا تعارف کرایا مولانا نام سنتے ہی لپٹ گئے اور نہایت شفقت اور ہمت افزائی کے انداز میں فرمایا کہ ارے بھائی میں نے آپ کی کتاب ''رجال السند والہند'' اور مقالہ ''دولت ماہانہ سندان'' پڑھا ہے، ماشاء اللہ خوب خوب داد تحقیق دی ہے اور بڑا کام کیا ہے، پھر اس کے بعد ہاتھ پکڑے ہوئے باتیں کرتے رہے، آگے پیچھے جدید تعلیم یافتہ ادباء ومحققین مولانا سے گفتگو کرنا چاہتے تھے مگر مولانا کی دلچسپی نے ان کو دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں دی، چلتے چلاتے کہا کہ آفندی صاحب راشنگ آفیسر کے یہاں مقیم ہوں آپ وہاں ضرور آئیے، اس کے بعد دو تین دن تک مولانا وہاں رہے اور میں برابر آتا جاتا رہا، اسی زمانہ میں قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر والتحف

کویت سے نئی نئی طبع ہو کر میرے پاس آئی تھی، جب اس کا تذکرہ نکلا تو اشتیاق ظاہر کیا، میں نے کتاب دی تو ایک رات میں دیکھ کر واپس کر دیا اور اس پر بہترین تبصرہ بھی فرمایا، کراچی واپس ہوتے ہوئے اپنا پتہ دیا اور تاکید کی کہ خط و کتابت کرتے رہنا، یہ بڑوں کی شفقت اور اپنے چھوٹوں کو نوازنے کی بات ہے، ورنہ ہم طالب علم ان حضرات کے سامنے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

یہاں کے دورانِ قیام میں کئی خاص حضرات سے ملاقات رہی، جس میں بیرسٹر محمد یوسف قریشی احمد آباد اور جناب عبداللہ جونا گڈھ والے خاص طور سے قابل ذکر ہیں، موصوف نے بتایا کہ ہم آپ کو قیامِ برما کے زمانہ سے جانتے ہیں اور وہاں اردو اخبارات میں آپ کے علمی اور دینی مضامین پڑھ چکے ہیں، خاص طور سے رنگون کے روزنامہ ''استقلال'' اور روزنامہ ''دورِ جدید'' میں آپ کے مضامین بکثرت شائع ہوتے تھے اور وہاں کا علمی و دینی طبقہ ان سے مستفیض ہوتا تھا۔

دھوراجی مالداروں کا شہر ہے، جہاں رسم و رواج کو اہمیت حاصل ہے، پھر شادی بیاہ کے موقع پر دولت و ثروت کا مظاہرہ اور اپنی شان کی نمائش تو معمولی آدمی بھی کرنا چاہتا ہے، مگر یہاں کے رسم و رواج کے علی الرغم الحاج کے یہاں شادی بڑی سادگی کے ساتھ ہوئی، لڑکی والے جناب احمد ولی محمد پٹیل بھی ایسے ہی سیدھے سادے تھے ان کے یہاں بھی کوئی بیجا نمائش نہیں تھی، ۲۲؍ربیع الاول (۸ جون) اتوار کو پہلے سے اعلان کے مطابق دس بجے دن میں لوگ جامع مسجد میں جمع ہو گئے، راقم نے اسلامی شادی کے موضوع پر تقریر کی اس کے بعد میں نے ہی جناب محمد جمیل کا نکاح بلقیس بی کے ساتھ کر دیا، مہر صرف پچیس روپیہ رکھی گئی، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس کی نکاح کی مہر جتنی کم ہوگی اس میں اتنی خیر و برکت آئے گی، غالباً دھوراجی کے لاکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں میں یہ پہلی شادی تھی جو اتنی سادگی سے ہوئی اس کے باوجود

مجمع بہت زیادہ تھا، انشاء اللہ یہ سادگی دوسروں کیلئے عبرت کا باعث ہوگی اب دوسری شادیاں بھی سادگی کے ساتھ ہوں گی، جب کسی کام کی ابتداء کی جاتی ہے تو لوگ اپنے اپنے رنگ میں خوب خوب تنقید کرتے ہیں مگر بعد میں اس کی افادیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

میرے دھوراجی کے دوران قیام میں شادی بیاہ کی مصروفیات کے باوجود محترم الحاج ابراہیم صاحب اوران کے صاحبزادوں نے مہمان نوازی اور خاطرداری میں کوئی کسر نہیں اٹھارکھی، اور میں نے ان دنوں میں گھر جیسا لطف پایا۔

(ماہنامہ ''البلاغ'' اگست ۱۹۷۹ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆

افریقہ اور عرب ممالک کے تین سفروں کی روداد

(۱) سفر حرمین براہ مسقط و بحرین
(۲) ینبع کا تعلیمی و تبلیغی سفر
(۳) سفریاتِ مغربی افریقہ

از: مولانا خالد کمالؒ ابن مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

مولانا خالد کمال صاحب، قاضی صاحب کے سب سے بڑے فرزند تھے، یکم ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو مبارکپور میں پیدا ہوئے، نہایت ذہین وفطین تھے، ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کی، اور دو سال کیلئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، جہاں سے دورۂ حدیث پڑھ کر ۱۹۵۸ء میں سند فراغت حاصل کی۔ اور چند سال تک قاضی صاحب کے قائم کردہ ادارہ مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مدینہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو ۱۹۶۲ء میں اس میں داخلہ لیا، اور ۱۹۶۷ء میں فراغت حاصل کی۔ اسی سال حکومت سعودیہ کی طرف اشاعت دین کیلئے مبعوث ہوکر گھانا مغربی افریقہ بھیجے گئے، جہاں چودہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر حکومت سعودی نے ۱۹۸۱ء میں انھیں نیوزی لینڈ بھیجا جہاں وہ اپنی وفات (۶ر دسمبر ۱۹۹۹ء) تک مقیم رہے۔

اپریل ۱۹۹۹ء کے قریب برین ہیمرج کا حملہ ہوا جس میں سات آٹھ ماہ مبتلا رہے حالانکہ آپریشن بھی ہوا مگر وقت موعود کو کون ٹال سکتا ہے، بالآخر اسی مرض میں ۶ر دسمبر ۱۹۹۹ء اور ہندوستانی تاریخ کے مطابق ۵ر دسمبر چھ بجے شام کو انتقال فرمایا۔ وہیں نیوزی لینڈ میں تدفین عمل میں آئی۔

سفر حرمین براہ مسقط و بحرین

الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ سرزمین حجاز کا تیسرا سفر نصیب ہوا، اس نعمت عظمیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے، جامعہ کھلنے کی تاریخ اور صدیق عزیزی خالد شاکر عمری کے خطوط کی روشنی میں سابقہ پروگرام ہی کو بحال رکھ کر ساتھیوں کو روانگی کی تاریخ سے مطلع کر دیا گیا اور طے ہوا کہ ۱۳؍ دسمبر یکشنبہ کو بمبئی پہونچ جایا جائے تا کہ دوشنبہ سے ریزروبنک ٹکٹ اور بحرین کے ویزا وغیرہ کا کام شروع کر دیا جائے، چنانچہ ۱۱؍ستمبر (۱۹۶۴ء) مطابق ۴؍ جمادی الاولیٰ جمعہ کو گھر چھوڑنے کی تاریخ معین ہوگئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

۱۱/۹/۶۴ء جمعہ :۔

صبح ہی سے نہانے دھونے اور سامان سفر درست کرنے کی مصروفیت رہی اسی کے ساتھ ساتھ ملاقات اور مخلصین کی آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری رہا، جمعہ کی نماز کے بعد استاذ مکرم مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارکپوری صدر مدرس مدرسہ سراج العلوم دھولیہ کے دولت کدہ پر حاضر ہوکر دعوت کھائی اور فوراً ہی واپس آ کر الوداع کہنے والے مخلصین و محبین کے ساتھ حرمین شریفین کی گفتگو میں شریک ہوگیا، تقریباً تین بجے برادر عزیز الحاج ظفر مسعود کی معیت میں گھر والوں کو خدا حافظ کہا، چونکہ برادر عزیز گذشتہ تین سالوں سے اپنڈیکس کے شدید درد میں مبتلا تھے جس کا دورہ اب کے حج کو جاتے ہوئے جہاز میں شروع ہوگیا تھا اور آنے کے بعد بھی مہینوں تک پریشان کئے رہا طے ہوا کہ بمبئی لے جا کر ان کا آپریشن کرا دیا جائے جو غالباً اس موذی مرض کا آخری علاج اور کامیاب علاج ہے، اس لئے گھر کے ہر فرد پر ایک خاص تاثر تھا

جس کا اندازہ بھیگی پلکوں سے بھی کیا جاسکتا تھا، برادر عزیز ترحسان احمد بھی شدید بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود جم غفیر کے ساتھ ارجنٹی تک آئے جہاں سے ہم یکہ پر سوار ہوکر اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئے، دوست احباب اور مخلصین ومحبین کی ایک جماعت بھی تانگہ اور سائیکل سے اسٹیشن تک ساتھ آئی، تین میل کا یہ راستہ سڑک خراب ہونے کے سبب ایک گھنٹہ میں طے ہوا، اسٹیشن پر عصر کی نماز باجماعت ادا کرکے ۵؍بجے گاڑی پر سوار ہوئے الوداع کرنے والوں کو خداحافظ کہہ کر مئو کے لئے روانہ ہوئے، مئو میں مغرب کی نماز پڑھی اور کھانا کھا کر بنارس جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے کوئی آٹھ بجے گاڑی آئی اور اپنے دیار کو سلام کرتے ہوئے بنارس روانہ ہوگئے، تین گھنٹہ کا یہ راستہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے طے ہوگیا، بعض سامان اسٹیشن کے لگیج روم میں رکھا گیا اور بعض ہلکے پھلکے سامان لیکر اپنے ایک نہایت مہربان اور مشفق ترین بزرگ مولانا اسحاق صاحب بنارسی کے یہاں چلے گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

۱۲؍۹؍۶۴ء شنبہ

صبح سویرے ناشتہ سے فارغ ہوکر بنارس کی متعارف شخصیتوں سے ملاقات کا پروگرام بنایا، ترتیب اور قربت کے اعتبار سے پہلے حاجی عبدالعزیز صاحب پیلی کوٹھی کے یہاں پہونچے، حاجی صاحب ہم لوگوں کے لئے سبھی کچھ ہیں مشفق، مہربان، ہمدرد اور مخلص ترین بزرگ، وہ کہیں جانے کے لئے موٹر میں سوار ہورہے تھے انھوں نے دیکھتے ہی بڑی بے تکلفی سے کہا آؤ بیٹھ جاؤ، موٹر چل پڑا اور پرسش احوال کا سلسلہ جاری ہوگیا انھوں نے بازار میں ایک جگہ اتر کر ہماری خواہش کے مطابق جلد ہی واپسی کا وعدہ لیکر مدنپورہ بھجوادیا جہاں ہمیں بعض حضرات سے ملنا تھا، مدرسہ اسلامیہ مدنپورہ سے میں نے عالم کا امتحان دیا تھا اس لئے وہاں حاضری کے

لئے گیا تو حضرت مولانا ادریس صاحب اعظمی مدظلہ سے ملاقات ہوگئی جن سے کورس کی بعض کتابیں پڑھی تھیں، دوسرے استاذ مولانا رفیق صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ یہاں نہیں ہیں، اسی زمانہ کے ایک دوست نما بزرگ یوسف شیر جنگ صاحب سے بھی داخل ہوتے ہی ملاقات ہوگئی معذرت کے باوجود ان کے تکلف کا شکار ہوکر مدرسہ رحمانیہ پہونچے، مولانا ادریس رحمانی مبارکپوری صاحب سے ملاقات کرکے اپنے مخلص ساتھی مولانا ہلال احمد مبارکپوری کا پتہ معلوم کیا جواب کے سعودی حکومت کے خرچہ پر ہندوستان آئے تھے چونکہ ان کا دوبارہ جانا بھی سرکاری ہی سطح پر تھا اس لئے انھوں نے اس سفر میں ساتھ نہ ہونے کا افسوس کرتے ہوئے رخصت کیا، ملاقاتی سلسلہ دراز ہوجانے کے سبب وقت میں تنگی محسوس ہونے لگی لہذا فوراً ہی رکشا کرکے حاجی صاحب موصوف کے یہاں پہونچے حاجی صاحب انتظار فرمارہے تھے، چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر ہم نے حاجی صاحب سے اجازت چاہی تو انھوں نے اخلاص کا پھندا پھینکتے ہوئے پوچھا کیا ٹکٹ خریدنا ہے؟ ہم نے بتلایا کہ سلیپر کا ٹکٹ مولانا اسحاق صاحب نے پہلے ہی سے لے رکھا ہے فرمایا پھر تو کافی وقت ہے گاڑی ایک بجے چھوٹتی ہے اور ابھی گیارہ بجے ہیں، اب ہماری گردن میں ان کے خلوص ومحبت کے ریشمی پھندے پڑ گئے، مختلف قسم کی باتیں خاص کر حرمین وحجاز اور سعودی عرب سے متعلق ہوتی رہیں، بارہ بجے کے قریب انھوں نے اپنا موٹر نکلوایا مولانا کے یہاں سے سامان اور زادسفر لیا گیا اور ان کے والد محترم حضرت مولانا مفتی محمد ابراھیم صاحب خطیب گیان باپی مسجد بنارس (جواب عمر کے آخری ایام گذار رہے ہیں لیکن علم وتحقیق کی چمک اور زہد وتقویٰ کی دولت کے ساتھ) کی بابرکت دعاؤں کے ساتھ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے، اسٹیشن پہونچ کر اپنا سامان لیا گیا اور متعینہ سیٹ سنبھال لی گئی، حاجی صاحب اپنی گوناگوں مصروفیت اور کوئی خاص ضرورت نہ ہونے کے

باوجود گاڑی روانہ ہونے تک ہمارے ساتھ رہے غالباً ڈیڑھ بجے کاشی ایکسپریس نے روانگی کی سیٹی دی اور ہم آگے بڑھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۱۳ء یکشنبہ

دوپہر بعد بھساول کے آگے ٹی ٹی نے آکر ٹکٹ کے ساتھ سامان بھی چیک کیا، بارہ کلو سامان زائد نکلا جسے پانچ روپیہ دیکر رسید حاصل کرلی گئی، شام کے وقت ناسک آیا جہاں سے مہاراشٹر کے قدرتی مناظر کا نظارہ بڑا دلکش ہوا کرتا ہے پہاڑ، دریا اور ہرے بھرے جنگلات کا سلسلہ بمبئی جانے والے کو تھوڑی دیر کے لئے سوچنے پر مجبور کردیتا ہے کہ وہ عروس البلاد بمبئی جارہا ہے یا کسی پہاڑی مہم پر جوں جوں بمبئی قریب آتی ہے یہ دلکش مناظر وحشتناک شکل اختیار کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ اگت پوری کے بعد جب گاڑیاں پہاڑوں میں گھسنی شروع ہوجاتی ہیں تو وحشتناکی شباب پر ہوجاتی ہے لیکن انھیں تاریک غاروں سے جب جگمگاتا ہوا عروس البلاد نظر آنے لگتا ہے تو مسافر کو اطمینان کلی ہوجاتا ہے کہ بس وہ بمبئی پہونچ ہی رہا ہے۔

اتوار کا دن ہونے کے سبب بوری بندر اسٹیشن پر والد محترم کے علاوہ گاؤں گھر کے بھی بہت سے مخلصین ومحبین موجود تھے گاڑی نو بجے بمبئی پہونچی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹھیک وقت پر آئی ہے، کمرہ پر آکر معلوم ہوا کہ صدیق محترم مولانا امیر احمد رامپوری صبح ہی تشریف لا چکے ہیں البتہ دوسرے ساتھی ابھی تک نہیں پہونچے۔

☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۱۴ء دوشنبہ

صبح والد صاحب نے بتلایا کہ جناب الحاج مختار احمد صاحب جاوید کا مکہ مکرمہ سے بھیجا ہوا ڈرافٹ آگیا ہے یہ ڈرافٹ بحرین سے ظہران تک ہوائی جہاز

کے ٹکٹ کی خریداری کے لئے تقریباً ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر برطانوی قونصل خانہ بحرین کا ٹرانزٹ ویزا نہیں دیتا ہے، دس بجے میں مولانا امیر احمد کو لیکر بنک گیا جہاں سے ڈرافٹ توڑوا کر اس کی رسید لی جسے پی فارم کے ساتھ ریزرو بنک کو دینا پڑتا ہے، واپسی پر صاحب خدمت اور بمبئی کی روزمرہ کی زندگی کے بہترین مشیر الحاج محی الدین منیری صاحب ایڈیٹر البلاغ سے ملاقات کی آپ بھی جلد ہی وطن مالوف بھٹکل سے تشریف لائے، کھانا کھانے کے بعد مسافر خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا جمیل احمد قاسمی بہاری اور مولانا محمد لقمان سلفی بہاری صاحبان بھی تشریف لا چکے ہیں، شام کو ہمارا پورا گروپ والد محترم کی معیت میں ایک بے لوث مخلص بزرگ حاجی ریاست صاحب کی ملاقات کے لئے گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۱۵ء سہ شنبہ

والد محترم سے معلوم ہوا کہ ہمارے ایک نہایت ہی معزز و محترم بزرگ قادری صاحب (جنھیں آپ ایک شاعر کی حیثیت سے مہر مہسلائی کے نام سے جانتے ہونگے حال ہی میں ان کا دیوان ''نزہت دل'' کے نام سے شائع ہوا ہے) ہمارے بارے میں استفسار فرما رہے تھے، تقریباً ساڑھے نو بجے ان کی زیارت کے لئے گئے بڑے تپاک سے ملے اور فرمانے لگے میں ابھی تم لوگوں کی ملاقات کے لئے جانے ہی والا تھا، قادری صاحب بیسویں صدی کے قابل رشک مسلمان ہیں، وضع قطع اور افکار ونظریات میں خالص اسلامی رنگ کے ساتھ ساتھ دور جدید کے تقاضوں سے آشنائی کی مکمل تصویر بھی نظر آتے ہیں، دوران گفتگو صابو صدیق مسافر خانہ کا ذکر آ گیا اور اس مناسبت سے انھوں نے جو واقعہ سنایا سننے اور سر دھننے کے قابل ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے اور حاجی صابو صدیق کے ایمان و اتقان کی داد دیجئے، قادری صاحب نے فرمایا۔

صابوصدیق ایک نہایت ایماندار میمن تاجر تھا اس نے اپنی مختصر سی عمر میں وہ وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ سوچنا پڑتا ہے کہ اگر وہ زیادہ دنوں تک زندہ رہتا تو کیا کیا کرتا، اس مسافرخانہ کے علاوہ اس کی مساجد اور دوسرے بہت سے اوقاف موجود ہیں، ایک مرتبہ ان کے تجارتی جہاز کے ڈوبنے کی خبر موصول ہوئی جو مال سے لدا ہوا کہیں باہر سے آرہا تھا، جب ان کو خبر ہوئی تو انھوں نے بڑی شدت سے اس خبر کی تصدیق کرنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''ناممکن ہے کہ میرا جہاز ڈوب جائے کیونکہ میں اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کا پورا حق ادا کرتا ہوں اور ایک ایک پائی کی زکوٰۃ ادا کرتا ہوں ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ زکوٰۃ نکالتے وقت حساب کرنے میں کچھ فرق پڑ گیا ہو جس کی وجہ سے پوری زکوٰۃ نہ نکل سکی ہو، اتنا کہہ کر وہ اپنے منیجر کو لے کر حساب کرنے بیٹھ گئے اور صبح صادق کے وقت معلوم ہوا کہ ڈھائی یا تین ہزار روپیہ کی زکوٰۃ نہیں نکل سکی ہے، انھوں نے اسی وقت زکوٰۃ وصدقات کی تقسیم شروع کردی صبح ہوتے ہوتے دوسری خبر آئی کہ آپ کا جہاز صحیح سلامت بمبئی پہونچ رہا ہے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر واپسی کی اجازت ملی، واپسی میں معزز دوست حکیم سعود صاحب سے بھی ملاقات کے لئے گیا معلوم ہوا کہ وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ مدینہ منورہ پہونچ گئے ان کے بڑے بھائی محترم حکیم سعد صاحب ہی صرف مل سکے ان کے والد محترم جناب الحاج حکیم مسعود صاحب (حکیم اجمیری) سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا، اب کے سال انھوں نے حج کے سلسلہ میں قیام مدینہ منورہ کے دوران مجھ پر بڑی شفقت ومحبت کا مظاہرہ کیا تھا، وہ غالباً لوناوالہ تشریف لے گئے تھے، صبح کے ساڑھے دس ہورہے تھے، محترم الحاج احمد غریب صاحب سے ملاقات کا وقت ہوچکا تھا دوکان پر گئے ملاقات ہوئی پرسش احوال اور ہمارے سفر کا پروگرام موضوع رہا موصوف ہمارے سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں، قارئین

البلاغ اور حج وزیارت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے موصوف کی ذات کوئی نئی نہیں ہے بڑے بڑے اہم اور مشکل ملی واجتماعی کاموں کواپنی انتظامی اور تدبرانہ صلاحیت سے حل کرلینا موصوف کا شعار ہے۔

ڈھائی بجے ظہر پڑھ کر بھیمڑی کے لئے روانہ ہوئے، بھیمڑی کے مدرسہ مفتاح العلوم میں تین سال درس دینے اور مخلصین ومحبین کی ایک بڑی جماعت ہونے کے سبب آتے جاتے وہاں حاضری ضروری ہے، پھر چونکہ والد محترم ہی کی جدوجہد سے یہ مدرسہ قائم ہوا ہے اس لئے اس سے ایک خصوصی تعلق ہے، مولانا محمد عارف صاحب جہانا گنجی، مولانا افتخار احمد اعظمی، مولانا محمد امین صاحب مبارکپوری اور قاری عبدالرزاق صاحب بہاری کے نہ جانے کتنے لیل ونہار بیتے ہیں، رئیس ہائی اسکول بھیمڑی کی ششماہی مدرسی خاصی پر لطف رہی، تقریباً شام کے پانچ بجے ہندستانی مسجد پہونچے حسن اتفاق کہ مسجد ہی میں جناب الحاج یونس سیٹھ صاحب سے ملاقات ہوگئی ،موصوف بانی مدرسہ الحاج ولی اللہ مرحوم کے خلف رشید ہیں نیک اور صالح ہونے کے ساتھ ساتھ دینی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں، کہنے کو تو صرف مدرسہ کے خازن ہیں مگر سب کچھ وہی ہیں، عصر کی نماز پڑھ کر بھیمڑی کا اپنا پرانا معمول یاد آگیا اور مولوی عارف صاحب کو لیکر تفریح کے لئے نکل گئے، چونکہ مغرب کے فوراً بعد ہی لوٹنا تھا اس لئے رئیس ہائی اسکول کا رخ کیا گیا بعض قدیم وجدید اساتذہ سے ملاقات ہوئی، مغرب کی نماز ادا کرکے واپسی ہوئی اور حاجی صاحب موصوف کے یہاں کھانا شام کا کھایا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

۱۶/۹/۶۴ء چہار شنبہ

ناشتہ سے فارغ ہو کر باقی متعارفین کی ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، حاجی عبدالغنی رحیم اللہ ہمدرد مفتاح العلوم کچھ علیل تھے ان سے ملاقات نہ ہوسکی چونکہ

وقت زیادہ تھا اس لئے دوپہر کا کھانا کھا کر واپسی کے لئے سٹی اسٹینڈ آئے مدرسہ کے طلبہ واساتذہ بھی بس اسٹینڈ تک ساتھ آئے ،تقریباً بارہ بجے بھیمڑی سے چل کر تین بجے بمبئی پہونچے تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد عصر کی نماز پڑھی گئی اور شیخ عبدالعزیز عزت مبعوث ازہر سے ملاقات کے لئے سی فیس ہوٹل گئے موصوف ابھی جلد ہی بھیمڑی سے یہاں منتقل ہوئے ہیں، بھیمڑی کے دوران قیام ان سے اچھے راہ ورسم رہے عصر بعد سے عشاء تک وقت اکثر ان کی معیت میں صرف ہوتا تھا بلکہ شام کا کھانا بھی اکثر و بیشتر انھیں کے ساتھ کھایا کرتا تھا،موصوف نوجوان محنتی عالم ہیں،رئیس ہائی اسکول میں میری جگہ عربی پڑھانے پر مامور ہیں،گذشتہ سال چھٹیوں میں مصر گئے تو شادی کر کے اہلیہ کو بھی ساتھ لائے ،نظام آباد ضلع اعظم گڈھ کے مٹی کے برتن انھیں بے حد پسند ہیں کچھ برتن میں ان کے لئے ساتھ لیتا آیا تھا، ہدیہ کیا بہت خوش ہوئے دیر تک مختلف علمی موضوع پر والد صاحب سے بات چیت ہوتی رہی چونکہ مغرب کویت کے مدرسہ واقع چرچ گیٹ میں پڑھنے کا ارادہ تھا اس لئے ان سے رخصت ہو کر سیدھے کویت کے مدرسہ پہونچے یہاں شام کو بمبئی میں رہنے والے باذوق اہل علم وفضل عرب جمع ہوتے ہیں اور اخبارات وجرائد کا مطالعہ کرتے ہیں، وہیں پر ہمارے ایک عرب مخلص اور والد محترم کے عزیز دوست جناب احمد فرید یمانی سے ملاقات ہوئی ،احمد فرید صاحب کہنے کو تو ایک عرب تاجر ہیں مگر علمی ادبی اور سیاسی حیثیت سے کہنا چاہئے کہ پورے عرب ممالک کے ترجمان ہیں، انقلاب وغیرہ میں اکثر ان کے مضامین کے ترجمے شایع ہوتے رہتے ہیں، وقت نہ ہونے کے باوجود انھوں نے والد صاحب سے حکومت مصر کے نئے کونسلر سے ملاقات کے لئے وعدہ لے ہی لیا جس کے لئے دوسرے دن ڈیڑھ بجے دن کا وقت مقرر رہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۱۷ء پنجشنبہ

دوست احباب اور اہل علم وفضل سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، سفر سے متعلق سرکاری کام کا سلسلہ بھی جاری رہا اب کے ان کاموں کی ذمہ داری زیادہ تر ساتھیوں ہی پر رہی، برادرم ظفر مسعود کے آپریشن کے سلسلہ میں محترم منیری صاحب نے بمبئی ہیلتھ کمپنی کے چیرمین جناب قتال سے مشورہ لے کرسٹی کلینک چرنی روڈ (پرائیویٹ ہسپتال) کا انتخاب پہلے ہی کرلیا تھا جو جے جے ہسپتال کے مشہور سرجن ڈاکٹر پارکھ کا پرائیویٹ ہسپتال ہے، ڈاکٹر نے آپریشن کے لئے جمعہ کے دن آٹھ بجے کا وقت مقرر کیا تھا جس کی وجہ سے ظفر مسعود کو آج ہی شام پانچ بجے وہاں پہونچا دیا گیا تقریباً نو بجے تک دوست احباب محبین ومخلصین کی آمد ورفت رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۱۸ء جمعہ

آج کا دن ہم لوگوں کے لئے تاریخی دن تھا پہلی مرتبہ گھر کے ایک فرد کے شکم کا آپریشن ہونیوالا تھا، والد محترم کا دل ودماغ پہلے ہی سے متاثر تھا حالانکہ بمبئی کے حلقۂ احباب نے بڑی حد تک آپریشن کو بچوں کا کھیل بنا کر ان کے سامنے پیش کیا تھا، کوئی کہتا، قاضی صاحب !اب تو اپنڈس کا آپریشن ایک مذاق ہو کر رہ گیا ہے، واللہ آپ نے بھی کمال کردیا قاضی صاحب! دس منٹ کا کام اور آپ اس قدر گھبرا رہے ہیں، جناب احمد فرید صاحب نے باتوں بات میں اپنے خاص لہجہ میں کہا، بابا تم کاہے کو گھبراتا ہے وہ تو خراب اور زائد آنت کو گھاس کی طرح دس منٹ میں کاٹ کر پھینک دے گا، محترم قادری صاحب کے اس جملہ نے بڑا کام کیا، ڈاکٹر ذرا سا شکم کھولے گا اور دس منٹ میں بند کردیگا، اپنا معاملہ عجیب تھا مجھے ذرا بھی کسی قسم کی کوئی تشویش نہیں تھی، دل کے اس قدر مطمئن ہونے پر مجھے خود تعجب تھا، جس کی وجہ

غالبًا یہ تھی کہ اب درد کا دورہ میرے سامنے ہوا میں نے مریض کو جس عالم میں تڑپتے ہوئے پایا اس سے زیادہ تکلیف کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے اور بس، لہذا میں نے سوچا کہ جب اس مرض کا کامیاب اور مفید ترین علاج آپریشن اور صرف آپریشن ہی ہے تو اسے ضرور بالضرور ہو جانا چاہیے وقتی طور پر کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو، الحمدللہ کہ مریض ہم سب سے زیادہ مطمئن تھا۔

آپریشن کے لئے آٹھ بجے کا وقت معین کیا گیا تھا وقت مقررہ سے پہلے ہی محترم منیری صاحب ، قادری صاحب، عزیزم مولوی مستقیم و فخر الدین اور دوسرے بہت سے متعارفین و مخلصین ہسپتال پہونچ چکے تھے، آٹھ بجے مریض مسکراتا ہوا ہم سب کو سلام کر کے اللہ کا نام لیتا ہوا آپریشن روم میں داخل ہوا، آپریشن شروع ہوا اور ہم لوگ باہر بیٹھ کر اس کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے، دس منٹ کے بجائے پندرہ منٹ ہوئے ایک ملازم باہر آیا اور اس نے اطمینان دلایا، اسی اثناء میں قوال صاحب کے عزیز محترم ڈاکٹر اسحاق صاحب وعدہ کے مطابق آپہونچے اور سیدھے آپریشن روم تشریف لے گئے تھوڑی دیر بعد باہر نکلے اور فرمایا آپریشن نہایت کامیاب ہے اللہ تعالیٰ کا آپ لوگ شکر ادا کیجئے کہ آپریشن نہایت کامیاب اور بروقت ہوا، مرض کے مضر اثرات آس پاس کی آنتوں پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے ان کی صفائی میں دیر ہو رہی ہے یہ سن کر ہمارا سر رب العالمین کی بارگاہ میں اظہار اطمینان و تشکر کے طور پر خم ہو گیا، تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد مریض کو باہر لانے کا اعلان ہوا شفقت پدری بھی کس کس رنگ میں کیسے کیسے وقت ظاہر ہوتی ہے، والد محترم نے یہ اعلان سنکر چھتری سنبھالی اور باہر نکل جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر منیری صاحب اور قادری صاحب نے یہ کہکر انھیں پکڑ لیا کہ اب تو سب کچھ ہو گیا مریض باہر نکالا گیا اور اس نے ہم پر نظر پڑتے ہی جب السلام علیکم کہا تو ہمارے چہرے خوشی سے دمک اٹھے،

اس کی ظاہری حالت میں سوائے اس کے اورکوئی فرق نہیں پڑا تھا کہ آپریشن روم میں داخل خود سے چل کر ہوا تھا اور باہر اسٹریچر پر سو کر نکل رہا تھا، چہرہ پر وہی تبسم اور گفتگو میں وہی انداز بعینہ قائم تھا یہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ہم بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہوگئے، ڈاکٹر اپنے ماتحتوں کو ہدایت کر کے چلا گیا نرسوں نے مریض کو سنبھالا اور گلوکوز چڑھانے اور انجکشن لگانے کا سلسلہ شروع ہوگیا جو دوپہر تک جاری رہا، یہ رات میں نے مریض کے تیماردار محمد مصطفیٰ کے ساتھ ہسپتال میں گذاری جنھوں نے شروع سے آخر تک ہسپتال ہی میں اکثر و بیشتر اوقات گذارے، رات کے دس بجے تک سینکڑوں ہمدرد و مخلصین عیادت کے لئے آتے رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۱۹ء شنبہ

دن کا زیادہ تر حصہ ہسپتال میں گذرا، گیارہ بجے کے لگ بھگ فلورا فاؤنٹن گیا معلوم ہوا کہ آج بحرین کا ویزا نہیں مل سکا ہے، کل اتوار ہی ہے، پرسوں پاسپورٹ وغیرہ داخل کرنے کے بعد کبھی جا کر مل سکے گا اور اسی دن ہمارا جہاز تھا یہ سوچ کر تھوڑی الجھن ہوئی، مجموعی حیثیت سے کوئی الجھن کی بات نہیں تھی، مسافر خانہ ساتھیوں کے پاس پہونچا تو معلوم ہوا کہ دو مدراسی ساتھی مولوی حفیظ الرحمان عمری اور مولوی اقبال احمد مدراسی بھی آگئے ہیں، مولوی عبدالرحمان مبارکپوری بھی آچکے تھے مگر اتفاق سے ملاقات نہ ہوسکی تھی وہ مدنپورہ میں ٹھہرے ہوئے تھے اس طرح ہمارا پورا گروپ جو ایک ساتھ آیا تھا تقریباً بمبئی میں جمع ہوگیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۲۰ء یکشنبہ

آج بھی زیادہ وقت ہسپتال ہی میں گذرا دوست احباب اور بزرگوں

کی آمد ورفت اور عیادت کا سلسلہ جاری رہا، جناب الحاج محترم احمد غریب صاحب اور جناب عبدالرزاق صاحب قریشی کے علاوہ انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد بھی ہسپتال پہونچی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

۲۱/۹/۶۴ء دوشنبہ

دو پہر کو ہسپتال سے واپس آکر کچھ دیر آرام کیا ظہر کے بعد بھنڈی بازار کی طرف گیا جہاں سے ضرورت کی بعض چیزیں خریدیں جن میں اکثر و بیشتر مدینہ منورہ کے بعض احباب کی فرمائشیں تھیں ورنہ وہاں تو عام طور پر ہماری ضرورت کی سبھی چیزیں عمدہ اور بکفایت مل جاتی ہیں، منیری صاحب کی دوکان واقع مسجد اسٹریٹ سے جناب مختار احمد جاوید صاحب کی بعض مطلوبہ اشیاء لیں اور عصر کی نماز پڑھ کر مسافر خانہ پہونچا جہاں ساتھی میرا انتظار کر رہے تھے، انھوں نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ بحرین کا ویزا ابتک نہیں مل سکا ہے یہ خبر تھوڑی دیر کے لئے پریشانی کا باعث بنی رہی لیکن جونہی منیری صاحب اور اس سلسلہ میں ان کی گذشتہ خدمات کا خیال آیا فوراً ہی پریشانی ایک گونہ دور ہوگئی اور میں فوراً ہی ساتھیوں کو لیکر منیری صاحب کی دوکان پر واپس آیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا انھوں نے صبح آٹھ بجے ہسپتال ہی میں ملنے کا وقت مقرر کرتے ہوئے ہر قسم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا، واپسی میں غیر شعوری طور پر ہمارے قدم پاکدھونی کے اس دواخانہ میں جا پڑے جس میں ابھی تین ماہ پہلے تک ہمارے ایک عظیم محسن اور جمعیۃ العلماء مہاراشٹر کے صدر حکیم اعظمی جلوہ افروز رہا کرتے تھے، بمبئی جیسے تجارتی اور ہنگامی شہر میں ان کا دواخانہ اہل علم وفضل کیلئے ایک صاف ستھری محفل کا کام دیتا ہے، ان کے صاحبزادے جناب حکیم عبدالرشید صاحب نے ہم کو جہاز کے لئے کچھ دوائیں دیں جو چکر وغیرہ کے وقت بڑی مفید ثابت ہوئی

ہیں، بمبئی کی یہ آخری رات میں نے بھائی کے پاس ہسپتال میں گذاری۔

☆☆☆☆☆☆☆

۲۳/۹/۶۴ءسہ شنبہ

معمول کے مطابق فجر کی نماز کے بعد ہی والد محترم ہسپتال پہونچ گئے ان کے آنے کے بعد میں کمرہ واپس آیا اور سامان سفر درست کیا پھر بعض مخلصین کی ملاقات کے لئے نکل پڑا راستہ میں منیری صاحب سے ملاقات ہوگئی، ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر میں کوئی خبر بد سننے کے لئے تیار ہوگیا انھوں نے فرمایا کہ ''میرے مکان سے ٹیلیگرام آیا ہے کہ کئی بچے بیک وقت درد کا شکار ہوگئے ہیں'' نیز انھوں نے فرمایا کہ اس سے پہلے بھی بعض مرتبہ ایسا ہو چکا ہے، ہمارے اوپر اس کا بڑا اثر ہوا ہم نے صحت و شفایابی کی دعاء کی اور بجائے ان کے خود ہم ہی لوگوں نے معذرت کی لیکن ان کا جذبۂ خدمت غالب رہا اور وہ ہم کو ساتھ لیکر برطانوی ہائی کمیشن پہونچے وہاں نمایاں حرفوں میں ''ویزا کے لئے آج دیا ہوا پاسپورٹ کل پانچ بجے شام کو ملے گا'' لکھا ہوا بورڈ دیکھ کر تقریباً مایوسی ہوگئی مگر لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کا ورد پڑھنے والے بھلا نا امیدی کیا جانیں، منیری صاحب نے سلسلۂ جنبانی کی آخر ساڑھے تین بجے ویزا ملنے کا وعدہ ہوا اور پاسپورٹ وغیرہ جمع کر دیا گیا، اب ایک دوسرا مسئلہ درپیش تھا جیسا کہ اخبارات کے اعلانات اور کمپنی کے اعلانات سے معلوم ہوا تھا ہمارا جہاز پانچ بجے شام کو بمبئی نمبر ۱۸ الگزنڈ ڈاک سے روانہ ہونے والا تھا لیکن ڈاکٹری معائنہ کا وقت صرف تین بجے تک تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ پاسپورٹ اور ویزا ملنے تک ڈاکٹر چلا جائے گا اور ہم اس جہاز سے سفر نہ کر سکیں گے ہماری اس مشکل کو بھی منیری صاحب نے اپنی ناگہانی آفت کے باوجود یہ کہ کر حل کر دیا کہ تم لوگ اپنا اپنا سامان وغیرہ لیکر دو بجے بندرگاہ پہونچ جاؤ اور ڈاکٹری معائنہ کرالو اس کے بعد کسٹم اور فارن اکسچینج وغیرہ کے

مراحل سب بعد میں طے ہو جائیں گے کیونکہ یہ آفیسران آخیر وقت تک رہا کرتے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اس وقت گیارہ بج رہے تھے ہم نے زاد سفر کے طور پر کچھ تھوڑے بہت پھل خریدے ورنہ ہمارا زاد سفر تو خیر الزاد التقویٰ کے پیش نظر زیادہ تر روحانی ہی رہا، تقریباً ڈیڑھ بجے والد محترم کی معیت میں مسافرخانہ سے روانہ ہوئے دو بجے بندرگاہ پہونچے سامان وغیرہ یکجا کر کے قلی کے حوالہ کرنے کے بعد طبی معائنہ کے لئے ڈاکٹر کے پاس پہونچے اور چند منٹ میں اس مہم سے فارغ ہو گئے، اب ہم دوسرے ضروری کاغذات کی خانہ پری میں مصروف تھے مگر جگہ جگہ ویزا نمبر مطلوب ہونے کے سبب ان کاغذات کو ادھورا ہی چھوڑنا پڑا، چونکہ منیری صاحب کی ہدایت تھے کہ ساڑھے تین بجے سے پہلے میرا انتظار نہ کرنا، اس لئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گئے، ابھی چند منٹ گذرے تھے کہ منیری صاحب پاسپورٹ لئے نظر آئے مسرت کا اندازہ ہمارے چہروں سے بخوبی کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ساڑھے تین کی جگہ پونے تین ہی بجے پاسپورٹ مل چکا تھا ان کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا گیا، اسی اثناء میں جناب مولانا عمران خاں صاحب ندوی کے صاحبزادے مولانا ابوریحان ندوی ازہری ملے جو لیبیا میں مدرس ہیں اور اسی دن ہوائی جہاز سے بیروت جا رہے تھے انھوں نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی ہیں ان کی والدہ بھی ساتھ ہیں یہ دونوں کراچی تک جائیں گے آپ ان کا خیال رکھیں اور چونکہ میرا انتظام ہوائی جہاز سے مکمل ہو گیا ہے اس لئے مجبور ہوں ورنہ میرا ارادہ بھی اسی راستہ سے سفر کرنے کا تھا، اب ہم قلی کے انتظار میں بیٹھے تھے ایک تو یونہی ہمیں کافی دیر ہو گئی تھی دوسرے قلی لاپتہ ہو گیا، کافی انتظار کے بعد جب وہ قلی نہیں آیا تو ہم نے دوسرے قلیوں کی مدد سے سامان کا کسٹم کروایا، کسٹم سے فارغ ہو کر ماحول پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے جہاز کے زینہ پر قدم رکھا، جہاز کے اندر جا کر

جگہ کا سوال پیدا ہوا چونکہ یہ جہاز دوار کا کمپنی کے دوسرے جہازوں کی بہ نسبت چھوٹا ہے اس لئے اس میں سیٹیں بہت مختصر تھیں جو ہمارے ٹکٹ خرید نے بہت پہلے پر ہو چکی تھیں ایک مناسب جگہ دیکھ کر سامان رکھوایا گیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جہاز کا ایک چکر کیا غالباً جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں میں ہمارا آخری نمبر تھا، تقریباً آدھ گھنٹہ بعد جہاز بمبئی کی بندرگاہ سے روانہ ہوا، شام کے پانچ بج رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

٢٣/٩/٦٤ء چہارشنبہ

بمبئی کراچی کے درمیان عام طور پر سمندر میں تلاطم اور ہیجان زیادہ ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ دوران سر اور متلی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس لئے رات سویرے ہی لیٹے رہے صبح سویرے آنکھ کھلی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر کچھ پھل کھائے اور پھر سو گئے دو گھنٹہ کے بعد جا کر ناشتہ کیا، ہم سب کو دوران سر کی شکایت عام رہی جس کی وجہ سے دو پہر میں کھانا نہ کھایا جاسکا، ہمارے لئے یہ دن اور آنے والی رات دونوں اہم تھے اس لئے میں اپنے سابقہ تجربہ کے مطابق زیادہ تر لیٹا ہی رہا جس کی وجہ سے رات نیند دیر سے آئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

٢٤/٩/٦٤ء پنجشنبہ۔

صبح آنکھ کھلی تو کراچی کا شور سنائی دیا، کراچی کے مسافر بھاگ دوڑ میں مصروف تھے، کچھ نہانے کے لئے لمبی لائن لگائے کھڑے تھے کچھ نہا دھو کر کپڑا بدل رہے تھے، کچھ سامان درست کر کے ناشتہ کے لئے کچن کی طرف بھاگ رہے تھے، میں بھی اپنے کراچی والے مسافروں کی طرف متوجہ ہوا، دیکھا تو وہ لوگ بھی سامان وغیرہ باندھ کر تقریباً تیار تھے، صبح کا سہانا وقت اور دو رات ایک دن کے مسلسل سفر کے

بعد ایک بڑے شہر کی آمد نے مجھے اوپر جانے پر مجبور کیا، سورج طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ کراچی کا آہستہ آہستہ ابھرنا بھی مدتوں یاد رہے گا، دونوں منظر اپنی اپنی جگہ دیدنی کے قابل تھے، تقریباً آٹھ بجے جہاز کیماڑی بندر نمبر۲ پر لنگر انداز ہوا اترنے والوں کا ڈاکٹری معائنہ اور داخلہ فارم کی خانہ پری کا رسمی سلسلہ شروع ہوا جو کافی دیر تک جاری رہا، گیارہ بجے کے لگ بھگ ہمارا بھی نمبر آپہونچا اب ہمارا پورا گروپ بندرگاہ سے نکل کر اپنے زین پر کھڑے ہونے کی تصدیق خود بخود مختلف حرکات سے کر رہا تھا، جہاز سے اترتے وقت ہمیں سخت تاکید کر دی گئی تھی کہ اپنے پیسے سرکاری طور پر تبدیل کرائیں اب کسٹم کے اندر آکر معلوم ہوا کہ اسچنج بورڈ کے نیچے لگی ہوئی میز اور کرسیاں سنسان پڑی ہیں اب مجبوراً ہمیں باہر نکل کر حبیب بنک کا سہارا لینا پڑا جس کا وقت ختم ہو رہا تھا، خیر روڈ سے پرنس روڈ پہونچنے میں دیر نہیں لگی بنک سے روپیہ تبدیل کرایا گیا اور اپنے عزیز ساتھی مولانا محمد سلفی (جن کے پتہ میں پرنس روڈ تحریر تھا) کی تلاش میں چلے جلد ہی ایک بچہ کے ذریعہ محمدی مسجد پہونچ گئے، یہ مسجد اس معنی کر کے جامع ہے کہ مختلف قسم کے دینی اداروں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے اور جماعت اہل حدیث کا مرکز ہے، مدرسہ محمدیہ سلفیہ، جماعت غرباء اہل حدیث اور اس کے ترجمان صحیفہ کا دفتر بھی اسی مسجد ہی کی عمارت میں واقع ہیں، مولانا محمد صاحب کے بڑے بھائی جناب مولانا عبدالرحمان سلفی بڑے اخلاق کے آدمی ہیں انھوں نے بڑی بے تکلفی سے ہمیں اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا اور ہم نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا اسی اثناء میں مولانا محمد صاحب بھی آگئے اس وقت مدرسہ مفتاح العلوم بھیمڑی کا نقشہ ذہن میں گھوم گیا جہاں برسوں ہم نے اسی طرح کا دسترخوان سجایا ہے، کھانے سے فارغ ہو کر ظہر کی نماز ادا کی گئی نماز کے بعد مولانا امیر احمد صاحب اپنے استاذ جناب حیرت صاحب سے ملنے کلفٹن روڈ چلے گئے جہاں پہونچ کر انھیں معلوم ہوا کہ ابھی حال ہی

میں دارفانی سے دار بقاء کی طرف رحلت فرما گئے انا للہ و انا الیہ راجعون ، میں نے وہیں بیٹھ کر بمبئی اور مبارکپور ایک ایک خط لکھا، اب واپسی کا وقت قریب تھا ہمارے ساتھی، اسی جہاز میں سفر کرنے والے پاکستانی ساتھی مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا محمد بشیر صاحب اور مولانا صلاح الدین صاحب عجمی بندرگاہ پہونچ چکے تھے، مولانا محمد صاحب جو مولانا صہیب صاحب حسن کے ساتھ بعد میں آنے والے مدینہ منورہ ہی میں ملاقات ہونے کے امکان کے پیش نظر اجازت لیکر تقریباً ڈھائی بجے رخصت ہوئے ، بمبئی سے کراچی تک کے سفر نے منھ کا مزا خراب کر رکھا تھا اسے دوبارہ اپنی حالت پر لانے کے لئے سیخ کباب کا پروگرام راستہ چلتے چلتے بن گیا اور دہلی کباب ہاؤس نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنادیا، وہاں سے نکل کر راستہ کے لئے کچھ پھل اور اخبارات و رسائل خریدے گئے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر تقریباً سوا تین بجے کیماڑی بندرگاہ پہونچے اپنا اپنا پاسپورٹ لیکر جہاز میں سوار ہوئے، ۹ر بجے رات کو جہاز کراچی سے گوادر کے لئے روانہ ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۲۵ء جمعہ

پوری رات اور آدھا دن مسلسل چلنے کے بعد دن کو گیارہ بجے کے قریب جہاز گوادر پہونچا، بمبئی اور کراچی سے مسافروں کی ایک جماعت گوادر کے لئے سوار ہوئی تھی ، گوادر اب پاکستان کا علاقہ شمار کیا جاتا ہے ، بلوچستان کا یہ علاقہ سلطان عمان سلطان بن احمد ۱۷۹۲ء تا ۱۸۰۴ء نے اپنی مدت سلطانی کے دوران ہتھیا لیا تھا اور اس وقت سے لے کر غالباً ۱۹۵۶ء تک عمان و مسقط ہی کی ماتحتی میں رہا اس کے بعد انگریزوں کے پٹھو اور سلطنت مسقط کے نام نہاد موجودہ سلطان سعید بن تیمور نے تین کروڑ روپیہ میں حکومت پاکستان کے ہاتھ فروخت کردیا، اس طرح یہ زرخرید

علاقہ اب پاکستان کا ایک حصہ بن گیا، بندرگاہ تعمیر نہ ہونے کے سبب جہاز ساحل سے دور تقریباً ایک میل سمندر میں کھڑا رہا اترنے چڑھنے والے مسافر چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور لانچوں کے ذریعہ کنارے آتے جاتے رہے، ساحل پر پہاڑوں کا بچھا ہوا جال دیکھ کر غیر شعوری طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب عرب کا علاقہ شروع ہو رہا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے اس کے آگے سے خلیج عمان اور خلیج عربی کے علاقے شروع ہو جاتے ہیں، ۵ر بجے شام کو ہم نے گوادر کو خیر باد کہا اور مسقط کے لئے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

۲۶/۹/۶۴ء شنبہ

گوادر کے بعد سمندر میں جا بجا پہاڑوں کی کثرت نے تلاطم وتموج کا زور ختم کر دیا تھا اس لئے رات نسبۃً آرام وسکون سے گذری، صبح ہر شخص خوش وخرم اور دوران سر سے بے نیاز نظر آرہا تھا، ناشتہ وغیرہ کے بعد ساتھی یکجا ہو گئے اور گھنٹوں تفریحی قسم کی محفل جمی رہی، وہاں سے اپنی اپنی جگہوں پر جا کر کچھ دیر کے لئے رسائل و جرائد کی ورق گردانی میں مصروف رہے، تقریباً دس بجے مسقط کی آمد کی علامات نظر آنے لگیں، مسقط کے مسافرین اترنے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے ایک گھنٹہ کے بعد جہاز مسقط کے ساحل پر بندرگاہ تعمیر نہ ہونے کے سبب نصف میل دور سمندر میں کھڑا ہوا، ہمارے سامنے مسقط کی پہاڑیاں تھیں داہنی سمت کی پہاڑی پر جہازوں کی رہنمائی اور مسقط کی حفاظت کے لئے برج مختلف قسم کے بنے ہوئے تھے، سامنے والی پہاڑی پر سلطان مسقط کا قلعہ، برطانوی قونصل خانہ اور کسٹم وغیرہ کی عمارتیں نمایاں تھیں، جن کے پیچھے شہر کی عام عمارتیں نظر آرہی تھیں، بائیں سمت والی پہاڑی جو نسبۃً اونچی اور کئی میل تک بائیں طرف پھیلی ہوئی تھیں ویران نظر آرہی تھی اس کے آخری حصہ سے مسقط کا دوسرا شہر مطرح جھانک رہا تھا جس میں نئے پرانے دونوں طرز کی عمارتیں نظر

آرہی تھیں، گرمی شدت نے تھوڑی دیر کیلئے سب کو پریشان کردیا یہاں چڑھنے اترنے والے مسافروں اور بمبئی اور کراچی سے لدے ہوئے مالوں کی کثرت تھی اور چونکہ سارا کام کشتیوں ہی کے ذریعہ ہورہا تھا اس لئے کام کی رفتار سست اور ہنگامہ زیادہ تھا، ابھی پورے مسافر اتر بھی نہ پائے تھے کہ چڑھنے والے مسافروں کی کشتیاں جہاز کے اردگرد چکّر کاٹنے لگیں، یہاں سے سوار ہونے والے مسافروں میں عرب بدّؤں کی تعداد زیادہ تھی جو تلاش معاش کے لئے آس پاس ریاستوں میں جارہے تھے، انگریزی استعمار نے انھیں ہر طرف سے اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ صرف زندہ رہ سکتے ہیں اور بس، جہالت وافلاس استعماری عطیہ ان کے چہرے ان کے لباس سے ظاہر ہوتا ہے، اسلئے ان کی حد درجہ غیر نفاست پسندی کے باوجود بھی ہمارا رویّہ ان کے ساتھ ہمدردانہ رہا، ہم نے سوچا کہ استعمار کو ہتھوڑا کھائی ہوئی قوم مشکل ہی سے سنبھل سکتی ہے، ابھی کے دن ہوئے جب اس کا ہتھوڑا ہمارے سروں پر بھی رقص کررہا تھا اور ہم بے دست وپا بنے سہمے کھڑے تھے، میں نے موازنہ کیا استعماری دور کے ہندوستانی اور آج کے مسقطی وعمانی میں کوئی خاص فرق نہیں پایا البتّہ یہ بنیادی فرق ضرور تھا کہ ہندوستان جیسے سونے کی چڑیا ملک میں انگریزوں کی سلب ونہب کے بعد بھی اتنا بچ جاتا تھا کہ وہ اپنا پیٹ پال سکے، لیکن خلیج عمان اور ریاست مسقط استعمار کے خون چوس لینے کے بعد دم نہیں لے سکتے، نہیں کہا جاسکتا کہ ان عرب بدّؤں نے اس ہفتہ کھانے کا منھ دیکھا تھا یا نہیں، آپ یقین جانئے کہ سامان اتارنے کے لئے قلیوں کا جب پہلا گروپ جہاز میں داخل ہوا تو اس نے ''الف لیلہ'' کے کسی بھوکے ہیرو کی طرح جابجا پھینکے پڑے کھانے کی پلیٹوں کو اس طرح صاف کرنا شروع کردیا کہ ہم بھونچکے رہ گئے راستہ چلتے ہوئے، زینہ طے کرتے ہوئے، سامان لاتے لیجاتے ہوئے، جہاں کہیں کھانے کی کوئی پلیٹ نظر آئی اور ان قلیوں نے اپنے دوسرے قلیوں کی نظریں بچا کر اس کی صفائی

شروع کردی، ہم نے تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچ کر صبر کیا کہ یہ یہاں کا مزدور طبقہ ہے جو اپنا پیٹ پالنے کے لئے آس پاس کی حکومتوں سے چلا آیا ہے، یہاں کے باشندوں کا حال تو بہر حال ان سے اچھا ہوگا مگر افسوس کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس نکلا، شام کو جب عمانی مسقطی بدّؤں کی جماعت جہاز میں سوار ہوئی تو انھیں دیکھ کر ہماری غیرت وانسانیت شرم سے پسینے پسینے ہوگئی، قلی بھوکے تھے جاہل تھے گندے تھے مگر ان نو وارد مسافروں میں تو اکثر و بیشتر چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے، دبلے پتلے فاقہ زدہ جسم چہروں پر بے شمار جھریاں، بینائی سے محروم آنکھیں، ایک چھڑی کا سہارا لئے اس وقت تک جہاز کے مطعم کے آس پاس در و دیوار سے چپکی رہیں جب تک کہ شام کا کھانا نہ کھالیا، جہاز کے عام مسافروں کا یہ عالم ہے کہ وہ کھانا زبردستی لقمہ دولقمہ زہر مار کرتے ہیں، مگر ان کا یہ عالم رہتا کہ گویا شاہی دستر خوان پر بیٹھے اپنے ذوق خورد و نوش کا ثبوت دے رہے ہیں۔

مورخین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ موجودہ شہر مسقط کسرائے فارس نوشیرواں ۵۳۱ء ۵۷۹ء نے آباد کیا ہے، ممکن ہے کہ خلیج عربی عمانی فارسی کشمکش کے بعد جب نوشیرواں کو فتح یابی ہوئی اور اس کے علاقوں پر اپنا قبضہ کرلیا تو اس ویران بستی کو دوبارہ تعمیر کیا ہو، اس رائے کی صحت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ پرتگالیوں کو مسقط میں کچھ ردی سکّے دستیاب ہوئے یہ سکّے ۱۲ء کے ڈھلے ہوئے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں یہاں تجارت کا بڑا زور وشور تھا اور یہاں ساحل پر کوئی بڑا شہر آباد تھا جس کی تجارتی اہمیت مسلم تھی اور کچھ دنوں بعد ویران ہوگیا ہو، جسے نوشیرواں نے دوبارہ تعمیر کرایا ہو۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ مسقط اصل میں مسکۃ ہے (مشکیزہ) قاموس میں چمڑا، مشک کے ٹکڑے کو بھی مسکۃ کہتے ہیں، ابن مجاور نے بھی مسقط کی اصل مسکت

بتلائی ہے، اسی طرح سلیمان مہری بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ’’**العمدة المهرية في ضبط العلو م البحرية**‘‘ میں جہاں جہاں اس شہر کا نام آیا ہے اس نے مسکت ہی لکھا ہے۔

مسقط کا ذکر سب سے پہلے ابن فقیہ ہمدانی (تیسری صدی ہجری کے اخیر کا مورخ وجغرافیہ نویس اور ابن رستہ کا ہم عصر) کی کتاب ’’البلدان‘‘ میں ملتا ہے وہ مشہور مورخ وجغرافیہ نویس سلیمان تاجر کے حوالہ سے لکھتا ہے ’’چین جانے والے اکثر جہاز بصرہ عمان سے چل کر سیراف میں مال بھرتے ہیں کیونکہ اس سمندر میں بعض جگہ تموّج اور پانی کی قلت ہوتی ہے جب سامان لد لیتے ہیں تو مسقط نامی ایک جگہ سے میٹھا پانی لیتے ہیں جو عمان کا آخری حصہ ہے مسقط اور سیراف کے درمیان تقریباً دوسو فرسخ کا فاصلہ ہے۔

یاقوت حموی اپنی کتاب ’’معجم البلدان‘‘ میں مسقط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے ’’مسقط عمان کی یمن سے ملنے والی آخری سرحد کا ایک ساحلی شہر ہے‘‘ اسی شہر کے متعلق ساتویں صدی ہجری کا ایک اور موّرخ وجغرافیہ نویس بھی تقریباً انھیں الفاظ میں مسقط کا ذکر کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسقط اس دور میں ایک شاندار آبادی تھا، ابن خرداذبہ، مسعودی اور بکری جیسے موّرخین کا مسقط کے متعلق خاموشی اختیار کرنا تعجب کی بات ہے۔

مسقط کی موجودہ حکومت کا بانی اٹھارہویں صدی عیسوی کا احمد بن سعید نامی بہادر سلطان ہے جس کے زمانہ میں اندرونی وبیرونی فتنوں کا نام ونشان تک مٹ گیا تھا، اس کے بیٹے سید سعید نے ایک گھریلو واقعہ سے متاثّر ہوکر ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک تجارتی وسیاسی معاہدہ کرلیا جس کی رو سے انگریزوں کو مسقط میں رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگیا، اور اس وقت سے انگریزوں نے اس کو اپنے استعماری

چنگل میں جکڑلیا، ۱۸۰۹ء میں معاہدہ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے ساتھ قواسم کی سرکوبی کے لئے راس خیمہ گیا اوران کے سربراہ حسنا بن رحما کو گرفتار کرلیا ۱۹۲۰ء میں جب دوبارہ انگریزوں کے ساتھ ان پر چڑھائی کی تو شکست کھا کر زخمی ہوگیا یہی زخم اس کی موت کا سبب بنا، اس کی موت کے بعد اس کا بھتیجہ سعید بن سلطان والی ہوا جس کے پوتے سالم بن تونی ابن سعید کے خلاف انگریزوں نے ترکی ابن سعید کا ساتھ دیا اوراس کو کامیاب بنا کر مسقط پر اپنا پورا تسلط جمالیا، ۱۳۰۵ھ میں ترکی ،کی موت کے بعد اس کا بیٹا فیصل والی ہوا، فیصل کا بیٹا تیمور ہے جس نے ۱۹۳۲ء تک سلطنت کر کے اپنے لڑکے سعید بن تیمور کو اپنا خلیفہ بنا کر بمبئی میں زندگی گذاری، سلطان سعید بن تیمور نے شروع شروع میں انگریزی استعمار کے خلاف پوری طاقت صرف کی اورکوشش کی کہ کسی طرح استعمار کے چنگل سے نکل کر ہموطنوں کے قبضہ میں آجائے لیکن آخر میں وہ انگریزوں کا پٹھو بن گیا تا کہ انگریزی فوج کی سرکردگی میں امارت عمان پر قبضہ کرسکے ،چنانچہ ۲۴/ جولائی ۱۹۵۷ء میں اس نے عمان پر وحشیانہ حملہ کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا علاقہ قید خانہ میں بدل گیا، عمان کے امام غالب بن علی نے برطانوی منظّم اور جدید اسلحہ سے آراستہ فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو امام غالب نے پہاڑوں کا رخ کیا جہاں سے برطانوی حملہ کا مقابلہ نسبۃً آسان تھا، عمان کی حریت پسند قوم نے بم برساتے برطانوی ہوائی جہازوں کی پرواہ کئے بغیر مقابلہ جاری رکھا، جب حالات اور بھی ناسازگار ہوگئے تو امام غالب نے سعودی عرب میں سیاسی پناہ لے کر دمام میں اپنی عبوری حکومت قائم کرلی اوراپنے معاملات کو عرب لیگ اوراقوام متحدہ میں پیش کیا، فلسطین کی طرح عمان کا مسئلہ بھی آج کل عربوں کے لئے دردسر بنا ہوا ہے۔

مسقط شہر جس کے نام پر سلطنت کا نام رکھا گیا ہے اپنی شدید گرمی کی وجہ سے

مشہور ہے اس کے مشہور شہر صور، صحار اور مطرح ہیں، صور سفینہ سازی، دریائی حمل ونقل اور مچھلی کے شکار وغیرہ کے لئے مشہور ہے، صحار اور اس کے آس پاس کے ہموار علاقے کھجور، کھیتی باڑی اور پانی کیلئے مشہور ہیں، مطرح مسقط والوں کی گرمی گذارنے کا مقام ہے جو مسقط کے شمال میں پانچ کلومیٹر پر واقع ہے یہاں ایک چھوٹا سا ہوائی اڈہ بھی ہے۔

سلطنت کی آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل ہے، عام طور پر مدارس اور ہسپتال وغیرہ کا فقدان ہے، مسقط کا مدرسہ نظامیہ مدتوں سے یونہی چلا جارہا ہے بعض چھوٹے چھوٹے مدارس میں مذہبی تعلیم جاری ہے ابھی حال ہی میں مطرح کے اندر ایک پرائمری مدرسہ کھولا گیا ہے۔

مسقط ہی سے بی آئی کمپنی کے جہاز گذرتے ہیں جو مسقط کو ہندوستان مشرقی افریقہ اور خلیج عربی سے ملاتے ہیں، سلطنت کا نظام ایک وزارتی بورڈ چلا رہا ہے جس کے نگراں موجودہ سلطان سعید اور اس کا انگریز وزیر خارجہ ہیں، سلطان سعید عرب ممالک سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھتے وہ پٹرول کے سنہرے خواب دیکھ رہے ہیں، سلطان سعید اس وقت خلیج عمان کی ساتوں ریاستوں کو چھوڑ کر پورے عمان پر قابض ہیں۔

مسقط کی اپنی ایک فوج ہے جسے انگریزوں نے جدید اسلحہ سے لیس کر رکھا ہے وہی اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں جس کے اخراجات عراق کی برطانوی پٹرول کمپنی برداشت کرتی ہے، مسقط کی یہ فوج اس علاقہ میں برطانیہ کی دوسری فوجی طاقت شمار کی جاتی ہے، پہلی فوجی طاقت خلیج عمان کی خودمختار ریاستوں میں موجود ہے، ان فوجوں کا سپہ سالار بحرین میں مقیم برطانوی حاکم ہے۔

چونکہ مسقط کے مسافر اور سامان زیادہ تھے اس لئے تقریباً عشاء کے وقت جہاز

نے لنگر اٹھایا۔ اب ہم عرب علاقہ سے گذر رہے تھے، جہاز چلے ہوئے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہوگا کہ بدتمیزیوں کا ایک طوفان پھوٹ پڑا، شراب کا دور تو کبھی کبھار اس سے پہلے بھی چلتا ہوا نظر آیا تھا مگر یہاں سے چلنے کے بعد تو یاران باذوق کے صلاح عام ہوگئی جس باذوق کو دیکھو اس کے ہاتھ میں دو ایک بوتل لٹک رہے ہیں، اس قدر آزادانہ بے باکانہ اور اندھادھند دور چلنے کی غالباً وجہ یہی تھی کہ ہندوپاک میں اوّلاً اتنی اونچی شراب ملتی نہیں، دوسرے اب سمندر میں قدرے اطمینان وسکون ہو چلا تھا تیسرے مسقط سے سوار ہونے والے بعض عرب وغیرعرب مسلمان جو مسقط عمان میں شراب کی تشنگی قانوناً نہیں بجھا سکتے جہاز میں آتے ہی آزاد ہو جاتے ہیں اور پھر جہاز ایک مرتبہ شراب کی بوتلوں کا ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے، یہیں سے ان زانیہ اور فاحشہ عورتوں کی بدتمیزیاں بھی عروج پر ہو گئیں جو غالباً بمبئی ہی سے سوار ہوئی تھیں، ان کی انسانیت سوز حرکتوں نے خواتین اور باحیا مردوں کے لئے ایک بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا، دونوں قسم کی یہ بدتمیزیاں اسی راستہ کے گذشتہ سفر میں بھی پیش آئی تھیں افسوس کہ معاملہ ''**واذار کبوافی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین**'' سے بھی کئی گنا آگے بڑھ چکا تھا، گذشتہ سفر کی روشنی میں اسی ماحول میں کسی نہ کسی طرح بحرین پہونچنا تھا، ان حرکتوں کا دماغ پر برا اثر لئے سو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۲۷ء یکشنبہ

صبح آنکھ کھلی تو جہاز عمان کے رأس الاسود نامی پہاڑ کے قریب سے گذر رہا تھا، سمندر سے سورج ابھرنے کا منظر قابل دید تھا اسی کے ساتھ سمندری مچھلیوں کا کھیل کود بھی کوئی کم نہ تھا، تقریباً ایک ایک گز کی مچھلیاں بیس بیس پچیس پچیس کا گروپ بنا کر یک بیک جہاز کے اگلے حصہ سے مل کر چلتی ہوئی نمایاں ہوتیں اور اپنی پوری طاقت

صرف کرتے ہوئے دس بیس قدم تک جہاز کے ساتھ چلتیں جب اس دوڑ میں ان کی رفتار کچھ سست پڑ جاتی اور جہاز کے اگلے حصہ سے ٹکرانے کے قریب ہو جاتیں تو یک بیک اچھل کر پانی کے اوپر سے چھلانگ لگاتیں اور جہاز سے کچھ آگے بڑھ جاتیں پھر ساتھ ساتھ تیرنے لگتیں، چار چھ مرتبہ کی اچھل کود کے بعد جب وہ تھک جاتیں تو ایک طرف ہو کر اپنی شکست کا اظہار کرتے ہوئے غائب ہو جاتیں، ہر گروپ میں سے عام طور پر تین چار مچھلیاں کافی دور تک جہاز کا مقابلہ کرتی چلی جاتیں بالآخر وہ بھی ایک طرف بھاگ جاتیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بیس پچیس کا دوسرا گروپ ان کی جگہ لے لیتا یہ منظر تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا، چونکہ خلیج عمان کا یہ علاقہ تجارتی جہازوں کی گذر گاہوں کا مرکز ہے اسلئے اس علاقہ میں اکثر و بیشتر ہمارے جہاز کے دور نزدیک تیل بردار اور مال بردار جہاز گذرتے ہوئے نظر آتے رہتے۔

دوپہر کو جہاز دوبئی پہونچا اور ساحل سے تقریباً ایک میل دور سمندر میں لنگر انداز ہوا چڑھنے اترنے والے مسافروں کی یہاں بھی کثرت ہوتی ہے، خلیج عمان کی سات مشہور ریاستوں میں دوبئی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور اہم ریاست ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ریاست دوبئی ہی عمان کی ساحلی ریاستوں کا دارالسلطنت ہے تو بے جانہ ہوگا کیونکہ یہی ان تمام ریاستوں کا اقتصادی اور اداری مرکز ہے، یہیں دارالاعتماد ہے جسے تمام ریاستوں کے سربراہوں کی مجلس کہنا چاہیئے جہاں مجتمع ہو کر یہ لوگ انگریزی استعمار کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے داخلی و خارجی معاملات کا حل تلاش کرتے ہیں، ان ریاستوں میں صرف دوبئی ہی ایسی ریاست ہے جس کی اپنی ایک میونسپلٹی ہے جو صحت اور تعمیر کے شعبوں پر مشتمل ہے، دو سال پہلے اس میونسپلٹی کا بجٹ چالیس لاکھ روپیہ بنا تھا، اسی طرح تجارت اور ڈاک کے ادارہ کے اعتبار سے بھی اسے دوسری تمام ریاستوں پر فوقیت حاصل ہے، ایک انگریز کمپنی ان دونوں اداروں کو

اپنی نگرانی میں چلا رہی ہے، عالمی ٹیلیگرام کویت بھیجا جائے تو پہلے وہ لندن پہونچے گا پھر وہاں سے کویت بھیجا جائے گا، ریاست شارقہ اور ابوظبی میں بھی اس کی ایک ایک شاخ قائم ہے، بجلی پانی کا محکمہ بھی اچھا خاصا ہے، اس کا ہوائی اڈہ بھی ریاست کے دوسرے ہوائی اڈوں کی بہ نسبت بڑا ہے، ساحل عمان کا برطانوی مشیر دوبئ کے دارالاعتماد میں مقیم رہتا ہے جس کی ماتحتی میں تجارتی ثقافتی اور اقتصادی ادارے چل رہے ہیں، برطانوی بنک کی ایک بڑی شاخ کے علاوہ ایک قومی بنک بھی ہے، دوبئ تجارتی حیثیت سے ممتاز ہے، مقامی حکومت درآمد شدہ اشیاء پر چار فیصدی کسٹم لیتی ہے، برائمی جنوبی شرقی سعودیہ اور دوسری ریاستوں کو کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی دوسری اشیاء اسی راستہ سے بھیجی جاتی ہیں، دوبئ کے بازار، اسلامی دور کے قاہرہ وبغداد کے بازاروں کی طرح تمام ضروریات زندگی کے سامان سے پٹے پڑے رہتے ہیں، کم ازکم اس اعتبار سے دوبئ کا بازار مشرق ومغرب کے کسی بازار سے کم نہیں کہا جاسکتا، ۱۹۶۲ء میں دوبئ میں درآمد شدہ اشیاء کی قیمت سات کروڑ پچاس لاکھ تک پہونچ چکی تھی۔

دوبئ کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے دوسری ریاستوں کی بہ نسبت یہاں شیعہ زیادہ ہیں جنھیں ان کی اصطلاح میں بحارنہ کہا جاتا ہے ان کی ایک بڑی مسجد بھی ہے جس میں عشاء فجر اور ظہر کی اذان ہوتی ہے، عام باشندے سنّی ہیں جس میں شافعی زیادہ ہیں اس کے بعد حنابلہ کا نمبر آتا ہے حنفی، مالکی کی تعداد کم ہے۔

خلیج عمان کی ریاستوں سے ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے لئے آس پاس کی حکومتیں بڑی جدوجہد کر رہی ہیں بلکہ اپنے خرچہ پر مدارس قائم کر کے ان کی نگرانی کر رہی ہیں اس علاقہ میں مصر نے باسٹھ، کویت نے اڑتالیس۔ ریاست قطر نے بتیس اور بحرین نے دس مدرسین ومدرسات بھیجے ہیں، مقامی طور پر بھی لوگ کوشش

کرکرا کے مدارس قائم کر رہے ہیں اور اپنے خرچ پر باہر سے اساتذہ بلا رہے ہیں۔ چنانچہ دوبئ میں دوسری حکومتوں کے تعاون سے قائم شدہ سرکاری مدارس کی تعداد چھ ہے جس میں سے چار لڑکوں کے لئے اور دو لڑکیوں کے لئے، اس میں دو ہزار طلاب وطالبات زیر تعلیم ہیں، ان کے علاوہ دوبئ میں کچھ اور مدارس جن میں ایرانی مدرسہ معہد دینی اور مدرسہ صنائیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دوبئ میں ایک پولیس اسٹیشن بھی ہے جس کا انسپکٹر ایک انگریز اور اس کا نائب عرب ہے اور پولیس کے فرائض شہر ہی کے رضا کار لوگ انجام دیتے ہیں، اور امن وامان شہر و بازار کی حفاظت کی ذمہ داری انھیں کے سر ہوتی ہے، بردیرہ کا نالیف نامی قدیم قلعہ مرکزی جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، شہر کے شرعی عدالت، جدید قوانین اور نئے نظام کا کافی اثر ہے۔ ریاست کا حکمراں راشد بن سعید آل مکتوم کسٹم آفس میں بیٹھ کر روزانہ صبح سے ظہر تک سرکاری کام کرتا ہے جن میں زیادہ تر تجارتی اور داخلی وخارجی امور ہوتے ہیں، اس کا محل شہر سے باہر جنوبی سمت میں زعبیل نامی جگہ واقع ہے، پٹرول کی دوڑ میں یہ ریاست بھی آگے ہے مگر موجودہ مقدار ناکافی ثابت ہوگی مزید دریافت کے امکان روشن ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

۶۴/۹/۲۸ء دوشنبہ

دوبئ سے روانہ ہو کر آگے بڑھے چونکہ ان علاقوں کا سمندر بمبئ، کراچی کی بہ نسبت کافی چھوٹا اور جگہ جگہ پہاڑوں سے معمور ہے اس لئے ہمیں اب سمندری سفر کی الجھنوں اور پریشانیوں سے ایک حد تک چھٹکارا مل چکا تھا، گرانیٔ طبیعت اور بھوک نہ لگنے کی شکایت رفع ہو چکی تھی، دردسر کا چکّر تو کبھی کا رفو چکّر ہو چکا تھا، اب ہم وقت پر رغبت کے ساتھ کھانا کھاتے اور کافی کافی دیر تک بیٹھ کر محفلیں گرم کرتے۔

صبح آنکھ کھلی تو خلیج عمان اوراس کی ریاستوں سے باہر ہو چکے تھے،اب ہم خلیج عرب کی ایک گمنام مگر معدنی دولت خصوصاً پٹرول سے معمور ریاست قطر کی جانب عازم سفر تھے، جزیرہ نمائے عرب کے یہ علاقے جن سے ہم گذر رہے ہیں گذشتہ دنوں ایک بڑے ملک کے بعض معلوم نامعلوم علاقے کی حیثیت رکھتے تھے،اس لئے پرانی تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا،اوراگر کہیں کچھ ذکر ملتا بھی ہے تو صرف ایک معمولی گاؤں کی حد تک رہتا ہے، غیر مذکور ریاستوں میں خلیج عمان کی ساحلی ریاستوں کا نام سرفہرست آتا ہے، جو غیر ملکی اقتدار خصوصاً انگریزوں کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں ورنہ ان کی حیثیت ایک قبیلۂ عرب اوراس کے سردار کی سی تھی ،مگر انگریزوں نے اپنے مفاداوراقتدار کے پیش نظر اس علاقہ کو ٹکرے ٹکرے کردیا تا کہ اس کی طاقت منتشر ہوجائے جب کہ ان شیوخ کے واسطے سے ان ریاستوں کی زمام بھی اپنے قبضہ میں کررکھی ہے ان ریاستوں کا نام یہ ہے،ابوظبی ،دوبئ،شارقہ ،عجمان،ام القیوین، رأس الخیمہ ،اورفجیرہ،دوسرے طرز کی ریاستیں بھی جن کا ذکر معمولی طور پر تاریخ میں ملتا ہے یہی قطر ہے،مشہور مورّخ اور ماہر بلدان عالم یاقوت حموی نے اپنی کتاب معجم البلدان میں قطر کا ذکر کیا ہے،جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطراس زمانہ میں کوئی مشہور ریاست یا الگ علاقہ نہ تھا۔وہ لکھتا ہے: یہ لفظ قطر ہے،ابن سیرین سے مروی ہے کہ وہ قطرکو مکروہ سمجھتے تھے(قطر ایک قسم کی خرید وفروخت کا نام تھا،جس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ کھجور یا غلہ یا وزن ہونے کے قابل سامان کا کچھ حصہ تو باقاعدہ وزن کیا جاتا اور بقیہ حصّے اسی کے حساب سے بغیر وزن کئے خرید لئے جاتے تھے)ابومُعاذ کی رائے یہ ہے کہ بیع وشراء ہی کا دوسرا نام قطر ہے۔ابوعبید کا کہنا ہے کہ قطر ایک خاص قسم کی چادر ہوتی ہے جس کی تائید اس شعر سے ہوتی ہے۔

کساک الحنظلی کساء صوف

وقطـريـا فـانـت بـه تـفـيـد

بکراوی کے اس قول سے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ: قطری چادریں سرخ رنگ کی دھاری دار ہوتی ہیں، ان میں کافی سختی ہوتی ہے، خالد بن جنبہ کا خیال ہے کہ قطر ایک قسم کے حلہ کا نام ہے جو ایک ایسی جگہ سے بن کر آتا ہے جس کا نام مجھے معلوم نہیں ہے، یہ بہت عمدہ قسم کا ہوتا ہے، میں نے اسے دیکھا ہے یہ لال رنگ کا تھا اور بحرین کی طرف سے آتا ہے، اسی طرح ابو منصور نے بحرین کی تحدید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: عمان اور عقیر کے درمیان ایک دیہات ہے جس کو قطر کہا جاتا ہے، میرا خیال ہے کہ قطری کپڑے اسی دیہات کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ مشہور شاعر جریر نے اپنے ایک شعر میں قطری اونٹیوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ پہلے اس مقام پر اونٹوں کا ایک بڑا بازار لگتا تھا، وہ کہتا ہے:

لـدى قـطـريـات إذا مـاتـغـولـت
بـهـا الـبـيـد غـاولـن الـخـروم الـفـيـافـيـا

اور شاعر نے قطری شتر مرغ کا ذکر اپنے شعر میں یوں کیا ہے:

الادب أدب نـعـائـم قـطـريـة
والآل آل نـحـائـض حـقـب

شتر مرغ کی نسبت یوں کی ہے کہ جزیرہ نمائے قطر خشکی اور ریت سے ملا ہوا ہے جس میں شتر مرغ رہتے ہیں، وہاں سے شکار کر کے قطر لائے جاتے ہیں۔ قطر کے عمان اور بحرین کے درمیان واقع ہونے کی سند میں عبدہ ابن طبیب کا یہ شعر کافی وزن رکھتا ہے:

تـذكـر مـمـاواتـنـا أهـلـكـم
وخـافـوا عـمـان وخـافـوا قـطـر

چونکہ آج کل قطر ایک مشہور ومعروف ریاست ہے کی حیثیت سے زبان زدِ عام ہے اس لئے ایک نجدی مورخ محمد بلہید اپنی کتاب ''**صحیح الاخبار عما فی بلاد العرب من الآثار**'' میں لکھتا ہے: قطر خلیج فارس کا ایک مشہور شہر ہے جس کا حاکم ابن ثانی ہے۔ جریر نے اپنے قصیدہ میں قطریات کا تذکرہ کیا ہے، ان کی مراد عالی قسم کے وہ اونٹ ہیں جو قطر میں بیچے جاتے ہیں جس طرح کہ مہرہ بن حیدان کے علاقہ میں بیچے خریدے جانے اونٹ مہاری کہلاتے ہیں۔

دوپہر کو ہمارا جہاز قطر کی بندرگاہ ام سعید پہونچا، ام سعید سمندر میں نکلا ہوا ریت کا ایک سلسلہ ہے، سامنے صرف بندرگاہ سے متعلق دفاتر کی عمارتیں اور پٹرول کی بڑی بڑی ٹنکیاں نظر آرہی تھیں، باقی حصہ ویران تھا، چونکہ بندرگاہ کی تعمیر نہیں ہوسکی ہے اس لئے جہاز سمندر میں دور ہی کھڑا رہا اور کشتیوں کے ذریعہ سامان اور مسافر منتقل ہوتے رہے، یہاں بھی مسافروں کی کثرت تھی اس لئے رات گئے تک سامان اور مسافر چڑھتے اترتے رہے۔

جزیرہ نمائے قطر کا طول سو میل اور عرض چالیس پینتالیس میل کے درمیان ہے، اس ریاست کا رقبہ تقریباً آٹھ ہزار مربع میل ہے اور آبادی تقریباً بیالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے، ریاست کا عام علاقہ صحرائی اور ناقابل کاشت ہے، بعض علاقے جن میں تھوڑا بہت پانی موجود ہوتا ہے کھجور پیدا کرتے ہیں، یہاں کی آب وہوا خشک اور صحت کے لئے تقریباً غیر موزوں ہے، تیل اور پٹرول کی دریافت سے قبل یہاں کی آمدنی کا عام ذریعہ مچھلی اور موتی کا کاروبار تھا جس کے لئے خصوصی انتظامات ہوا کرتے تھے، چند سال قبل یہاں بھی پٹرول کا انکشاف ہوا اور بعض برطانوی کمپنیوں نے پٹرول نکالنا شروع کردیا۔ پٹرول کی مقدار سالانہ ایک کروڑ ٹن کے لگ بھگ ہے جس سے حکومت کو سالانہ تقریباً چالیس کروڑ روپیہ بطور معاوضہ ملتا ہے، پٹرول کی

دریافت کے بعد یہاں کے باشندوں کی آمدنی کا عام ذریعہ پٹرول اوراس کی کمپنیاں ہی ہوکر رہ گئی ہیں، اگر غیر ملکی ملازموں کی جگہ مقامی باشندے کام کرنے لگیں تو یہ ذریعہ ان کی خوشحالی کے لئے کافی ہوسکتا ہے، یہاں سوار ہونے والے تاجروں اوران کی چلتی پھرتی دوکانوں کے سامانوں سے اندازہ ہوا کہ یہاں بھی دبئی کی طرح سامان تعیش کی بھرمار ہے اور یہاں کے بازار یورپ کے سامانوں سے بھرے پڑے رہتے ہیں، یہاں بھی کسٹم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے، خصوصاً برطانوی منڈی کے مال تو گلی کوچوں تک میں پھیلے ہوتے ہیں، کچھ دنوں پہلے تک یہاں کوئی مدرسہ نہیں تھا لیکن عرب ممالک خصوصاً مصر کی توجہ سے یہاں اب کئی ایک مدرسے ہو چکے ہیں جو کئی ممالک کے علمی وفود اور تعاون کے رہین منت ہیں۔ خود حکومت قطر نے بھی اس سلسلہ میں کافی جدوجہد کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۲، ۶۳ء میں قطر میں بتیس مدرسہ و مدرس کا ایک وفد ساحل عمان کی ریاستوں میں تعلیمی خدمات کے لئے بھیجا تھا اوراس وقت سے لے کر اب تک کویت کے دوش بدوش مل کر قطر کی حکومت ان ریاستوں میں مدارس قائم کر رہی ہے، تعلیمی حالات کا جائزہ لے رہی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں نجدی طرزِ حیات غالب ہے، البتہ نئی نسل پر جدید تہذیب اثر انداز ہو رہی ہے جو نئی تعلیم انگریزوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے، یہاں کے موجودہ حاکم شیخ عبداللہ بن علی آل ثانی ہیں جو ایک دیندار شافعی مسلمان ہیں۔ اپنی جیب خاص سے بہت سی علمی و دینی کتابیں شائع کرا کے اہل علم اور ضرورت مند حضرات میں تقسیم کراتے رہتے ہیں۔

یہاں کا نظام عدالت بھی شرعی ہے، اس ریاست کے چند مشہور شہروں میں دوحہ کا نمبر سب سے پہلے ہے، یہی اس ریاست کا دارالسلطنت ہے، اوراس ریاست کی بڑی آبادی یہیں رہتی ہے، شاہی محلات، سرکاری دفاتر اور ہوائی اڈہ وغیرہ یہیں ہیں، پانی کی ضرورت بعض کنوؤں اور سمندر سے حاصل کردہ میٹھے پانی سے پوری کی جاتی ہے،

آبادی کا اندازہ بیس ہزار کے لگ بھگ ہے، بکری نے اپنی معجم میں دوحہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ عراق کا ایک شہر ہے اور اسی شہر کے اندر تاریخ کے دو مشہور حکم عمرو بن عاصؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ نے اختلاف کیا، حالانکہ عراق میں اس نام کا کوئی شہر نہیں ہے، اختلاف والا شہر دوحہ کہلاتا ہے۔ یہ اصل میں قطر کا دارلسلطنت دوحہ ہی ہے، جس میں تعریف کے لئے ال بڑھا دیا گیا ہے، ام سعید اور دخان بھی یہاں کے قابل ذکر شہر ہیں، یہ دونوں تیل کے مرکز شمار کئے جاتے ہیں، ان دونوں جگہوں میں کمپنی میں کام کرنے والے مزدوروں کی آبادی زیادہ ہے۔ دوحہ کی طرح ام سعید بھی ریاست کے مشرقی ساحل پر واقع ہے جو دوحہ سے بیس میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع ہے، البتہ دخان ریاست کے مغربی ساحل پر آباد ہے، یہاں سے پندرہ بیس میل کے بعد مغرب میں بحرین کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، زبارہ اور بیضاء بھی اس ریاست کے قابل ذکر شہر ہیں۔

مغرب اور عشاء کے درمیان جہاز ام سعید سے روانہ ہوا، چونکہ سامنے والا اسٹیشن بحرین تھا اور وہی ہماری پہلی منزل تھی، اس لئے سامان کی ترتیب وتیاری بھی جاری ہوگئی، جہاز کے عملہ اور عام سفر کرنے والے مسافروں سے معلوم ہوا کہ جہاز گزشتہ سال کی طرح اب کے بھی صبح سویرے آٹھ بجے کے قریب بحرین کی نئی تعمیر شدہ اور خوبصورت بندرگاہ سلیمان پر لگنے والا ہے۔ اس سفر کی خلیج فارس میں آخری رات سمجھ کر دیر تک اوپر بیٹھے رہے، جگہ جگہ روشنی اور جگمگاہٹ سے قطر کے شہروں اور آبادیوں کا اندازہ ہوتا رہا۔ خیال آتے ہی کہ کل جہاز سے اترنے اور کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گزرنے میں کافی دیر لگے گی اور آرام کا موقع شاید نہ مل سکے گا اپنی اپنی جگہ آکر سونے کی کوشش کرنے لگے، کچھ دیر کے بعد کامیابی ہوئی اور ہم سو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

۲۹/۹/۶۴ء سہ شنبہ

حسب عادت آج صبح سویرے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز میں ایک اچھی خاصی چہل پہل نظر آئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا جہاز بحرین میں خالی ہوجائے گا، ہر ایک بحرینی مسافر اپنے اپنے سامان کی تیاری اور نہانے دھونے کیلئے موقع کی تلاش میں سرگرداں تھا، ہم نے نماز کے فوراً بعد ہی جا کر ناشتہ وغیرہ کرلیا اور سامان درست کر کے جہاز کے عرشہ پر آگئے، سورج جوں جوں چڑھتا جاتا بحرین کا علاقہ اور اس کی عمارتیں بھی قریب معلوم ہوتیں۔ صبح کا وقت، سورج نکلنے کا منظر اور اسی کے ساتھ معالم بحرین کا طلوع دیکھنے سے تعلق رکھتا، اب جہاز کی رفتار کافی سست ہوچکی تھی اور سامنے سمندر میں پھیلی پل نما لمبی گودی پر لگے ہوئے جہاز صاف نظر آرہے تھے، صبح کے تقریباً آٹھ بجے جہاز بندرگاہ پر لگا اور اترنے والے مسافروں میں حرکت شروع ہوئی۔ سب سے پہلے قلی اندر داخل ہوئے اور انھوں نے سامان اُٹھا اُٹھا کر ٹرکوں پر لادنا شروع کیا اور اسی کے ساتھ مسافر بھی اُترنے لگے، چونکہ کسٹم آفس وہاں سے کافی دور تھا اور مسافروں کو لیجانے کے لئے صرف ایک بے تکی پرانی بس تھی اس لئے مسافروں کو ترتیب سے لائن لگا کر اترنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے دیر لگ گئی، ہم لوگ تقریباً دس بجے کسٹم آفس پہونچے، یہاں تقریباً سبھی جمع ہوچکے تھے چونکہ ہمارے ہم سفر آج ہی بذریعہ لانچ الخبر نکل جانا چاہتے تھے، اس لئے وہ جلدی میں تھے کہ کسٹم وغیرہ کے مراحل سے فارغ ہوکر فوراً ساحل کا رُخ کریں جہاں سے الخبر جانے کے لئے لانچ ملتی، بحرین اور الخبر (سعودی عرب کا پہلا شہر اور مقامی بندرگاہ) کے درمیان سمندر کا فاصلہ لانچ سے صرف چار پانچ گھنٹہ کا ہے اور لانچ کا کرایہ عام طور پر پانچ روپیہ ہوتا ہے۔ ہیلتھ سرٹیفکیٹ اور داخلہ فارم وغیرہ کی خانہ پُری کے بعد تقریباً بارہ بجے کسٹم پر پہونچے ہمارے سامان یہاں پہلے سے بنچوں پر رکھے تھے، کسٹم آفیسر ایک ہنس مکھ

شریف نوجوان تھا، اس نے ہمارے پہلے ساتھی سے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہم تو طالب علم ہیں ہمارے پاس کیا ہوسکتا ہے؟ دیکھ لیجئے، اس نے پوچھا قرآن وحدیث کے طالب علم؟ ساتھی جواب دیا جی ہاں! قرآن وحدیث اورفقہ وتفسیر کے طالب علم اور وہ بھی مدینہ منورہ میں، یہ سن کر وہ بجائے وہ کسٹم کرنے کے دیر تک دعائیں دیتا رہا اور بغیر سامان کھولے دیکھے ہر ایک پر چاک لگا تا رہا (وہ اگر کھول کر دیکھتا تو بھی اسے چاک لگانا ہی ہاتھ لگتا) اس کے بعد ہمارا جو بھی ساتھی آگے بڑھتا اس سے پوچھتا أنت کمان (تم بھی طالب علم ہو؟) ساتھیوں کو اس کے جواب میں صرف یا یـوه (ہاں) کہنا پڑتا اور اس کے تمام سامان پر وہ چاک لگا تا چلا جاتا، اس طرح ہم چند منٹ میں کے بعد کسٹم سے باہر آگئے اور سامان ٹیکسیوں میں لاد کر رحیمہ ہوٹل منامہ روانہ ہوئے چونکہ یہاں ٹیکسیوں کی بھر مار ہے اور عام طور پر بالکل نئی اور برق رو ہوتی ہیں اس لئے دیکھتے ہی دیکھتے رحیمہ ہوٹل پہونچ گئے، رحیمہ ہوٹل کئی مرتبہ کے سفر کی وجہ سے ایک مانوس قیام گاہ بن چکا ہے، اس لئے سیدھے وہیں کا رُخ ہوتا ہے، منیجر سے جاتے ہی والد صاحب کے خط کے متعلق دریافت کیا اس نے بتلایا کہ ایک خط ہمارے پاس موجود ہے۔ چونکہ برادرم ظفر مسعود کے آپریشن کی وجہ سے ایک گونہ اُلجھن تھی اس لئے آتے وقت والد صاحب نے یقین دلایا تھا کہ جاؤ میں کل پرسوں رحیمہ ہوٹل کے پتہ پر بحرین ایک خط روانہ کروں گا اور جو کیفیت ہوگی تحریر کروں گا۔ خط پڑھ کر اطمینان وسکون ہوا، سامان رکھ کر سب سے پہلے غسل کیا گیا، پھر کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کیا گیا، عصر کی نماز پڑھ کر سب سے پہلے طیران خلیج کے دفتر پہونچے جہاں اپنے آنے کی اطلاع اور بعض ساتھیوں کے ٹکٹ پر تاریخ کی تعیین کرائی گئی چونکہ بحرین سے ظہران تک کے ہوائی جہاز کا یہ ٹکٹ بمبئی ہی سے خریدا گیا تھا اس لئے یہاں آکر مزید معلومات وتحقیق کرنی پڑی کمپنی والوں نے بتلایا کہ آپ

لوگ کل دو پہر کو دو بجے (مقامی ٹائم) تک ہوائی اڈہ پہونچ جایئے تین بجے جہاز روانہ ہوگا، وہاں سے نکل کر ہم لوگ ذرا بازار کی طرف چل پڑے چونکہ بعض ساتھیوں نے اس راستہ سے ابھی تک سفر نہیں کیا تھا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس قلیل مدت میں بازار ہی کا کچھ حصہ دیکھ لیں، بعض ساتھیوں کو کچھ ضروری سامان بھی اپنے ذاتی استعمال کے لئے خریدنے ضروری تھے، اس طرح مغرب کے وقت تک بازار کے علاقہ میں گھومتے رہے دوکانوں کے دھڑادھڑ بند ہونے کی آواز اور مسلح پولیس کی پہرہ داری نے ہمیں فوراً ہی ہوٹل لوٹنے پر مجبور کردیا، یہاں مغرب بعد فوراً دوکانیں بند ہوجاتی ہیں اور پورے بازار میں مسلح پولیس کا سخت پہرہ پڑنے لگتا ہے۔

۱۹۶۰ء میں ڈنمارک کے مشہور عجائب گھر اور اس کا ایک وفد بحرین میں آثار قدیمہ کی تلاش کے لئے بھیجا گیا تھا اس وفد نے اپنی محنت اور کوشش سے بہت کچھ اہم تاریخی معلومات فراہم کیں، اس وفد کے صدر نے بحرین میں اپنی کامیابی کی رپورٹ ان الفاظ میں پیش کی ''بحرین میں کھدائی کے درمیان اس وفد کو جو آثار ملے ہیں وہ اس معنی کر کے بہت اہم ہیں کہ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحرین چار یا پانچ ہزار برس قبل انسانی تہذیب کا ایک بہت بڑا مرکز تھا'' انھیں حوصلہ افزا معلومات کی فراہمی کی بناء پر وفد نے بحرین کے علاوہ کویت، قطر اور ابوظبی میں بھی کھدائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ظہور اسلام کے وقت بحرین ایک بہت مضبوط طاقتور اور لمبی چوڑی حکومت تھی، چونکہ یہ حکومت بحر ہند کے ساحل پر واقع تھی اور ہندوستان، بصرہ اور افریقہ کے ملکوں سے براہ راست تجارت ہوتی تھی اس لئے اقتصادی اعتبار سے بھی بہت اہمیت رکھتی تھی جن کی وجہ سے یہاں مختلف تاجر پیشہ تھے، ان تاجر پیشہ قوموں میں ہندوستانی اور فارسیوں کی اکثریت تھی، مذہب کے اعتبار سے آپ انھیں مجوس، یہود ونصاریٰ اور

آتش پرست میں تقسیم کرسکتے ہیں، یہاں کے اصل عرب باشندوں میں عبد قیس، بکر بن وائل اور تمیم کی ایک بڑی تعداد موجود تھی سیاسی حیثیت سے یہ حکومت کسرائے فارس کے ماتحت تھی جس کی جانب سے یہاں کے حکام کا تقرر ہوتا تھا، بعثت کے وقت فارس کی طرف مقرر کردہ حاکم منذر بن ساوی ایک تمیمی عرب تھا اس کے دوش بحرین کے ایک علاقہ ہجر کا حاکم سیبخت مرزبان ایک فارسی تھا ۸ھ میں رسول اللہ ﷺ نے علاء بن عبداللہ بن حماد حضرمی حلیف بنی عبد شمس کو بحرین بھیجا تھا تاکہ وہ جا کر اہل بحرین کو اسلام کی دعوت دیں اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان سے جزیہ طلب کریں ساتھ ہی آپ نے حاکم بحرین منذر بن ساوی اور حاکم ہجر سیبخت مرزبان کو ایک ایک مکتوب بھی تحریر فرمایا جس میں ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی بصورت دیگر انھیں جزیہ دینے کے لئے کہا گیا تھا، اس کا اثر بہت اچھا ہوا ان دونوں کے ساتھ ساتھ بحرین کے تمام عرب اور عجمیوں کی ایک جماعت مسلمان ہوگئی البتہ کھیتی باڑی اور باغات والے مجوس، یہود اور نصاریٰ کی اکثریت نے جزیہ دیکر صلح کرلی اور ایک صلح نامہ لکھ کر جانبین سے دستخط لی گئی، یہ صلح نامہ زراعت سے متعلق تھا جس کے الفاظ یہ تھے: **هذا ما صلح عليه العلاء بن الحضرمی اهل البحرين صالحهم علی ان يكفونا العمل ويقاسمونا الثمر فمن لايفی بهذا فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين**

علاء بن حضرمی نے اہل بحرین سے اس شرط پر صلح کی ہے کہ وہ اپنی جائیداد سے مقررہ حصہ بانٹ کردے دیا کریں، جو اس پر پابندی نہ کرے اس پر اللہ، ملائکہ اور عوام کی لعنت ہو، شخصی جزیہ کے سلسلہ میں انھوں نے ہر بالغ سے ایک دینار لینا طے کیا، یاقوت حموی نے قتادہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ بحرین میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ کچھ تو مسلمان ہوگئے اور بعض نے علاء بن حضرمی سے غلہ اور کھجور کی پیداوار میں صلح

کرلی، اسی طرح سعید بن مسیّب کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے، عمر رضی اللہ عنہ نے فارس کے مجوس سے، اور عثمان رضی اللہ عنہ نے بربر سے جزیہ وصول کیا، حضرت علاء نے بحرین کے جزیہ وغیرہ کا مال وصول کر کے اسّی ہزار کی رقم مدینہ منوّرہ بھیجی اس سے پہلے اتنی کثیر مقدار میں کہیں سے مال نہیں آیا تھا آپ نے اس مال میں سے اپنے چچا حضرت عباس کو بھی عطا کیا تھا، یاقوت حموی کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علاء کو معزول کر کے ان کی جگہ ابان بن سعید کو بحرین کا گورنر مقرر فرمایا لیکن رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب ابان مدینہ منورہ تشریف لائے تو بحرین والوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خواہش کی کہ حضرت علاء کو دوبارہ بحرین کا گورنر مقرر کیا جائے، انھوں نے ان کی یہ گذارش قبول کی اور حضرت علاء بحرین کے دوبارہ گورنر بنادیئے گئے اور آخیر عمر تک بحرین کے گورنر رہے ہیں، ۲۰ھ میں ان کی وفات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ ابوہریرہ دوسی رضی اللہ عنہ کو بحرین کا گورنر مقرر کیا۔

اہل بحرین نے جس طرح اسلام لانے میں سبقت کی اسی طرح ارتداد کے میدان میں بھی بڑی گرمی دکھلائی، ہوا یوں کہ جس ماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اسی مہینہ حاکم بحرین منذر نے بھی وفات پائی اس کے مرتے ہی ارتداد کی لہر نے پورے بحرین کو اپنی گود میں لے لیا یہاں تک کہ حضرت علاء کو مجبوراً بحرین چھوڑ کر وہاں سے کھسک جانا پڑا، البتہ بنی عبد قیس کا ایک فرزندِ توحید جارود بن معلیٰ عبدی جس نے مدینہ منورہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی اور اسلام کی تعلیمات سے آگاہی حاصل کی تھی تن تنہا ارتداد کی خونخوار موجوں کے سامنے سینہ سپر رہا اور اس عالم میں بھی وہ اپنی قوم میں جا کر ارتداد کے خلاف سرگرمی دکھلاتا رہا اس نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے ارتداد کی وجہ دریافت کیا اور ان سے

پوچھا کہ کیا اس سے پہلے انبیاء ورسل نہیں آئے؟ اوران کا انجام کیا ہوا؟ سب نے کہا وہ اس دارفانی سے کوچ کر گئے، حضرت جارود نے فرمایا:۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک رسول ایک نبی تھے وہ بھی اس دارفانی سے کوچ کر گئے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، یہ سن کران کی قوم نے بھی یہ شہادت دہرائی اور اپنے ارتداد سے تائب ہوئی، ادھر بحرین کے مرتدین کی ایک بڑی جمعیت بنی قیس ابن ثعلبہ کے ایک فرد حطم (شریح بن ضبیعہ) کی قیادت میں اسلام کے خلاف کمربستہ ہوگئی اور اس نے اپنے طور پر مرحوم حاکم بحرین منذر کے پوتے منذر بن نعمان کو بحرین کا حاکم مقرر کر دیا جس کا نام غرور تھا، ساتھ ہی یہ بھی کوشش جاری رکھی کہ حضرت جارود کو اسلام سے برگشتہ کر کے اپنے ساتھ ملالیں لیکن انھیں کامیابی نہ ہوسکی، حطم اپنا لشکر لیکر قطیف اور ہجر پہونچا اور وہاں کے لوگوں سے مدد طلب کی اور ان دونوں مقام کے غیر مسلموں نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا ان سب کو لیکر حطم نے حضرت جارود اور ان کے ہمراہ مسلمانوں کا قطیف میں محاصرہ کرلیا اور محاصرہ اس قدر سخت قسم کا تھا کہ مسلمان بھوک کی وجہ سے بیتاب ہوگئے اور موت کا بھیانک جبڑہ ان کی نظروں کے سامنے پھیلا ہوا نظر آنے لگا مگر اسلام کے مقابلہ میں یہ مصیبت کوئی بڑی چیز نہ تھی جو اسلام سے دست بردار ہوجاتے، اسی عالم میں حضرت علاء مسلمانوں کا ایک بڑا لشکر لیکر مرتدین کی سرکوبی کے لئے آپہونچے اوران مسلمانوں کی جان بچائی اور مرتدوں کی سرکوبی کی مزید مدد کے لئے انھوں نے حضرت ابوبکر کو مدینہ لکھا، حضرت ابوبکر نے حضرت خالد بن ولید کو ان کی مدد کے لئے لکھا، جو ان دنوں وہیں یمامہ کی مہم میں مصروف تھے۔

یہ بحرین جس کا ذکر ہوتا چلا آرہا ہے آج کے بحرین سے مختلف تھا بالفاظ دیگر سعودی عرب کا تقریباً وہ تمام علاقہ جو منطقۂ شرقیہ کہلاتا ہے اور جس میں پٹرول

اور تیل کا دریا بہتا ہے عہد صحابہ کے بحرین کا حصہ تھا، بلکہ آج کے مشہور سعودی منطقہ احساء پر بحرین کا اطلاق ہوتا تھا چنانچہ قدیم مورخین بحرین کے مشہور شہروں کا تذکرہ کرتے ہیں یا بحرین کی تحدید کرتے ہیں تو آج کے سعودی عرب کے منطقہ شرقیہ کے اکثر و بیشتر قدیم شہروں اور علاقوں کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً مشہور جغرافیہ نویس ابن فرداز بہ متوفی ۳۰۰ھ نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب المسالك والممالك میں بحرین کے مشہور شہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ بحرین کے مشہور شہر اور دیہات یہ ہیں خط ،قطیف ، آرہ، ہجر ،فردق ،بینونہ ،مشقر ،زرارہ، جواثاء ،تابوز ،دارین، غابہ،شنون،یاقوت حموی نے ابوعبید کے حوالہ سے لکھا ہے:۔ بحرین کا اطلاق خط، قطیف ،آرہ،ہجر، بینونہ،زرارہ، جواثاء،سابور،دارین،اور غابہ پر ہوتا ہے صفا اور مشقر یہ ہجر کے دو قصبے ہیں، خط بحرین کا وہ مشہور شہر ہے جس کی طرف خطی نیزہ کی نسبت کی جاتی ہے قطیف ارتداد کے وقت مسلمانوں کی پناہگاہ بنا ہوا تھا اور بعد میں مشہور غارت گر جماعت قرامطہ کی قیام گاہ بنا، ہجر بعض روایتوں کی بناء پر بحرین کا دوسرا نام ہے، جواثا وہ مشہور جگہ ہے جس کا ذکر بخاری وغیرہ نے جمعہ کے سلسلہ میں کیا ہے، دارین مرتدین کی قیام گاہ تھا، حضرت علاء نے مسلمانوں کا ایک لشکر لے کر معجزہ نما طور پر سمندر پار کر کے ان کو رام کیا، یہ ہندوستان وغیرہ سے آنے والے جہازوں کی بندرگاہ تھا یہاں کا مشک مشہور ہے۔........................

خلیج عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح انگریزوں نے بحرین پر بھی اپنا قبضہ کرلیا لیکن سعودی حکومت سے ایک معاہدہ کے تحت اس نے بحرین کا یہ علاقہ سعودی حکومت کے سپرد کر دیا اس کے بعد سے یہ علاقے سعودی عرب کا جزو بن گئے۔

موجودہ بحرین جو چھوٹے چھوٹے تقریباً سولہ جزیروں کا مجموعہ ہے خلیج عرب کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور چاروں طرف سمندر سے گھرا ہوا ہے، مغرب میں

چند میل عریض سمندر کے بعد احساء کا ساحل ہے اور جنوب میں جزیرہ نمائے قطر واقع ہے، موجودہ بحرین کا کل رقبہ ۲۳۱ مربع میل ہے، عرب لیگ کی تازہ رپورٹ کے پیش نظر بحرین کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے جن میں سے آدھے سے زیادہ غیر ملکی ہیں جن میں ایرانیوں کی اکثریت ہے، بقیہ ہندو پاک اور برطانیہ کی نوآبادیات کے باشندے ہیں مسلمانوں میں تقریباً نصف شیعہ نصف سنّی ہیں۔

پٹرول سے بحرین کو سالانہ ایک کروڑ پونڈ نفع ملتا ہے جب کہ قطر کو سالانہ دو کروڑ پونڈ بطور معاوضہ ملتا ہے،، بحرین ہی خلیج عرب کی وہ سب سے پہلی حکومت ہے جہاں پٹرول دریافت ہوا، مشہور ہے کہ بحرین میں سب سے پہلے عوالی کے علاقہ میں ۱۹۳۱ء میں دریافت ہوا، اس دریافت کے بعد ایک انجینئر نے یہاں کے ایک ٹیلہ پر کھڑے ہو کر سعودی عرب کے سامنے والے ریگستان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر عوالی میں پٹرول موجود ہے تو یقیناً اس ریگستان میں بھی اس کی ایک بڑی تعداد موجود ہوگی، اس انکشاف کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد سعودی عرب کے اس ریگستان سے پٹرول کے چشمے ابل پڑے،، بحرین میں پٹرول کی پیداوار کا اندازہ تقریباً پچیس لاکھ ٹن سالانہ ہے، یہاں پٹرول صاف کرنے کا ایک بڑا کارخانہ بھی ہے جو مشرق میں تیسرے نمبر کا پٹرول صاف کرنے کا کارخانہ شمار کیا جاتا ہے، سعودی عرب کے پٹرول کا ایک بڑا حصہ بھی یہیں صاف کیا جاتا ہے، تیل کی دریافت سے قبل یہاں کے باشندوں کا ذریعۂ معاش سمندر سے موتی نکالنا تھا اور اس معاملہ میں بحرین خلیج عرب کی تمام حکومتوں سے آگے تھا یہاں روزانہ اس کام کے لئے تقریباً ایک ہزار کشتیاں استعمال ہوتی تھیں جن کے لئے بیس ہزار افراد کافی ہوتے تھے لیکن اب یہ کاروبار بہت سست پڑ گیا ہے حتیٰ کہ دس بارہ کشتیاں سال بھر کے لئے اس کام کے لئے کافی ہونے لگیں، بحرین سے برآمد کئے جانے والی اشیاء میں پٹرول اور موتی کے علاوہ

سیپ، خشک مچھلی، اون، چمڑے، ترکاریاں اور کھجور قابل ذکر ہیں۔

حکومت بحرین نے اپنی سابقہ تجارتی روایت کو باقی رکھنے اور اسے عالمی سطح پر لانے کے لئے ایک لمبا چوڑا بندرگاہ تعمیر کیا ہے، یہ بندرگاہ ''پورٹ سلمان'' کے نام سے مشہور ہے اس بندرگاہ پر بیک وقت چھ بڑے بڑے جہاز ٹھہر سکتے ہیں، خلیج عرب کے بندرگاہوں میں کویت کے بعد بحرین ہی کا بندرگاہ تعمیر شدہ ہے، جہازوں کیلئے پورٹ کی تعمیر کی وجہ سے تجارتی سامان کی درآمد برآمد میں آسانی ہوگئی ہے اور چونکہ بحرین فری پورٹ ہے اس لئے یہاں کی تجارت دوسری جگہوں کی بہ نسبت بڑے اعلی پیمانہ پر چل رہی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے ملک بحرین میں تجارتی دلچسپی لے رہے ہیں، جس کا اندازہ آپ کو ان ملکوں کی نمائشی دوکانوں سے ہوسکتا ہے جو منامہ کے بازاروں میں پھیلی پڑی ہیں، اسی پورٹ کے پہلو بہ پہلو محرق میں حکومت بحرین نے ایک انٹرنیشنل ایرپورٹ بھی تعمیر کیا ہے، یہ عالمی مطار بیک وقت کئی عالمی پرواز کرنے والے بڑے طیاروں کا استقبال کرسکتا ہے، محرق کے لمبے چوڑے ایریا میں پھیلا ہوا یہ عالمی مطار ہر قسم کی جدید اور برقی مشینوں سے مزین اور ہر قسم کے آرام دہ سامان اور عمارتوں سے آراستہ ہے،، بحرین اور خلیج عرب کی دوسری تمام ریاستوں میں سوائے کویت کے جس نے جلد ہی اپنا سکہ جاری کرلیا ہے ہندوستانی روپیہ چلتا ہے، یہ ہندوستانی روپیہ ہندوستان میں گلف روپیہ کے نام سے مشہور ہے عرب لیگ کے وفد نے اپنی حالیہ رپورٹ میں بحرین کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہ عجیب بات ہے کہ بحرین ایک خاص عرب ملک ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حکومت عربستانی، اقتدار انگلستانی ،سکّہ ہندوستانی اور دولت ایرانی ہے،. بحرین میں دنیا کے مختلف ملکوں کے سکوں کے تبادلہ کے لئے آزاد بازار بھی ہے۔

بحرین میں دینی تعلیم کا اچھا خاصا چرچا ہے کیوں کہ حکومت نے تمام تعلیمی

مراحل کو فیس وغیرہ سے بے نیاز کر دیا ہے، لڑکے لڑکیوں کے ابتدائی مدارس کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے، اسی طرح ثانوی مدارس کی تعداد بھی تیس سے متجاوز ہے، ایک مذہبی مدرسہ اور ایک صنعتی کالج بھی ہے، صنعتی کالج میں داخلہ کی شرط صرف ابتدائی سند کا ہونا ہے، جس کے بعض طالب علم اپنی خواہش کے مطابق جس شعبہ میں چاہیں داخلہ لے سکتا ہیں، حکومت برابر اس کوشش میں رہا کرتی ہے کہ مدارس کی تعداد زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے تاکہ یہاں کے ہر بچہ کو تعلیمی سہولت مہیّا ہو سکے اور کوئی جاہل نہ رہ سکے، حکومت بحرین ان طالب علموں کی اونچی تعلیم کے لئے دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں اپنے خرچہ پر بھیجتی ہے، جو زیادہ مصر، لبنان، عراق، ہندوستان، امریکہ اور جرمنی وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کا تمام خرچہ حکومت برداشت کرتی ہے، بحرین میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۶۰ء میں ۱۲۳۶۴ر طالب علم اور ۵۴۶۷ر طالبہ پر مشتمل تھی، اسی طرح مدرسوں کی تعداد ۴۸۰ر اور مدرسات کی ۲۰۲ر تھی، ان کے علاوہ مصر وغیرہ کے تعلیمی بعثات جو اساتذہ کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل ہوتے ہیں تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں۔

۶۲۔۶۳ء کے تعلیمی سال میں حکومت بحرین نے خلیج عمان کی ریاستوں میں تعلیم عام کرنے کیلئے جو اساتذہ بھیجے تھے ان کی تعداد دس تھی، بحرین صحافتی دنیا میں قدم رکھ چکا ہے یہاں کا سرکاری ہفتہ وار تو زیادہ تر احکام وقوانین اور سرکاری اعلانات واشتہارات پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح ہفتہ وار ''الاذاعة'' بھی ریڈیو پروگرام اور اس سے متعلق اخبار و مضامین پر ہی مشتمل ہوتا ہے، ''خلیج'' کے نام سے ایک روزنامہ بھی نکلتا ہے جس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے، اسی طرح پٹرول کمپنی کی طرف سے ایک ہفتہ وار ''النجمة'' نکلتا ہے اس کا بھی انگریزی ایڈیشن شائع ہوتا ہے، گویا مجموعی حیثیت سے صحافت کی جانب آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا ہے۔

بحرین میں تعلیم کی طرح علاج معالجہ کا بھی سرکاری طور پر مفت انتظام ہے یہاں کے ہسپتالوں میں مریضوں کو ہر طرح کی دوا مفت دی جاتی ہے اوران کو ہر طرح کا آرام پہونچایا جاتا ہے بوقت ضرورت عام حالات میں مریضوں کو دوسرے ملک کے ہسپتالوں میں بھی منتقل کیا جاتا ہے جس کے تمام اخراجات یہاں کی حکومت برداشت کرتی ہے، بحرین کے بڑے بڑے شہروں میں ہسپتال اور دیہاتوں میں شفا خانے عام ہیں، بحرین کی راجدھانی منامہ میں عورتوں کا ایک ہسپتال تعمیر کیا گیا ہے جس میں ۱۴۶ چارپائی کی گنجائش ہے۔

بحرین کی حکومت آل خلیفہ کے ہاتھ میں ہے جو انگریزوں کے زیر سایہ رہ کر حکومت کرتے ہیں داخلی معاملات میں توانھیں تقریباً مکمل خودمختاری ہوتی ہے مگر خارجی معاملات میں تقریباً بے بس ہوتے ہیں، موجودہ حاکم کا نام شیخ عیسیٰ بن سلمان آل خلیفہ ہے، یہ شخص نہایت سادہ مسلمان ہے، گذشتہ سفر بحرین میں جب ایک ہفتہ بحرین رکنا پڑا تھا تو جمعہ کے دن منامہ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی ہم وقت سے کچھ پہلے ہی جامع مسجد پہونچ گئے تھے اور امام کے قریب جا کر پہلی صف میں بیٹھ گئے، تھوڑی دیر بعد دیکھتے ہیں کہ ایک شخص خالص عربی لباس میں ملبوس ایک تلوار لٹکائے مصلیٰ پر آکر بیٹھا، اس کے ساتھ صرف ایک شخص تھا اسی نے جمعہ کی نماز پڑھائی، نماز کے بعد دیکھا کہ لوگ امام سے بڑھ بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کررہے ہیں، استفسار پر معلوم ہوا کہ یہی حاکم بحرین ہیں ان کی اس سادگی پر ہمیں بڑا تعجب اوراس سے زیادہ خوشی ہوئی کہ چلو بعض اسلامی روایات پر تو یہ لوگ سختی سے ابھی تک قائم ہیں، یہاں کا عدالتی نظام بھی شرعی ہے، جامعہ ازہر کے ایک نوعمر فارغ یہاں کے عدالتی اور شرعی جج ہیں، اسی سفر میں ایک صبح تفریحاً جج صاحب کے یہاں چلے گئے دیکھا تو ان کے ضعیف العمر والد محترم کے اردگرد صبح سویرے

بہت سے بڈھے طالب علم بیٹھے کسی فقہی کتاب کا درس لے رہے ہیں، تھوڑی دیر بعد مجلس درس وتدریس ختم ہوئی قہوہ کا دور چلا اور پھر محفل برخواست ہوگئی، یہ محفل حقیقی مساوات اور اسلامی تعلیمات کا سچا نمونہ تھی۔

بحرین میں پانی کی کمی کو دور کرنے کیلئے مشین کے ذریعہ سمندر کا کھارا پانی میٹھے پانی میں تحلیل کیا جاتا ہے، یہ پانی نہانے دھونے اور پینے کھانے کے علاوہ زراعت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں خصوصاً منامہ کے جزیرہ میں میٹھے پانی کے کنویں بہت کم ہیں، گذشتہ سفر میں ایک دن شام کو جزیرہ منامہ کے آخری حصہ کی طرف نکل گئے شہر کی آبادی ختم ہوتے ہی کھجور کے باغات اور مختلف قسم کے زراعتی فارم نظر آئے جو جزیرہ کے آخر تک پھیلے ہوئے تھے، اور دیہاتوں کی آبادی یہاں کے پرانے طرز کی ہے البتہ ان جھونپڑی نما مکانوں کے اوپر ٹیلی ویژن کا ایریل کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا، بحرین کے آس پاس سمندر کے اندر میٹھے پانی کے چشمے ابلتے رہتے ہیں ضرورت مند حضرات جا کر وہاں سے میٹھا پانی یوں لاتے ہیں کہ خالی مشک لے کر سمندر کے اندر غوطہ لگاتے ہیں اور مشک کو چشمہ کے دہانے سے لگا دیتے ہیں اور پھر مشک بھر جانے کے بعد اوپر چلے آتے ہیں یا کبھی کبھی نلکیوں کے ذریعہ اپنی اپنی مشک میں بھر لیتے ہیں اس قسم کا سب سے بڑا چشمہ جزیرہ سترہ کے سمندر میں ہے۔

موجودہ بحرین کم وبیش سولہ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے آج کل کی اصطلاح میں بحرین خود جزیرہ منامہ کا دوسرا نام بن گیا ہے اور اسی کے نام پر پوری حکومت کا نام بحرین ہے، اسی لئے یہاں کے حاکم کو حاکم بحرین وحاکم ملحقات بحرین دونوں کہا جاتا ہے، ان جزیروں میں قابل ذکر جزیرے یہ ہیں، اوال، محرق، سترہ، ام لعسان، حوار، رمض، وجدہ، بنی صالح، جد، البدیع، الجزیرہ، اوال جس کا دوسرا نام منامہ ہے گذشتہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں عرب کے مشہور قبیلہ بکر بن وائل اور

تغلب بن وائل کا ایک بت تھا جس کا نام اوال تھا جس کی وجہ سے یہ جزیرہ ایک تیرتھ گاہ کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھا، چونکہ بحرین کا یہ جزیرہ دوسرے جزیروں کی بہ نسبت زیادہ شاداب ہے، اس لئے اس کی شادابی اور زرخیزی کے سبب منعمہ نام پڑ گیا جو بعد میں تحریف ہو کر منامہ بن گیا، یہ بھی ممکن ہے کہ حکام وامراء کے محلّات اور بنگلہ جات کی وجہ سے اسے منامہ (خواب گاہ) کہتے ہوں، اس جزیرہ کا طول تقریباً تیس اور عرض دس کے لگ بھگ ہے، محرق بحرین کا دوسرے نمبر کا شہر اور جزیرہ ہے جو منامہ سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ایک مضبوط سڑک کے ذریعہ دونوں کو ملایا گیا ہے اسی جزیرہ میں بحرین کا عالمی ایرپورٹ واقع ہے، محرق کے معنی مرگھٹ کے ہیں، یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ محرق مسلمان کے علاقہ میں بکر بن وائل اور بنی ربیعہ کے ایک بت کا نام تھا بنی ربیعہ کے ہر محلّہ میں اس بت کا ایک لڑکا بنا کر رکھا جاتا تھا چنانچہ منزہ میں بلیح بن محرق نام کا بت تھا اور عمرو بن غفیلہ محرق ہی کے ایک لڑکے کا نام تھا، اس بت خانہ کے پجاری عجمیوں کی کالی اولاد ہوتی تھی، اس کے بعد جزیرہ سترہ واقع ہے جس میں پٹرول کے لئے بندرگاہ ہے اس کے شمال میں جزیرہ بنی صالح ہے جہاں کھجور کے باغات ہیں، بحرین کے مغربی جانب ایک پتھریلا جزیرہ ہے جہاں بحرین کا جیل خانہ ہے، پھر جزیرہ ام لعسان ہے (آرام کدہ) یہاں ہرن اور خرگوش شکار کھیلنے کی حد تک پائے جاتے ہیں، اس کے بعد جزیرہ البدیع ہے جہاں زراعت کی کوشش ہو رہی ہے پھر الجزیرہ نامی جزیرہ ہے، شہری نظام کے اعتبار سے بحرین کے مشہور شہروں کے نام یہ ہیں، منامہ، محرق، جد، رقاع، عوالی، وسط، مدینہ، عریف وغیرہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

٦٤/٩/٣٠ء:۔ چہار شنبہ

چونکہ رات مغرب کے بعد فوراً بازار سے لوٹ آنا پڑا تھا اس لئے کھانا

کھا کر کچھ دیر سامان وغیرہ درست کیا گیا پھر بعض ساتھی سو گئے بعض ہوٹل کے ٹیلی ویژن ہال میں جا کر بیٹھ گئے، بحرین میں ٹیلی ویژن عام ہے یہاں سے بحرین کے علاوہ ظہران (سعودی عرب) اور کویت کے اسٹیشن بھی دیکھے جاتے ہیں، یہاں لوگ عام طور پر اپنے رات کے اوقات یا تو ٹیلی ویژنوں کے پاس بیٹھ کر گذارتے ہیں یا سینما ہالوں میں جہاں عام طور پر عربی، اردو، انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جس کے لئے پانچ ٹاکیزیں ہیں یا اونچے طبقہ کے لوگ مختلف کلبوں میں جا کر وقت گذاری کرتے ہیں، ٹیلی ویژن کی افراطی اور بہتات کے سبب ریڈیو بہت کم اور صرف دن میں استعمال ہوتے ہیں۔

تقریباً ایک ہفتہ کے مسلسل بحری سفر اور جہاز جیسی گندی اور تنگ فضا سے نکلنے اور آرام کرنے کے بعد صبح آنکھ کھلی تو طبیعت میں ایک قسم کا انبساط اور سرور محسوس ہوا، رحیمہ ہوٹل کے سامنے والے سمندر اور قریبی جزیروں میں کھجور کے باغات اور قدرتی مناظر نے اور کام کیا، نتیجۃً میں تن تنہا ہی تفریح کے لئے نکل کھڑا ہوا، نیچے بس اسٹنڈ تھا وہاں جا کر دیکھا تو پیچھے سے مولوی امیر احمد صاحب بھاگے چلے آرہے ہیں ہم دونوں نے بس کا انتظار کئے بغیر جزیرہ محرق کا رخ کیا راستہ میں بس مل گئی اور چند منٹ میں ہم محرق کے بس اسٹنڈ پر تھے وہاں ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا گیا اور بغیر دیکھے بھالے راستہ پر اس طرح گلی کوچوں سے گذرنے لگے گویا سب کچھ دیکھا بھالا ہے اور ہم کسی ضرورت سے ادھر جا رہے ہیں، چونکہ گذشتہ سفر سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آبادی کوئی زیادہ نہیں ہے اس لئے آگے جا کر ہم کسی سمت آبادی سے باہر نکل جائیں گے اور جب تک جی چاہے گا گھومتے پھرتے رہیں گے اور جب واپس جانا ہوگا ٹیکسی کر لیں گے، یہاں ٹیکسیوں کی اس بری طرح بھرمار ہے کہ اگر آپ آدمی تلاش کریں تو شاید نہ ملے لیکن ٹیکسی ضرور کہیں نہ کہیں نظر آجائے گی، ۶۳-۶۴ء کے نئے ماڈل گلی کوچوں اور

ریتوں میں اس طرح دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں گویا بچوں کے کھلونے ہیں جنھیں بچے اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں، موٹر کی اہمیت یہاں والوں کے نزدیک ایک سائیکل یا زیادہ سے زیادہ ایک تانگے کی ہوتی ہے، ہم آگے بڑھتے رہے راستہ میں اسکول جانے والے بچے بچیاں ناشتہ کے لئے فول اور عیش خریدنے والے پٹرول کمپنی کے ملازمین جن میں زیادہ تر ہندوستانی پاکستانی نظر آتے تھے ملتے رہے، جوں جوں آگے بڑھتے رہے مکانوں کی ساخت اور طرز تعمیر میں فرق نظر آتا رہا حتیٰ کہ آخر کا حصہ بالکل پرانے طرز کا مٹی اور اینٹ سے بنا ہوا نظر آیا، آبادی ختم ہونے کے بعد ہم بائیں ہاتھ مڑ گئے کچھ دور چلنے کے بعد پھر جدید طرز کے مکانات و عمارتیں نظر آنے لگیں ہم پاس آکر رکنے والی سینکڑوں موٹروں کے ڈرائیوروں کو شکراً کہہ کر رخصت کرتے رہے اب ہم ایرپورٹ جانے والی سڑک کے سامنے آگئے تھے، چونکہ سورج میں ابھی کوئی خاص تمازت نہیں آئی تھی اس لئے مطار والی سڑک کے راستہ سے محرق کے بس اسٹنڈ واپس آگئے ،مطار کی سڑک کے اردگرد جو نئے مکانات تعمیر کئے ہیں وہ جدید طرز تعمیر کے نمونے اور بیسویں صدی کے تعمیراتی شاہ کار کہے جانے کے لائق ہیں ان میں زیادہ تر انگریز اور دوسرے غیر ملکی اونچے ملازمین کے بنگلے یا مقامی مالداروں کے محلات یا پھر سرکاری عمارات و دفاتر ہیں جن میں مدارس و ہسپتالوں کی عمارتیں بھی شامل ہیں، محرق میں بس اسٹنڈ کے پاس ہی میونسپلٹی کا آفس اور گوشت مچھلی وغیرہ کا بڑا مارکیٹ ہے۔

قیام گاہ واپس پہونچے تو دیکھا کہ پاکستانی ساتھی پہلی لانچ سے الخبر جانے کے لئے تیار ہیں چونکہ پاکستان کا برطانوی سفارت خانہ بحرین کا ٹرانزٹ ویزا لینے والے پاکستانیوں کے لئے بحرین سے ظہران تک ہوئی ٹکٹ خریدنے کی پابندی نہیں لگاتا اس لئے ہمارے پاکستانی ساتھی اور بعض دوسرے ہم سفر صبح سویرے ہی بحرین

سے روانگی کے لئے تیار تھے، ہم نے انھیں رخصت کیا اور باقی اوقات گذارنے اور بعض دوسری چیزیں خریدنے کے لئے بازار کا ایک چکر لگا دیا، یہاں کا بازار نہایت شاندار اور دنیا بھر کے مالوں سے بھرا پڑا ہے چونکہ بحرین فری پورٹ ہے اس لئے یہاں بعض چیزیں سستی اور دوسری جگہوں کی بہ نسبت کم دام میں مل جاتی ہیں، جزیرہ عرب کی مشرقی ریاستوں میں عدن اور کویت کے بعد غالباً بحرین ہی کا نمبر ہے یہاں کے دوکاندار اور شہروں میں رہنے والے عوام عام طور پر چار زبانیں بولتے ہیں، ملکی، قومی اور سرکاری حیثیت سے عربی زبان تو ہر ایک کے لئے لازم ہے یہاں کی عوامی عربی زبان اپنے آس پاس کے علاقوں ہی جیسی ہے مگر چونکہ یہاں ارانیوں کی اکثریت ہے اور ایران کا بحرین سے وقتاً فوقتاً حاکم ومحکوم جیسا تعلق رہا کیا ہے اس لئے یہاں کے لہجہ میں ''ک'' کو ''چ'' سے بدلنے کی عام عادت ہے، چنانچہ کیف حالک کے بجائے چیف حالچ کہا کرتے ہیں جس طرح مصری ''ق'' کو ''ا'' سے جیسے قلبی سے البی اور ''ج'' کو ''گ'' سے جیسے جمهوریه سے گمهوریه بدل دیا کرتے ہیں یا جیسے اہل نجد ''ق'' کو ''گ'' سے جیسے اقول سے اگول اور حجازی ''ث'' کو ''ت'' سے جیسے کثیر سے کتیر بدل دیا کرتے ہیں، دوسرے نمبر پر اردو ہے جسے دوکاندار، نوکر، کلرک اور آفیسر سبھی بولتے سمجھتے ہیں عام طور پر شہر میں رہنے والے سبھی لوگ اردو سے بقدر ضرورت واقف ہوتے ہیں، ہندوستان و پاکستان سے بحرین کے تعلقات اور وہاں کے لوگوں کی بحرین میں موجودہ ایک بڑی تعداد نے یہاں اردو کو مقبول عام بنا رکھا ہے، ہندوستانی فلموں اور ان کے گانوں کا بھی اس میں بڑا ہاتھ ہے یہاں کی اردو پر بمبئی اور کراچی جیسے مرکزی شہروں کی اردو کا رنگ غالب ہے، اگر بحرین سے اردو کا کوئی رسالہ نکالا جائے تو خیال ہے کہ خاطر خواہ کامیابی ہوگی کیونکہ بحرین کے لئے خلیج عمان اور قطر، کویت وغیرہ کے علاقوں میں بھی

اردودانوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، جن میں بعض ادبی ذوق رکھنے والے اہل علم بھی ہیں، فارسی زبان کو اس ترتیب سے تیسرا نمبر حاصل ہے، یہاں کے ایرانیوں کی مادری زبان ہونے کے سبب بحرین کے تقریباً سبھی طبقوں میں بولی سمجھی جاتی ہے خصوصاً دوکاندار اور مزدور پیشہ لوگ تو عام طور پر بولتے سمجھتے ہیں، انگریزی صرف انگریزوں یا ہندوستانی پاکستانی تعلیم یافتہ طبقوں میں بولی سمجھی جاتی ہے یا پھر غیر ملکی سیاحوں اور تاجروں کی زبان ہے ، مذکورہ بالا تینوں زبانوں کی طرح انگریزی عام عربوں کی زبان نہیں بن سکی ویسے وہاں کے شہروں کا ایک بڑا طبقہ بآسانی اپنا مافی الضمیر انگریزی میں ادا کر لیتا ہے اور زیادہ تر آفسوں، کمپنیوں، اور تجارتی اداروں میں اس کا دور دورہ ہے۔

بازار سے واپسی اور کھانا کھاتے تقریباً دو بج گئے حالانکہ ہمیں دو بجے مطار پہونچ جانا چاہئے تھا، تقریباً ڈھائی بجے ہم نے ٹیکسی پر سامان لاد کر مطار کا رخ کیا مولوی عبدالرحمان مبارکپوری صاحب ہم سے پہلے ہی مطار اس امید پر پہونچ گئے تھے کہ ممکن ہے ۵/ بجے والی اڑان کے بجائے دو بجے والی اڑان میں انھیں کوئی سیٹ مل جائے تاکہ ظہران سے ہم ایک ساتھ سفر کر سکیں، مطار پہونچ کر معلوم ہوا کہ انھیں جگہ نہیں مل سکی اب وہ ہمارے ساتھ دو گھنٹہ بعد ہی یہاں سے روانہ ہو سکیں گے، ہم نے اترتے ہی جا کر سامان وغیرہ وزن کرایا اور مختلف قسم کے فارموں کی خانہ پری میں مصروف ہو گئے ابھی ہم انھیں کاغذوں میں الجھے ہوئے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک سے فی کس ۶۷ روپیہ بطور داخلہ فیس برائے سعودی عرب طلب کیا گیا ہم نے انھیں بتلایا کہ ہم وہاں کے طالب علم ہیں اور اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں انھوں نے سفارت خانہ کے کاغذات طلب کئے جو ہمارے پاس نہیں تھے ہم نے لاکھ کوشش کی اور اپنے دوسرے کاغذات دکھلائے اور جہاں تک ہوسکا کوشش کی لیکن سرکاری تصدیق نہ

ہونے کے سبب ہمیں فی کس ۶۷ روپیہ کی مطلوبہ رقم ادا کرنی پڑی، چونکہ ٹھیک تین بجے جہاز روانہ ہونے والا تھا اور پونے تین ہو رہے تھے اس لئے جلدی جلدی میں مطار کے اندر داخل ہو گئے جہاں دوسرے مسافر پہلے ہی سے موجود تھے، ہم نے وہاں بیٹھ کر ایک ایک کوکا کولا پیا ابھی ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ مسافروں کو جہاز میں بیٹھنے کا اعلان کر دیا گیا اور سب اپنی اپنی سیٹیں چھوڑ کر جہاز کی طرف روانہ ہوئے، یہ جہاز جو طیران خلیج کمپنی کا ایک چھوٹا سا جہاز تھا جو اندر اور باہر دونوں جگہوں سے بچکانہ اور بچوں کا کھلونا معلوم ہو رہا تھا اس کا دروازہ پچھلے حصہ میں تھا اس میں داخل ہو کر ہم آگے چلے گئے دونوں طرف صرف ایک ایک سیٹ تھی اور بیچ میں آنے جانے کا راستہ تھا اس میں صرف سولہ سیٹیں تھیں اسی لئے عام طور پر اس میں سیٹیں ریزرو نہیں ہوتیں، چونکہ اس پر گذشتہ سال بھی سفر کر چکا تھا اس لئے قدرے مطمئن تھا مولوی امیر اور مولوی لقمان برابر تعجب کا اظہار کرتے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب کو ایک پنجرہ میں ترتیب سے بند کر دیا گیا ہے، ہمارے پیچھے ہی پائیلٹ بھی آیا جس نے جہاز اسٹارٹ کیا اور ہم بحرین کے رن وے پر دوڑنے لگے جب جہاز نے زمین چھوڑا تو سمندر کے اوپر ہو چکا تھا یہ سمندر ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو بحرین اور سعودی عرب کے درمیان حائل ہے اس بحیرہ میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور بحرین کے مختلف جزیروں کا نظارہ خوب رہا، چند منٹ کے بعد بحرین آبادی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور سامنے ظہران، الخبر، دمام اور راس تنورہ کی سعودی بستیاں نظر آنے لگیں اور پھر یہ بحیرہ ختم ہو گیا جس کے ساتھ ساتھ ہمارا جہاز بھی نیچے ہونے لگا اور ٹھیک بارہ منٹ کے بعد ظہران کے رن وے پر دوڑنے لگا اس طرح پندرہ منٹ میں ہم بحرین سے ظہران پہونچ گئے۔

پاسپورٹ اور ہیلتھ سرٹیفکٹ وغیرہ جانچ کرنے والے آفیسر سے ہم نے

شکایت کے لہجہ میں کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ مملکت کی داخلہ فیس کبھی یہاں ظہران میں وصول کی جاتی ہے کبھی بحرین میں، پھر ہم طالب علم ہیں ہمیں گذشتہ سال یہیں بتلایا گیا تھا کہ مرسوم ملکی کے تحت طالب علم اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں اس نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ ہم نے اس کو بتلایا کہ بحرین میں ہم سے داخلہ فیس کے نام سے فی کس ۶۷ روپیہ لیا گیا ہے اور گذشتہ سال ہم کو بتلایا گیا کہ طالب علم اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں اس آفیسر نے بتلایا کہ بحرین والوں نے غلطی کی تم لوگ یقیناً اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہو اگر چاہو تو تم لوگ منطقہ شرقیہ کے مدیر مالیات محمد مبارک سے جا کر ملو، کسٹم وغیرہ فارغ ہو کر ہم لوگ باہر نکلے، ظہران کا یہ مطار جو ابھی حال ہی میں تعمیر ہوا ہے اپنی تعمیر اور نوعیت کے اعتبار سے انوکھا ہے سعودی حکومت کا یہ عالمی ہوائی اڈہ ہے لمبی اڑان اور یورپ کو جانے والے تقریباً سبھی جہاز یہاں ٹھہرتے ہیں پورا مطار ایر کنڈیشن اور ہر قسم کے جدید سامان وآلات سے لیس ہے اسی میں ایک بڑا ہوٹل بھی ہے۔

سعودی عرب کا یہ علاقہ منطقہ شرقیہ کہلاتا ہے جو پرانی تواریخ سے جبیل، قطیف، ثارات، دارین اور دمام وغیرہ پر مشتمل ہے بالفاظ دیگر قدیم بحرین کا حصہ ہے، امین ریحانی نے اپنی کتاب ''ملوک العرب'' میں اس علاقہ کی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے، ساتھ ہی مشہور پرتگالی ملاح فونسو اورالبرک کی خلیج عرب کے علاقوں کی دریافت کی مختصر تاریخ بھی لکھی ہے جس میں پرتگالیوں کے ناجائز قبضہ اور اس علاقہ میں ان کی ریشہ دوانیوں کا بھی ذکر ہے منطقہ شرقیہ ہی کا ایک فرزند محمد سعید مسلم مصنف ''ساحل الذہب الاسود'' نے لکھا ہے کہ پرتگال وہ پہلی مغربی حکومت ہے جو مشرق سے متعارف ہوئی انھوں نے ۱۴۸۶ء میں اس کا انکشاف کیا لیکن اس وقت انھوں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن پھر ۱۴۹۷ء میں واسکوڈی گاما نے جب مشہور عرب ملاح احمد بن ماجد کی مدد سے ہندوستان پہونچنے میں کامیابی حاصل کرلی

توان کی شہرت ہوگئی اورانھوں نے تجارت کووسیع کرنا شروع کردیا ساتھ ہی انھوں نے ایک عظیم شہنشاہیت کی بنیاد رکھی جوافریقہ کے ساحلوں سے لیکر ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی اس زد میں خلیج عرب کا پورا علاقہ شامل تھا، پرتگالیوں کوایک زبردست شکست دینے کے بعد ترکوں نے خلیج کے اس علاقہ پر قبضہ کیا چنانچہ قطیف وغیرہ میں موجود بعض قلعے پرتگالی یا ترکی عہد کی نشاندہی کرتے ہیں۔

یہ علاقہ پہلے سمندر سے موتی نکالنے کے لئے مشہور تھا بعض مقامات پر کچھ کھیتی بھی ہوتی تھی، یہاں کے موتی عام طور پر ہندوستان کے بازار میں بیچے جاتے تھے، لیکن جاپان کی نقلی موتی کی صنعت نے ان اصلی موتیوں کا بازار سرد کردیا جس کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کی اقتصادی حالت ابتر ہوگئی، لیکن کچھ ہی دنوں بعد اس علاقہ میں پٹرول کی دریافت نے موتی کی کمی پوری کردی، مئی ۱۹۳۳ء میں امریکہ کی مشہور تیل کمپنی اسٹنڈرا وپل آف کالیفورنیا اور سعودی عرب کے درمیان اس علاقہ میں تیل کی تلاش کے سلسلہ میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے کمپنی کا ایک وفد جبیل نامی شہر میں آیا اور پہلی مرتبہ ظہران کے پہاڑ میں سروے کیا اس سروے کے بعد ۱۹۳۵ء میں کمپنی نے دمام کے علاقہ میں تیل کا پہلا کنواں کھودا جہاں ۲۳۰۰ قدم نیچے تیل دریافت ہوا لیکن تیل کی مقدار کافی نہ تھی پھر اس کے بعد دس دوسرے کنویں کھودے گئے لیکن کوئی خاطر خواہ فائدہ اور نتیجہ برآمد نہیں ہوا لیکن اس وفد نے ہمت نہیں ہاری اس کے بعد دمام کے کنویں نمبر ۷ کی دوبارہ کھدائی کی جس کے نتیجہ میں ۱۹۳۸ء میں تیل کی ایک بڑی مقدار ہاتھ لگی جسے صفائی کے لئے بحرین بھیجا جانے لگا پھر ۱۹۴۰ء میں ابوحدریہ اور بقیق کے اندر پٹرول کی ایک بڑی مقدار دستیاب ہوئی ۱۹۴۸ء میں عین دار میں اس کے بعد پھر ۱۹۴۹ء میں حرض اور فاخلی میں اور ۱۹۵۱ء میں عثمانیہ اور سفانیہ میں پٹرول کی کافی مقدار دستیاب ہوئی یہانتک کہ ۱۹۶۲ء میں ان علاقوں سے

۳۰۷۵۲۰۱۵ ڈرم پٹرول روزانہ نکالا جانے لگا، پھر ۱۹۵۷ء میں پٹرول کے دو اور علاقے دریافت ہوئے ایک منیقہ جو سمندر کے اندر ہے دوسرا خریض جو ریاض سے ۱۹۵ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے اس وقت ارامکو کمپنی کے پاس دوسو بیالیس ایسے کنویں موجود ہیں جن میں سے پٹرول نکالا جارہا ہے۔

عرب امریکہ آئل کمپنی (ارامکو) کا مرکز ظہران ہے یہیں اس کمپنی کا صدر دفتر اور امریکن مزدوروں کی امریکن طرز کی لمبی چوڑی کالونی ہے اس میں جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے کسی حصہ میں آ گئے ہوں، یہاں کے مکانات، رہائش طرز زندگی تقریباً سبھی امریکن ہیں، ہوٹل، ریسٹورنٹ، کلب وغیرہ سبھی امریکن طرز کے ہیں، یہاں کی سڑکیں پختہ اور نہایت وسیع اور دورویہ درختوں سے معمور ہیں، صاف ستھری اور عالیشان فلیٹوں کی اس کالونی کو چار چاند لگانے کے لئے عالمی مطار، شاندار ہسپتال اور ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی اس کے دوش بدوش موجود ہیں،

ظہران کے قریب ایک شاداب خطہ بھی ہے جو یہاں کے لوگوں کی تازہ ترکاریوں کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے، گذشتہ دنوں سفر میں بیچ ظہران سے گذرنے اور وہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا، یہاں سے قریب ہی الخبر ہے جو ایک چھوٹے بندرگاہ کا کام دیتا ہے یہ پہلے ایک چھوٹی سی آبادی تھی لیکن اب ظہران کے بازار کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ہر قسم کی دوکانیں ہیں، ظہران سے آنے جانے والے مسافر عام طور پر الخبر ہی کے کسی ہوٹل میں قیام کرتے ہیں، سمندری راہ سے بحرین جانے والے مسافر یہیں سے لانچ میں بیٹھ کر بحیرہ پار کرتے ہیں، بندرگاہ کے قریب ہی ایک مسافر خانہ بنانے کی انفرادی کوشش جاری ہے تاکہ اس راہ سے حج کے لئے آنے والوں کو یہاں ٹھہرنے کی سہولت ہو سکے، یہاں بھی عام طور پر جدید طرز کی عمارتیں پائی جاتی ہیں، یہاں کا تمدن بھی ظہران کے تمدن سے

قریب تر ہے۔

چونکہ دمام میں منطقہ شرقیہ کے مدیر مالیات شیخ محمد مبارک سے ملاقات کرنی ضروری تھی اس لئے مولوی عبدالرحمان صاحب کا زیادہ دیر تک انتظار نہ کر سکے اور عالمی وقت کے مطابق ۴؍ بجے شام کوظہران کے مطار سے دمام کے لئے بذریعہ ٹیکسی روانہ ہوئے تقریباً آدھ گھنٹہ کا یہ راستہ جو صحراء کے بیچ کالے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی شاندار سڑک اور آس پاس میں تیل کے کنوؤں اور پائپ لائنوں کے مناظر سے معمور تھا باتوں بات میں طے ہوگیا کہ اب ہم دمام میں داخل ہورہے تھے دمام کے شاندار فلیٹ اور لمبی چوڑی صاف شفاف سڑکیں ہمارے سامنے تھیں ہم سیدھے ریاض کے بس اسٹیشن پہونچے وہاں سے مدیر مالیات کا مکان قریب تھا، ٹیکسی والے کو پندرہ ریال ادا کر کے مولوی جمیل صاحب کے ساتھ شیخ محمد مبارک کے مکان کی دریافت میں نکل پڑے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر واقع تھا جلد ہی وہاں پہونچ گئے مگر معلوم ہوا کہ وہ کسی سرکاری ضرورت سے ریاض گئے ہوئے ہیں، اب یہاں دیر تک رکنا مناسب نہ سمجھ کر فوراً واپس ہوئے، دیکھا تو ہمارے بقیہ پاکستانی ساتھی وغیرہ بھی الخبر سے دمام پہونچ چکے تھے اب ہم سب پھر ایک ہی ساتھ ایک ہی موٹر میں ریاض تک کا سفر طے کرنے والے تھے چونکہ سفر لمبا تھا اور راستہ میں کھانے پینے کا کہیں خاص انتظام نظر نہیں آرہا تھا اس لئے وقت کی کمی کے باوجود ہم ایک قریبی ہوٹل میں گھس گئے اور کھانا تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔

احساء جس کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں کہ تاریخ وسیرت کی کتابوں کے اعتبار سے گذشتہ دور کا بحرین تھا اور خود احساء کا اطلاق اس زمانہ میں موجودہ احساء کے ایک شہر ہفوف پر ہوتا تھا اور یہی ہفوف اس پورے صوبہ کا صدر مقام تھا اب سعودی اصطلاح میں صوبہ احساء کو منطقہ شرقیہ بھی کہتے ہیں اور اس کا صدر مقام ہفوف کے بجائے دمام

ہوگیا ہے، جغرافیائی اعتبار سے دمام قطیف کے جنوب مشرق میں تقریباً دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے پہلے زمانہ میں اس کی حیثیت ایک بندرگاہ کی تھی لیکن گذشتہ صدی میں یہ بندرگاہ تباہ کردی گئی تھی لیکن اب پٹرول کی دریافت کے بعد ایک کروڑ پچاس لاکھ ڈالر کے صرفہ سے جو بندرگاہ تعمیر کی گئی ہے وہ منطقہ شرقیہ کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، یہ بندرگاہ چھ سو میٹر لمبی اور بیک وقت چار بڑے جہازوں کے ٹھہرنے کے لئے کافی ہے، یہیں سے سعودی عرب کی واحد ریلوے لائن بھی گذرتی ہے جو راس تنورہ سے ریاض تک جاتی ہے، چار سو میل لمبی ریلوے لائن سعودی عرب میں تنہا کام کرنے والی ریلوے لائن ہے، حجاز ریلوے لائن کی تعمیر و مرمت کے بعد اس کو ثانوی حیثیت حاصل ہوجائے گی، یوں تو دمام اپنی ترقی و تقدم کے باعث غیر ملکی ماہرین انجینیر وں اور پیشہ وروں سے ایک مخلوط شہر بن گیا ہے مگر عرب آبادی کے لحاظ سے اس کا بڑا حصہ قبائل دواثر پر مشتمل ہے، جدید طرز پر شہر کی تعمیر آبادی نے اس خوبصورتی میں اور اضافہ کردیا ہے جگہ جگہ مساجد و مدارس، شفاخانوں، سرکاری دفاتر و عمارتوں اور پارکوں کی کثرت و ترتیب نے چار چاند لگا دیا ہے۔

احساء (منطقہ شرقیہ) کے اکثر و بیشتر علاقے صحراؤں اور میدانوں پر مشتمل ہیں کہیں کہیں ٹیلے نما اونچائی بھی ہے، احساء کا علاقہ سعودی عرب کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت چشموں اور کنوؤں سے معمور ہے جن کے آس پاس چراگاہیں اور شاداب خطے ہیں، یہاں بارش کا سالانہ اوسط صرف چار انچ ہے، احساء کی پیداوار میں چاول کی کاشت قابل ذکر ہے، پھلوں میں لیمو، انار، انگور، انجیر، کھجور وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں، احساء کی سرزمین میں پٹرول کا جو سمندر دریافت ہوا ہے وہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ سعودی عرب کے بجائے کویت (جو احساء کے شمال میں ہے) قطر (جو جنوب میں ہے) اور بحرین (جو مشرق میں ہے) کی حکومتیں بھی اپنے اپنے علاقوں سے پٹرول نکال کر

اس سے استفادہ کررہی ہیں۔

احساء کے مشہور شہروں میں ظہران، الخبر ، دمام کے علاوہ ہفوف، مبرز، قطیف ،راس تنورہ، عقیر، بقیق اور جزائر ایک بڑی بندرگاہ کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں ویسے یہ تمام شہر پٹرول کی دولت سے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ابھی ہم کھانا کھا کر فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ بس کا ڈرائیور بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جلدی کیجئے ورنہ لوگ گھبرا گھبرا کر بس سے اتر رہے ہیں اور وہ بھی کھانے پینے کے لئے جارہے ہیں اگر آپ لوگوں نے دیر کی اور لوگ ادھر ادھر منتشر ہوگئے تو پھر عشاء کے بعد ہی یہاں سے روانہ ہوسکیں گے اس طرح ریاض پہونچتے پہونچتے صبح ہوجائے گی ، ہم نے جلدی جلدی کھانا کھا کر بل ادا کیا اور بس کی طرف بڑھے مغرب کا وقت تھا وہیں مغرب کی نماز پڑھی اور دمام سے ریاض کے لئے روانہ ہوگئے ، ریاض دمام کا راستہ چونکہ اور زیادہ کشادہ تھا اس لئے اس خنک رات کی تاریکی میں ڈرائیور نے اپنا جوہر دکھادیا، بس کے ذریعہ ریاض اور دمام کے درمیان کوئی خاص شہر نہیں پڑتا بلکہ عام طور پر راستہ شہر سے باہر بنایا گیا ہے، البتہ جگہ جگہ راستہ میں پٹرول کے کنوؤں سے نکلتی ہوئی جلتی گیس کا منظر بڑا خطرناک نظر آرہا تھا، رات کی تاریکی میں غور کرنے سے کہیں کہیں پٹرول کے کنویں اور ان سے متعلق پائپ لائنیں نظر آجایا کرتی تھیں، تقریباً دو گھنٹے چلنے کے بعد ڈرائیور نے بس روکی لیکن فوراً ہی پھر چل پڑی پانچ بجے (گیارہ بجے) رات کو ہم حریص پہونچے یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے یہاں ۱۹۵۷ء میں پٹرول دریافت ہوا، عام طور پر ساڑھے پانچ ہزار قدم کھودنے کے بعد پٹرول ملتا ہے اب تک یہاں چودہ کنویں کھودے جاچکے ہیں، یہاں گھنٹوں تک قیام رہا جن لوگوں نے کھانا نہیں کھایا تھا وہ کھانا کھانے میں مصروف ہوگئے کچھ لوگ چائے سے شغل کرنے لگے اور کچھ عشاء پڑھنے لگے تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد ڈرائیور

کے شور وہنگامہ نے سب کو بس میں لا پہونچایا یہاں سے ریاض تک ۱۹۵ رکلومیٹر کا یہ باقی سفر دوبارہ شروع ہو گیا ہے، یہاں کے لوگ بسوں میں سفر کے وقت نہ سونے کے عادی ہونے کے باوجود سبھی کچھ رات کی خنکی اور کھانے کی گرمی سے اونگھنے لگے، اس نوم ونعاس کے عالم میں ساڑھے چھ بجے ہم لوگ ریاض پہونچ گئے، مقامی لوگوں نے تو اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیا اور ہم لوگوں نے بس اسٹنڈ کے قریب فقہی العربی ومطعم السعودی نامی ہوٹل میں سامان رکھ کر سونے کی تیاری شروع کر دی تھوڑے ہی دیر میں نیند کی نجدی دیوی کی آغوش میں جا پہونچے۔

☆☆☆☆☆☆☆

ینبع کا تعلیمی و تبلیغی سفر

مبارکپور (اعظم گڈھ) مدینہ منورہ کے تقریباً تین ہفتہ کے بری، بحری اور فضائی سفر کے باوجود جب معلوم ہوا کہ یکم جمادی الاول پنجشنبہ کو جامعہ کا ایک تبلیغی رحلہ ینبع جارہا ہے تو سفر سے متعلق جملہ تکالیف کافور ہوگئیں اور تقریباً تین سو کلومیٹر کے اس تبلیغی سفر کے لئے نشاط لوٹ آیا۔

جامعہ کی طرف سے اس تبلیغی و تاریخی رحلہ کے سلسلہ میں اعلان کیا گیا کہ رحلہ چار دن کے لئے ہوگا، اور اس کا تمام انتظام جامعہ کرے گا اور اس میں صرف وہی طلبہ شریک ہوسکتے ہیں جن کو ضمنی امتحان یا اختبار قبول میں نہ بیٹھنا ہو، مذکورہ بالا شرط اور اکثر طلبہ کے وطن سے نہ لوٹنے کے سبب ہمارا یہ تبلیغی سفر صرف پینتیس طلبہ دو اساتذہ اور دو ڈرائیور ہی پر مشتمل رہا اس کی قیادت انھیں دونوں اساتذہ یعنی شیخ استاذ عبدالحق محروس مدرس جامعہ اسلامیہ اور شیخ استاذ وکیل مدرس معہد المدرسین کے ذمہ رہی، اعلان کے مطابق ظہر بعد ہی کوچ کرنا چاہئے تھا لیکن تقریباً چالیس آدمیوں کے چار دن کے ہر قسم کے انتظام کی وجہ سے دیر ہوگئی اور ہم لوگ عصر بعد مقامی ٹائم کے مطابق سوا گیارہ بجے جامعہ سے بس کے ذریعہ روانہ ہوئے، چونکہ کچھ لڑکے شہر ہی میں ہمارا انتظار کررہے تھے، اس لئے باب العنبر یہ پر پہونچ کر ان کو سوار کرنے کے بعد مدینہ سے باہر ہوئے، آگے بیئر عروہ تھا جو ایک قدیم اور تاریخی مقام کے ساتھ ساتھ جدید تعمیری پروگرام کے سبب بھی مشہور ہے، تاریخی حیثیت تو یہ ہے کہ اس کنویں کا پانی جو بیئر عروہ کے نام سے مشہور ہے نہایت شیریں ہے اور بعض خلفاء کے پینے کیلئے بغداد

بھیجا جاتا تھا اور بہت سے شعراء نے تمنا کی ہے کہ کاش مرنے کے بعد میں بیرٔ عروہ کے پانی سے نہلایا جاؤں اور بقیع میں دفن کیا جاؤں، جدید تعمیری حیثیت سے اس کی اہمیت یوں ہو جاتی ہے کہ یہیں وادیٔ عقیق پر ایک بہت بڑا بند باندھا گیا ہے، یہ بند گذشتہ کئی سالوں سے بن رہا تھا اب اس بند کے تیار ہو جانے کے بعد وہ تمام پانی جو وادیٔ عقیق کے ذریعہ مملکت کے مختلف حصوں اور پہاڑوں سے آکر یہاں جمع ہوتا تھا اور آگے جا کر سمندر میں مل کر ضائع ہو جاتا تھا وہ سب روک کر سینچائی اور بجلی پیدا کرنے کے کام میں لایا جاسکے، مدینہ سے مکہ جانے والی سڑک اسی بند پر سے گذرتی ہے۔

بیرٔ عروہ سے روانہ ہو کر بیرٔ علی پہونچے جو یہاں سے تین چار کلومیٹر پر واقع ہے یہیں سے اہل مدینہ احرام باندھتے ہیں کیونکہ یہی ان کی میقات ہے جو حدیث و تاریخ میں **ذو الحلیفه** کے نام سے مشہور ہے یہیں پر مدینہ کا پاور ہاؤس بھی ہے جو مدینہ اور اطراف مدینہ کو پاور سپلائی کرتا ہے، مدینہ کا پاور ہاؤس یہاں بنانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ میں کوئی غیر مسلم داخل نہیں ہو سکتا، اور اس پاور ہاؤس میں ممکن ہے کچھ امریکن یا دوسرے غیر ملکی ملازمین اور انجینیر ہوں۔ اس لئے اسے مدینہ کی حد سے باہر قائم کیا گیا ہے۔

اس کے بعد سڑک کے آس پاس پہاڑ یا پہاڑ کے دامن ہیں، مدینہ، جدہ و مکہ کے اس ساڑھے چار سو کلومیٹر طویل راستہ میں بہت سے قہوہ خانے، پولیس چوکیاں، گاؤں آتے ہیں لیکن کافی دوری پر بیرٔ علی کے بعد فرحات نامی پولیس چوکی اور گاؤں ہے جو مدینہ سے تقریباً بیس میل دور واقع ہے، یہاں پہونچنے تک سورج پہاڑوں میں اپنا دامن چھپانے کی پوری تیاری کر چکا تھا، اس اثناء میں پہاڑوں میں سورج ڈوبنے کا منظر بڑا ہی حسین اور پرکشش نظر آرہا تھا، اور چونکہ فرحات کے بعد سے پہاڑوں کا

اٹوٹ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس لئے سڑک کے نشیب و فراز اور سمت بتلانے والے نشانات جگہ جگہ نصب کئے ہوئے نظر آتے ہیں، جن کی شکل یہ ہوتی ہے لکڑی کے کھمبوں میں سیاہ پر سفید حرفوں میں مختلف قسم کی عبارتیں اور علامتیں لکھی ہوتی ہیں مثلاً آگے اونچی سڑک آرہی ہے تو بورڈ پر لکھا ہوتا ہے **احترس امامک خطر مرتفع** اور اگر شمال یا جنوب کی طرف مڑی ہوتی ہے تو ''**احترس منجی شمال یا احترس منجی جنوب** کی عبارت لکھی ہوتی ہے اور ڈرائیور کو ہوشیار کرنے اور اوسط درجہ کی رفتار سے چلانے کے لئے جگہ جگہ **خطر هدئ السرعة** کا بورڈ لگا رہتا ہے۔

ایک چیز میں نے دیکھی جو مجھے نئی معلوم ہوئی تو اس کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نئی نہیں بلکہ پرانی اور عام ہے وہ یہ کہ جگہ جگہ سڑک کے کنارے پانی کے بڑے بڑے پیپے رکھے ہوئے ہیں جس میں سرکاری موٹریں قریب کے کنوؤں سے پانی لاکر بھر جاتی ہیں یہ پانی عام مسافروں کے ساتھ ساتھ قرب وجوار کے بسنے والے بدوؤں کے استعمال کے لئے بھی ہوتا ہے، اس طرح ان کی سب سے بڑی تکلیف میں بڑی حد تک کمی پیدا ہوگئی ہے۔

اس کے بعد ہم لوگ قریش پہونچے اور مغرب کی نماز وہیں کی ایک نئی تعمیر شدہ مسجد میں با جماعت ادا کی گئی یہ گاؤں فرحات کی بہ نسبت آباد اور بڑا ہے، یہاں بھی پولیس چوکی اور کئی ایک قہوہ خانے ہیں اس کی آبادی بائیں طرف کچھ دور پر نظر آتی ہے دو تین مسجدیں نظر آئیں جس میں ہم نے نماز ادا کی وہ ۱۳۷۸ھ کی بنی ہے جس کو یہاں کے ایک مخیرؔ شیخ شربتلی نے اپنے خرچہ سے تعمیر کرائی ہے اسی سے متصل ایک مدرسہ بھی ہے مغرب کی نماز کے بعد میں نے مسجد کی چھت پر چڑھ کر ادھر ادھر ایک نظر ڈالی تو آبادی اچھی خاصی نظر آئی اس کا اپنا ایک بازار بھی ہے۔

ہمارے ایک پاکستانی ہم سفر نے بتلایا کہ یہ جگہ تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت

اس معنیٰ کر کے رکھتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے واپسی پر یہاں قیام کیا تھا اور ایک قیدی کافر کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اس روایت کی صحت اور مراجعت کے لئے ماٰخذ اور وقت دونوں درکا ہیں اور اتفاق سے فی الحال دونوں مفقود ہیں، ویسے یہ حقیقت ہے کہ جنگ بدر سے واپسی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نضر بن حارث بن کلاء کو جو بدر کی جنگ میں کفار مکہ کا کمانڈر تھا، صفراء میں قتل کرنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وہ قتل ہوا، اسی طرح ایک دوسرے کافر قیدی عقبہ بن ابی معیط کو آپ نے عرق ظبیہ میں قتل کرنے کا حکم دیا جس کو عاصم بن ثابت بن ابی افلح نے قتل کیا لیکن صفراء اور عرق ظبیہ سے قریش کا کیا تعلق؟ پھر ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک قریش کے قریب ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھیں دونوں میں سے کسی ایک کا نام بدل کر قریش رکھدیا گیا ہو، معلوم ہوا کہ عرق ظبیہ میں جہاں عقبہ بن معیط قتل کیا گیا تھا ایک قبر بنادی گئی تھی اور دیہاتی وہاں برکت کے لئے جاتے تھے جب سعودی حکومت کا دور دورہ ہوا تو اس نے اس کو مسمار کرادیا۔

یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہمارا یہ قافلہ پھر عازم سفر ہوا، اب مغرب بعد ہو چکا تھا اور دوسری رات کا چاند بھلا کب تک ساتھ دیتا تھوڑی دیر بعد وہ بھی پہاڑوں میں جا چھپا، اب ہم آس پاس کے اندھیرے اور سامنے موٹر کی لائٹ کے اجالے میں چلے جارہے تھے راستہ میں بہت سی منزلیں اور مشہور مقامات آئے جیسے مروحہ، مسیجد، خیف، واسطہ وغیرہ لیکن ان میں کہیں بھی رکنا نہیں ہوا، اور قریش سے چلنے کے بعد عشاء کے وقت یعنی مقامی ٹائم کے اعتبار سے ڈھائی بجے بدر پہونچے یہ بدر وہی تاریخی جگہ ہے جہاں کفر و اسلام کا پہلا فیصلہ کن معرکہ گرم ہوا اور اسلام کو یہیں سے قوت نصیب ہوئی تھی، اس کے بعد ہی سے اسلام کے لئے میدان صاف ہوگیا، یہاں ہم نے عشاء کی نماز ادا کی اور ایک قہوہ خانے میں بیٹھ کر امیر احمد رامپوری، عبدالرحمان

مبارکپوری، مولوی حفیظ الرحمان اعظمی و مدراسی اور راقم الحروف نے ایک ساتھ چائے پی، پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد امیر احمد صاحب کی تحریک پر ایک قہوہ جی (بیرے) کو بلا کر مچھلی کا آرڈر دیا گیا، سمندر سے قریب ہونے سے بدر کے بعد ہر منزل پر تازی مچھلی ہر وقت تیار ملتی ہے اور مسافرین خاص طور پر مچھلی کھاتے ہیں خصوصاً مستورہ اور رابغ جو سمندر سے بالکل ہی قریب ہیں مچھلی تیار رکھنے میں مشہور ہیں، کھانے سے فراغت کے بعد ادھر ادھر کی گفتگو کرنے مسہری نما کرسی پر کچھ دیر لیٹنے کے بعد امیر کارواں کی آواز آئی یا للاخوان یا للاخوان یہ بانگ جرس سنتے ہی سب موٹر میں اپنی اپنی جگہ بیٹھنے لگے میں نے گھڑی دیکھی پونے چار (ہندی وقت کے مطابق پونے گیارہ بجے رات) بج رہے تھے، اب کے موٹر بنّی کے بجائے احمد نے سنبھالی اور سفر شروع ہوگیا کوئی دس بارہ کلومیٹر آگے جانے کے بعد جب بدر کی پہاڑیاں ختم ہوگئیں اور ساحلی علاقہ شروع ہوگیا تو آگے ینبع کا چوراہا ملا یہاں سے ہم جدہ کا راستہ چھوڑ کر شمال کی طرف مڑ گئے اور ینبع کا راستہ اختیار کیا، چونکہ آدھی رات کا وقت تھا اس لئے یہ ساٹھ ستر کلومیٹر کا راستہ اونگھتے اونگھتے ہی کٹ گیا اور ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ (ساڑھے بجے رات) ینبع بحر میں داخل ہوگئے یہاں پہونچ کر اس فیصلہ میں کچھ دیر لگ گئی کہ ہم سیدھے ینبع نخیل چلے چلیں (جو وہاں سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور ریت اور چٹیل میدان کے درمیان واقع ہے) یا یہیں ینبع بحر میں رک جائیں اور بقیہ رات آرام کرنے کے بعد ینبع نخیل چلیں، بالآخر فیصلہ یہی ہوا کہ ینبع بحر میں رک جائیں، چنانچہ وہاں قہوہ خانہ کی تلاش کے ساتھ پنچر جوڑنے والے کی دوکان کی بھی تلاش شروع ہوئی تاکہ ینبع اور بدر کے درمیان فیل ہو جانے والے پہیے کی مرمت ہو سکے آخر وہیں قریب کے ایک قہوہ میں آرام کیا گیا۔

صبح سویرے اٹھ کر فجر کی نماز قہوہ خانہ کی مسجد میں ادا کی گئی ابھی موٹر کا پہیہ ٹھیک

کرانا تھا اس لئے موقع غنیمت شمار کر کے ہم چاروں ہندوستانی ینبع بحر کی سیر کو نکل پڑے۔

ینبع ایک قدیم اور مشہور و معروف شہر ہے جس کا شمار حجاز کے زرخیز اور تجارتی شہروں میں ہوتا ہے، قدیم جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے یہ بھی مدینہ ہی کا ایک حصہ ہے اور آج بھی مدینہ کی بندرگاہ کے نام سے مشہور ہے، آخر زمانہ میں آکر مدینہ سے اس کا جغرافیائی تعلق ختم ہوگیا، یہ شہر قدیم آلۂ مسافت کے اعتبار سے مدینہ سے چار سن کی مسافت پر واقع ہے عربی زبان میں نبع الماء کے معنی پانی نکلنے کے ہیں اور اس کا نام ینبع (مضارع کا صیغہ) اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہاں پانی کے کنوؤں اور چشموں کی بڑی کثرت تھی بعض مورخین کے بیان کے مطابق ایک سوستر چشمے یہاں موجود تھے، اس کی آبادی قبائل جہنیہ، لیث انصار پر مشتمل تھی۔

ابن شیبہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے ینبع کی کچھ زمین بطور جاگیر عطا کی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی زمین سے ملا کر کچھ اور زمین خریدی۔

حضرت عمار ابن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ینبع کے قریب ذی عشیر نامی علاقہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے جاگیر کے طور پر کچھ زمین عطا کی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک اور حصہ دیا اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود کچھ زمین خریدی، ینبع میں مال کی حیثیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ متفرق چشمے تھے جس کو انھوں نے صدقہ کر دیا۔

احمد بن ضحاک نے روایت کی ہے کہ ابوفضالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے ینبع پہونچے تو انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا، آپ کیوں یہاں

خوامخواہ پڑے ہیں؟ اگر خدانخواستہ آپ کا وقت آ گیا تو قبیلہ جہنیہ کی مدد کے علاوہ دوسرا کون ملے گا، مدینہ چلئے وہاں دوست احباب سبھی موجود ہیں حضرت رضی اللہ عنہ نے جواب دیا. میں اس درد سے تو مرنے رہا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارے میں بڑے یقین کے ساتھ فرمایا ہے کہ میں خود نہیں مروں گا بلکہ مارا جاؤنگا۔

سمہودی کی مذکورہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ینبع علویوں ہی کے قبضہ میں رہا اور وہاں حسنی خاندان کے لوگوں کا دور دورہ رہا۔

جدید تقسیم یا اقتصادی اعتبار سے ینبع دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک ینبع بحر (سمندری ینبع) دوسرا ینبع نخیل (نخلستانی ینبع) ینبع بحر کا اطلاق اس شہر پر ہوتا ہے جو ساحل پر آباد ہے اور جہاں سے دوسری جگہ کشتیاں آتی جاتی ہیں خاص کر مچھلی کا شکار یہاں کی بڑی آمدنی اور تجارت تھی، قدیم زمانہ میں تو نہ جانے کہاں کہاں جہاز آتے جاتے رہے ہونگے لیکن آخری وقت میں یہ بندرگاہ بہت محدود ہوگئی اور اس کی رہی سہی رونق بھی جدہ نے چھین لی۔

بحر احمر کی اس قدیم اور مدنی بندرگاہ کو سعودی حکومت دوبارہ اعلیٰ پیمانہ پر استعمال کے قابل تیار کرا رہی ہے، غیر ملکی کمپنیاں رات دن گودی بنانے کے کام میں مصروف ہیں کافی لمبی چوڑی گودی اور وسیع وعریض بندرگاہ پر بیک وقت کئی جہاز رک سکیں گے، اس کا مقصد یہ ہے کہ بندرگاہ جدہ کا بار کچھ کم کیا جائے اور جہاز جدہ اور ینبع دونوں جگہ ٹھہرا کریں، جدہ کے کسٹم آفیسر نے اپنے ایک حالیہ بیان میں کہا تھا کہ چار مہینہ میں کام مکمل ہو جائے گا اور یہ واقعہ ہے کہ جس تیزی سے کام ہو رہا ہے چار ماہ اس کے لئے کافی ہیں، ادھر وزارت حج واوقاف چاہتی ہے کہ ینبع کو حاجیوں کی خاص بندرگاہ بنایا جائے اور ینبع ہی میں حجاج اترا کریں، بلکہ اس کا خیال ہے کہ حجاج کو ینبع بندرگاہ پر اتارنے کا کام اسی سال سے شروع کر دیا جائے۔

اس پروگرام کے مکمل ہوجانے کے بعد ینبع بحر خود بخود اپنی کھوئی عظمت ورونق واپس لے لیگا، وہاں کی میونسپلٹی بڑی تیزی سے تعمیری اقدام اٹھارہی ہے، بجلی پانی کی سپلائی اور فراہمی کا معقول انتظام ہے، اس کی زمینوں پر تعمیری کام جاری ہے بڑی بڑی دوکانوں اور ہوٹلوں کے لئے مناسب جگہ تجویز کی جاچکی ہے، وزارت حج و اوقاف نے ایک شاندار مسجد تعمیر کرنے کی منظوری دیدی ہے ویسے سمندر کے کنارے والی آبادی میں چار پانچ مسجدیں اور اس سے ملی ہوئی شمالی آبادی میں دوتین بڑی مسجدیں نظر آرہی تھیں، چونکہ ہم لوگ بغیر امیر کی اجازت کے صبح اٹھ کر بھاگے چلے آئے تھے اس لئے ینبع کی تھوڑی دیر سیر کی اور واپسی میں ایک قہوہ خانہ میں فول کا ناشتہ کر کے چائے پی گئی اور اپنی قیام گاہ پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ موٹر پہیہ درست کرا کے واپس نہیں آئی، اب ہم اطمینان سے بیٹھ کر بس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

ڈیڑھ گھنٹہ دن نکلنے کے بعد کوئی ڈیڑھ بجے بس آئی اور ہم اس میں سوار ہوکر بیٹھ گئے، کوچ سے پہلے امیر کارواں نے جب جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دولڑکے نہیں ہیں، ان کے آنے کے بعد ہمارا کارواں ینبع نخیل کے لئے روانہ ہوا۔

ینبع نخیل ینبع بحر سے پچاس ساٹھ کلومیٹر دوری پر واقع ہے دونوں کے درمیان سوائے میدان اور ریت کے اور کہیں کچھ نہیں ہے ریت اور بالو کی وجہ سے کوئی سڑک بھی نہیں بن سکی ہے بلکہ موٹر والے اپنے اپنے اندازہ سے جس طرف چاہتے ہیں لے جاتے ہیں، اسی لئے ناواقف ڈرائیور بہت گھبراتا ہے، آدھ گھنٹہ کے بعد ہم اس چٹیل میدان میں ایک پکے مکان کے پاس سے گذرے جس کے پاس دوتین بیری کے درخت تھے کیا معلوم تھا کہ یہی ہمارا مسکن اور قیام گاہ ہوگا، یہاں سے آگے بڑھ کر ابھی چار پانچ کلومیٹر آگے گئے ہوں گے کہ موٹر کا ایک پچھلا پہیہ جواب دے گیا، نا معلوم اور ریت کے میدان آگے بڑھنا مصلحت نہ سمجھ کر اسی مکان کے پاس واپس آئے

جہاں دو تین درخت تھے، طے ہوا کہ یہیں خیمہ لگا کر کھانے پکانے کا انتظام کیا جائے اور بس ینبع بحر جا کر مرمت ہو کر آئے تو آگے سفر جاری کیا جائے چنانچہ اللہ کا نام لے کر اس صحراء لق ودق میں خیمہ نصب کر دیا گیا۔

یہ جگہ اس صحراء میں انسان وحیوان دونوں کے لئے بڑی اہمیت اور مرجع خلائق کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ سعودی حکومت ینبع بحر والوں کو پینے کا پانی ینبع نخیل سے ایک پچاس ساٹھ کلومیٹر لمبی پائپ لائن کے ذریعہ مہیا کرتی ہے اور وہ پائپ لائن جگہ جگہ اس صحراء میں بھی کھولدی گئی ہے جس کی وجہ سے ینبع بحر والوں کے علاوہ اس صحراء کے بسنے والے بدو اور ان کے جانور بھی اس کے ذریعہ مستفید ہوتے ہیں، اسی سے متصل حکومت نے ایک مکان بنا دیا ہے جو محافظ کے رہنے کے علاوہ عام مسافروں کی قیام گاہ کے کام بھی آتا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ینبع والے اسے تفریح گاہ کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔

ینبع نخیل کیلئے ہم جب صبح ینبع بحر سے روانہ ہوئے تو ہمارا رخ مشرق کی طرف تھا میں نے دیکھا کہ بہت دور ہمارے سامنے مشرق میں بھی سمندر کا پانی پہاڑوں کے دامن میں موجیں مار رہا ہے لیکن خیمہ نصب کرنے کے بعد ایک عرب ساتھی نے جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر کرتے ہوئے بتلایا کہ دیکھو قرآن کی مثال کس قدر صحیح ہے کہ ہم اپنے چاروں طرف اس لق ودق صحراء میں پانی دیکھ رہے ہیں، حالانکہ ہم انھیں راستوں سے ابھی گذرے ہیں پانی کا نام ونشان نہیں تھا یہی ہے سراب جسے دیکھنے والا تو پانی سمجھتا ہے لیکن قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ پانی نہیں دھوکہ ہے، عربی ،فارسی اور اردو سبھی شعراء واد باء اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں میں نے بھی کئی مرتبہ پڑھا لکھا ہوگا لیکن اس کی حقیقت اتنے قریب سے آج دیکھنے میں آئی۔

جوں جوں وقت گذرتا جاتا پانی پر اترنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا

جاتا، دوپہر کے وقت جدھر سے دیکھئے بکری اوراونٹوں کے گلے پانی پینے نل کے پاس ہی بنے ہوئے حوض پر چلے آرہے ہیں، بکریوں کو چرانے والے عام طور پر چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں البتہ اونٹ لانے والوں میں بچوں کے ساتھ بڑوں کا ہونا یقینی ہوتا اونٹ کے گلے دوقسم کے ہوتے تھے ایک تو چرتے چرتے صرف پانی کیلئے آنے والا گلہ دوسرا گلہ پانی پینے والا اوراپنے مالک کے لئے پانی لے جانے والا ہوتا، اس گلہ کے تمام اونٹوں کی پشت پر مشک اورٹین بندھے ہوتے جن میں پانی بھر کے لے جایا جاتا، چونکہ اونٹ ایک مرتبہ اتنا پانی پی سکتا ہے کہ کم ازکم چاردن کے لئے کافی ہو،اس لئے اونٹ والے اپنے استعمال کے لئے پانی بھی اسی حساب سے لے جاتے ہیں کہ چاردن تک کی ضرورت پوری ہوتی رہے ورنہ چالیس پچاس کلومیٹر سے پانی کے لئے روزانہ آنا بڑا مشکل کام ہے اگرچہ یہ مسافت ان کے نزدیک نہ ہونے کے برابر ہے ،ایک بدو سے پوچھا گیا کہ تمہاری بستی کدھر ہے؟ یہاں سے قریب ہے یا بعید؟ تو اس نے کہا نہیں بالکل قریب ہے یہ کہہ کراس نے کہا دیکھو اس پہاڑی کے دامن میں ہے اور ہم نے اندازہ لگایا چالیس کلومیٹر سے کم مسافت نہ رہی ہوگی،

دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بکری چرانے والوں کا ایک گروپ آیا جس میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ ایک عورت بھی تھی جو ایک کالے اورموٹے کپڑے میں مندھی ہوئی تھی وہ بکریوں کے پانی پلانے کے سلسلے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ یہاں رہی لیکن نہ جانے پردہ کی سخت پابند یا مردوں سے اس قدر متنفر تھی وہ ان درختوں کے سایہ میں بھی نہ بیٹھی اور مسلسل کھڑی رہی، نل کے پاس پانی پینے کے لئے جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہم نے اسے اس وقت دیکھا جب ایک لڑکے نے ہم سے لوٹا مانگا ہم نے پوچھا کیا کروگے تو اس نے بتلایا کہ ہمارے ساتھ وہ عورت ہے اس کو پانی دینا ہے ہم نے دیکھا تو وہ کافی دور بکریوں کے ریوڑ کے قریب بیٹھی تھی چونکہ عام طور پر

بکریوں کا رنگ کالا تھا اس کے برقعہ کا رنگ بھی کالا پھر وہ بیٹھی ہوئی تھی اس لئے ہم کو نظر نہ آسکی ہم نے اس لڑکے سے ازراہ انسانیت کہا کہ ارے اس سے کہو کہ آکر یہاں سایہ میں بیٹھے لڑکے نے کہا اچھا میں جا کر کہتا ہوں بکریوں کے پانی پلانے کے بعد ان کو لاکر سایہ میں کھڑا کیا اور ان کے آخر میں خود وہ عورت بیٹھی جس پر شاید ایک ٹہنی کا سایہ تو ضرور ہی پڑتا رہا۔

عربوں کی ضیافت کے بارے میں بہت کچھ پڑھا لکھا تھا اس کا یک ہلکا سا عکس یہاں نظر آیا، ہوا یہ کہ اونٹ والوں کا ایک گروپ پانی لینے کے لئے آیا جس کے ساتھ صاف شفاف عربی لباس پہنے ہوئے عرب بھی تھا، معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بستی کا بڑا آدمی ہے اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا جسے وہ ینبع بحر پڑھنے کے لئے لے جا رہا تھا وہ عرب جب ہمارے پاس آکر بیٹھا تو ہم نے ازراہ اخلاق وانسانیت اس کو بلایا اور اکرام تعظیم سے بیٹھایا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے ہم سے ایک بہت بڑا پیالہ جو سامنے پڑا تھا مانگا ہم نے کہا لے لیجئے اس نے وہ لیکر اپنے ایک آدمی کو دیا ہم نے دیکھا کہ وہ جا کر اونٹنیوں کا دودھ دوہنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد تین چار اونٹنیوں کا دودھ دوھ کر لایا اور اس عرب نے ہمارے امیر صاحب کو پیش کیا انھوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کی لیکن ہم لوگوں نے اونٹ کا تازہ دودھ جو سامنے دوھ کر لایا گیا تھا ایک عرب ہدیہ سمجھ کر ایک ایک گھونٹ پیا۔

پروگرام کے مطابق دوسرے دن عصر کی نماز پڑھ کر ینبع نخیل کے لئے روانہ ہوئے چونکہ اب ینبع نخیل میں صرف مغرب وعشاء تک کا وقت گذارنا تھا اس لئے تین چار آدمی تو یہیں ڈیرے پر سامان وغیرہ کی حفاظت کے لئے رہ گئے اور بقیہ حضرات ہمارے ساتھ ہو لئے لیکن واہ رے قسمت یا موٹر کی مکان شناسی کہ عین اسی جگہ جہاں کل پنچر ہونے کا حادثہ پیش آچکا تھا پہونچتے ہی ایک دھماکہ کے ساتھ موٹر کے

پہیے نے اپنے احتجاج کا اعلان کرتے ہوئے ہم کو ینبع نخیل کی زیارت سے محرومی کا چیلنج دے دیا چونکہ یہاں سے منزل مقصود کی مسافت بہت زیادہ تھی اور تقریباً تیس چالیس کلومیٹر کا راستہ تھا اس لئے بلا اختلاف رائے موٹر کو وہیں چھوڑ کر اپنے خیمہ کی طرف رجعت قہقری کی گئی اور تقریباً آدھ گھنٹہ ریت میں چلتے رہنے کے بعد ینبع نخیل کی حسرت لئے خیمہ پر واپس آئے اور ڈرائیور موٹر ٹھیک کرانے کے لئے ینبع بحر واپس لے گئے۔

موٹر کے بار بار جواب دینے نے ینبع نخیل کی زیارت کے علاوہ مدینہ کی واپسی کا مسئلہ بھی لاکر کھڑا کر دیا کہ اگر موٹر کا یہی حال رہا تو یہ قافلہ مدینہ کیونکر پہونچ سکے گا، بعض احباب کا مشورہ تھا کہ ینبع بحر سے ٹیلیگرام کرکے مدینہ سے دوسری بس لائی جائے لیکن ٹیلیگرام کے پہونچنے اور اس کے بعد وہاں سے دوسری بس آنے تک کا انتظار بہت مشکل تھا، بہر حال خدا خدا کرکے رات گذاری گئی، تہائی رات گذرنے کے بعد موٹر درست ہو کر آ گیا لیکن اب یہ غیر معتبر ہو چکا تھا۔

صبح اٹھتے ہی فجر کی نماز ادا کی گئی اور دن نکلتے نکلتے ہمارا قافلہ ریتیلے میدان کے اس خوشگوار اور سرسبز مقام کو فی امان اللہ کہتا ہوا آگے بڑھا اور تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد ینبع بحر پہونچ گیا، اگرچہ ینبع نخیل نہ پہونچنے کی وجہ سے تقریباً سبھی پژمردہ خاطر تھے لیکن **مالا یدرک کله لا یترک کله** کے قاعدہ کے مطابق یہ ہوا کہ پرسوں رات میں تو ہم لوگ یہاں سے صرف راستہ کی حیثیت سے گذرے تھے لاؤ تھوڑی دیر اسی کا چکر لگائیں چنانچہ ساحل پر گئے جہاں ہم چاروں پہلے بھی جا چکے تھے اور تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے اور مدینہ واپسی کے لئے بدر کا راستہ اختیار کیا گیا۔

سفر جاری رہا کچھ سوتے رہے کچھ اونگھتے رہے اور کچھ منظر بینی کرتے رہے

اور جب بدر اور ینبع کے بیچ میں پہونچے تو وہی پرانا حادثہ پیش آیا جس کے لئے کان مانوس ہو چکے تھے اگر چہ حادثہ پرانا تھا لیکن جائے وقوع کے اعتبار سے یہ بڑا اہم تھا کیونکہ اتنے آدمیوں کے پینے کیلئے پانی کا مسئلہ یہاں تقریباً لا ینحل تھا دوسری چیزوں کا تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ابھی ذہنوں کو اس موضوع پر زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ڈرائیور اور امیر کارواں کی ملی جلی **توکلوا علی اللہ** کی آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور سفر جاری ہو گیا، جوں جوں بدر قریب آتا گیا ایک کریہہ قسم کی بو موٹر میں بیٹھنے والوں کو پریشان کرتی گئی، خدا خدا کر کے جب بدر آیا اور ایک قہوہ خانہ کے سامنے موٹر رکا تو موٹر کے پہیے کا تماشہ دیکھنے کے لئے تقریباً سبھی ادھر بڑھے اور یہ دیکھ کر سب دنگ رہ گئے کہ پہیے کے ٹیوب اور ٹائر دونوں سے دھواں نکل رہا ہے اور دونوں جل کر بالکل بیکار ہو چکے ہیں، فوراً پانی لا کر دھوں ختم کیا گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہم کو موٹر میں آگ لگنے جیسے خطرناک حادثہ سے بچا لیا ورنہ بظاہر آگ لگنے میں کوئی دیر نہیں تھی، بعض ساتھیوں نے ڈرائیور سے کہا کہ تم نے یہ کیا غضب کیا؟ اس نے کہا ہمارے لئے دونوں خطرے برابر تھے وہاں بھوک اور پیاس کا خطرہ تھا یہاں آتش زدگی کا جو خلاف توقع دور ہو گیا۔

بدر میں ساڑھے تین چار گھنٹے دن نکلنے کے بعد پہونچے اور قہوہ خانہ میں بیٹھ کر پہلے تو چائے ناشتہ کیا گیا اس کے بعد ہر شخص مطمئن ہو کر کرسیوں پر دراز ہو گیا، ظہر سے کچھ پہلے معلوم ہوا کہ موٹر کا ٹیوپ ٹائر دونوں بدلا جا چکا ہے اب کوچ کے لئے تیار رہنا چاہیے، چنانچہ تھوڑی دیر بعد چھ بجے (ٹھیک دوپہر میں) بدر سے روانہ ہوئے تقریباً گھنٹہ بعد حنیف پہونچے اور وہاں کی ایک مسجد میں ظہر کی نماز با جماعت ادا کی گئی، حنیف پہاڑوں کے دامن میں ایک آباد اور سرسبز علاقہ ہے جو مدینہ سے تقریباً ایک سو کلو میٹر دور بدر اور مدینہ کے درمیان واقع ہے یہاں کے پرانے مکانات اور

باغات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے اس ملک کی آبادیوں میں سے ایک بڑی اور بارونق آبادی رہی ہوگی لیکن اب یہاں کے باشندے اپنا اپنا گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جاچکے ہیں اور ان کے مکانات کھنڈرات کی شکل میں منتقل ہورہے ہیں جنھیں دیکھ کر ہم نے نماز کے بعد ایک امام صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ سب مکانات آباد ہیں؟ تو انھوں نے پانی کے اس چشمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو مسجد کے نیچے سے نالے کی شکل میں کافی گہرائی سے گذرتا ہے بتلایا کہ یہ چشمہ جو تم تھوڑا بہت بہتا ہوا دیکھ رہے ہو یہ صرف ابھی دوسال سے چالو ہوا ہے ورنہ یہ درمیان میں بالکل بند ہوگیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں کے لوگ پانی سے محروم اور پانی سے محرومی کا لازمی نتیجہ موت، چنانچہ لوگ گھر بار چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے اب آہستہ آہستہ چشمہ دوبارہ جاری ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آرہے ہیں۔

یہاں ترکوں کے دور کا ایک قلعہ بھی ہے جو اب منہدم ہوچکا ہے یہ مسجد جس میں ہم نے نماز پڑھی تھی اسی قلعہ سے متصل ہے اور اسی دور کی بنی ہوئی ہے اس کے بھی اکثر حصے مرمت طلب ہیں اس مسجد کی اگلی دیوار پر بہت سی تحریریں نظر آتی ہیں کسی میں کلمۂ شہادت لکھا ہوا ہے تو کسی میں کوئی حدیث لکھی ہوئی ہے کسی میں کوئی اچھی نصیحت ہے یہ تحریریں عام طور پر ایسی ہیں جیسی دہلی وغیرہ کی قدیم عمارتوں میں سیاحوں کے ہاتھوں کی تحریریں ہوئی ہیں اس لئے مشکل سے پڑھی جاتی ہیں البتہ عربی کا ایک شعر کئی ایک جگہ نظر آیا جو غور کرنے کے بعد بآسانی پڑھا جاسکا۔

شهدت شهادة لاريب فيها — بان الله ليس له شريك

وان محمداًعبدرسول — الى الثقلين ارسله المليك

ظہر کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک قیلولہ ہوتا رہا اس درمیان میں استاذ عبدالحق محروسی اور استاذ وکیل احمد صاحب مختلف قسم کے تاریخی واقعات وعجائبات کے

موضوع پر چند طالب علموں کو معلومات بہم پہونچاتے رہے جو بڑے غور اور دلچسپی سے دوستانہ ماحول میں سنتے اور سوال و جواب کرتے رہے۔

حنیف سے روانگی کو ابھی مشکل سے دس پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ وہی پرانا حادثہ اللہ اکبر اب تو ہم نے باتفاق رائے یہ منظور کرلیا اب اس موٹر میں ہرگز نہیں بیٹھیں گے اس کے بعد ہمارے سامنے صرف تین راہیں تھیں، اولاً یہیں بیٹھ کر کسی ٹیکسی یا بس کا انتظار کریں ثانیاً پیدل آگے بڑھ کر آنے والی منزل تک پہونچ جائیں ثالثاً پیچھے لوٹ کر حنیف جائیں اور یہ تینوں راہیں کٹھن تھیں دھوپ سخت تھی اس لئے بیٹھ کر دوسری بس کا انتظار کرنا مشکل تھا وہ تو ایک ٹرک والے نے ایک بالٹی پانی عنایت کر دیا ورنہ ہمارا برا حال ہوتا، اس درمیان میں موٹر کے ایک ڈرائیور محمد احمد کو مدینہ روانہ کر دیا گیا کہ جا کر جامعہ سے نئی بس لائے اس کے جانے کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ایک ''اونیٹ'' چھوٹی ٹرک نما بس سے ساٹھ ریال پر معاملہ طے ہو گیا کہ وہ مدینہ پہونچائے چنانچہ اس نے آگے جا کر حنیف میں سامان اپنا اتارا اور واپس آ کر ہم میں سے اکثر و بیشتر کو لاد کر مغرب کے وقت مدینہ لایا اس طرح خدا خدا کر کے ہمارا رحلۂ ینبع ختم ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆

از: مولانا خالد کمال مبارکپوری مقیم گھانا مغربی افریقہ

گذشتہ سال نومبر کے آخراور دسمبر کے شروع میں مولانا خالد کمال مبارکپوری سلّمہٗ مبعوث دارالافتاء سعودی عرب برائے گھانا نے افریقہ کے چار ملکوں لائبیریا، سیرالیون، گامبیا اور سینیگال کا علمی و تعلیمی اور ثقافتی دورہ کیا تھا جو دو ہفتے میں پورا ہوا اس درمیان میں انھوں نے اپنے والد محترم مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے پاس جو خطوط روانہ کئے وہ اگرچہ ذاتی تھے مگران میں ان علاقوں کے مسلمانوں کے بارے میں بہت سی قیمتی اوراہم معلومات تھیں اس لئے ان خطوط کے ضروری حصوں کو پیش کیا جارہاہے امید ہے کہ قارئین کے لئے ان میں دلچسپی ہوگی۔

لائبیریا

۹؍محرم ۱۴۰۰ھ ۲۸؍نومبر ۱۹۷۹ء چہارشنبہ

محترم ومکرم حضرت والد ماجد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہ تعالیٰ میں ہر طرح بخیر وعافیت ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی بخیریت ہوں گے، پروگرام کے مطابق سلمان مبشر (برادر خورد مبعوث دارالافتاء) جب جمعرات کو بھی نہیں آئے تو تشویش ہوئی مگر بس واجبی سی کیوں کہ معلوم تھا کہ کہیں بھی کوئی نقطہ پیدا ہو گیا ہوگا، پھر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور اتوار ۲۵؍نومبر کو دوپہر میں پہونچے اور ہم سب کو اطمینان ہوا۔

دوسرے دن یعنی ۲۶؍نومبر دوشنبہ کی شام کو ۶؍بجے مجھے ایئرپورٹ پہونچنا تھا کیونکہ میں نے لائبیریا، سیرالیون، گامبیا اور سینگال کے دورہ کا پروگرام بنا رکھا تھا، سلمان کے اس اتوار کو نہ آسکنے کی وجہ سے کینسل کر دیا تھا، اب اس کو عملی جامہ پہنانا تھا، گامبیا کے علاوہ باقی تینوں ملکوں کا ویزہ اکرا سے حاصل کر لیا تھا، کیوں کہ اکرا میں گامبیا کا سفارت خانہ نہیں ہے، اور سفر کی دوسری تیاری بھی پہلے سے مکمل تھی، صبح سلمان کے ساتھ سعودی سفارت خانہ گیا، سفیر صاحب لندن ہو کر ایک دن کے بعد اکرا پہونچنے والے تھے، وہاں سے دو بجے حسب سابق واپسی ہوئی کھا پی کر قیلولہ کیا گیا، شام کو چار بجے سفر کی تیاری شروع ہوئی ایک بریف کیس میں کچھ کاغذات دوسرے میں دو ایک جوڑے کپڑے رکھے اور ایئرپورٹ چلے گئے، چونکہ شام کا وقت تھا اس لئے عمر انصاری عبدالرحمان وغیرہ کے علاوہ غلام محمد چودھری بھی موجود تھے، پان امریکن کا جمبو جیٹ رات کو آٹھ بجے اکرا سے روانہ ہو کر ساڑھے نو بجے رابرٹ فیلڈ لائبیریا کے

انٹرنیشنل ایرپورٹ پہونچا، جو دارالسلطنت منرودیا سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہاں پان امریکن کمپنی میں ایک عثمانی صاحب کام کرتے ہیں، ان سے اکرا سے جان پہچان تھی، ان کے دفتر میں چلا گیا وہ وہیں تھے بلکہ ڈیوٹی کے طور پر جہاز کا دروازہ خود انھوں نے اپنی نگرانی میں کھلوایا تھا، کہنے لگے کہ مجھے کیا معلوم کہ تم اسی میں ہو، میں نے کہا کہ اسی لئے تو میں نے اطلاع نہیں دی، بہرحال انھوں نے کہا بیٹھو اب تو جب جہاز روانہ ہوجائے گا تب ہی میں فارغ ہوں گا، میں نے ان کے کمرے میں بیٹھ کر کچھ پڑھتا لکھتا رہا، گیارہ بجے کے قریب وہ فارغ ہوگئے اور ہم لوگ ان کی کمپنی کی گاڑی میں بیٹھ کر ان کے گھر آئے، انھوں نے اپنی بیوی کو وہیں سے ٹیلیفون کردیا تھا، یہ عثمانی صاحب حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتی مشہور مفسر قرآن اور مالابدمنہ کے مصنف کے پوتے کے اوپر کچھ نروتے وغیرہ ہوتے ہیں، بہت بے تکلف اور مجلسی قسم کے آدمی ہیں، یہاں بعض احباب سے میرا تعارف کرایا کہ یہ ہمارے مولوی صاحب ہیں، اکرا سے پیچھے پڑے ہیں ہمیں مسلمان بنانے کے لئے، اور اب یہاں بھی آپہونچے ہیں۔

ان کا گھر کیا ہے، دومنزلہ کوٹھی ہے اکثر و بیشتر کمرے بے کار پڑے ہیں ایک کمرہ محافظ کے لئے خاص ہے، اوپر کے کمروں میں رہتے ہیں، ہر کمرے میں ایرکنڈیشن لگا ہوا ہے مجھے جو کمرہ دیا ہے اس میں ایرکنڈیشن ہے مگر میں نے روک دیا ہے، ابھی ابھی پوچھ رہے تھے کہ مولوی صاحب! آپ کا ایرکنڈیشن کام نہیں کررہا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں، کام کررہا ہے اور خوب کررہا ہے میں نے توڑا پھوڑا نہیں ہے، مگر نہ میں اس کا عادی ہوں نہ اس کی ضرورت محسوس کررہا ہوں اس لئے بند کردیا ہے۔

منگل کی صبح کو ان کی ڈیوٹی نہیں تھی، اس لئے وہ صبح دس بجے تک سوتے رہے، میں نے ان کے بچوں کے ساتھ ناشتہ کرلیا، جو اسکول سات ہی بجے چلے جاتے ہیں،

وہ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ساتھ کھا کر نکلے تو شام کو واپسی ہوئی ، بازار لوا گئے، دو تین لوگوں سے ملاقاتیں کرائیں اور منر دویا میں دارالافتاء کے سیرالیونی مبعوث سے ملاقات کرائی ،اس سے طے ہوا کہ میں کل صبح یعنی آج بدھ ۹ر محرم کو صبح آٹھ بجے آجاؤں تو یہاں کے رئیس اتحادالھیئات سے ملاقات کے لئے چلیں گے، چنانچہ صبح گیا، وہ کہیں نکل گئے تھے، پھر اور ایک صاحب کی ملاقات کے لئے چلے گئے، دوپہر کو بارہ بجے رئیس صاحب واپس آئے ان سے پانچ منٹ تک ملاقات رہی، طے ہوا کہ رات کو آٹھ بجے میں آؤں۔

اس اثناء میں وہ شہر کے چیدہ چیدہ مسلمان افراد کو اطلاع دے کر بلوالیں، پھر ان سے ایک تعارف ہوگا اور میں ان سے کچھ کہونگا، میں نے کہا ٹھیک ہے، پھر دوپہر کو ایک بجے عثمانی صاحب کے یہاں واپس آگیا اور بیٹھ کر یہ خط لکھنے لگا۔

والسلام

☆☆☆☆☆☆☆

لائبیریا

۱۳ر محرم ۱۴۰۰ھ ۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء

محترم ومکرم حضرت والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں ہر طرح بخیر وعافیت امید کہ آپ حضرات بھی بخیر و عافیت ہوں گے ، میں یہاں سے ایک خط اس سے پہلے روانہ کر چکا ہوں لیکن ہوسکتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ ملیں کیونکہ وہ خط نئی جگہ ہونے کی وجہ سے سنیچر کی شام کو دیر سے پوسٹ کیا، اور یہ خط دوشنبہ کو کل پوسٹ کروں گا۔

جیسا کہ پہلے خط میں لکھ چکا ہوں شام کو آٹھ بجے چہارشنبہ ۲۸ر نومبر، ۹ر محرم تاسوعاء (یہاں محرم کا نام ونشان تک نظر نہیں آیا) یہاں اسلامی تنظیموں کے سر براہ ''الحاج دار مینا کورنہ'' کے دولت کدہ پر ایک اجتماع ہونا طے پایا جس میں انھوں نے شہر کے چیدہ چیدہ اور اسلامی تنظیموں کے سر براہوں کو طلب کیا تا کہ یہاں کے مسلمان لیڈروں اور ذمہ داروں سے ایک تعارف ہو جائے ہم رات کو ساڑھے سات بجے ہی اس علاقہ (وایاٹاؤن) پہونچے، وہیں کی ایک مسجد میں جو دن میں مدرسہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے عشاء کی نماز ادا کی، پھر ٹھیک آٹھ بجے ان کی قیام گاہ پر پہونچے، وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے، اور کچھ لوگوں کا انتظار ہو رہا تھا، موضوع مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام کا وہ حادثہ تھا جس نے دنیائے اسلام میں تہلکہ مچا رکھا تھا، تھوڑی دیر کے بعد الحاج کورنہ کی اجازت سے مجھے کہا گیا کہ میں کچھ کہوں، اگر چہ سیر الیونی مبعوث شیخ سلیمان سعید بطور مترجم موجود تھے مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ تم انگریزی ہی میں جو کہنا چاہتے ہو کہو، چونکہ یہ ایک قسم کی نجی مجلس تھی اس لئے میں آدھ گھنٹے تک اسلام کے لئے جدو جہد وایثار کے موضوع پر اس علاقہ کی تاریخ کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے بولتا رہا، پھر مناقشہ ہونے لگا اور دو ایک مقامی موضوع زیر بحث آئے، اور یہ سلسہ تقریباً رات کے گیارہ بجے تک چلتا رہا، آخر میں طے ہوا کہ ''الحاج فوفانا'' (جو یہاں کے ایک نہایت سرگرم مخلص اور مدرسہ کے مدیر ہیں) مجھے کل صبح جمعرات ۱۰ر محرم کو (جو اتفاق سے یہاں چھٹی کا دن تھا اور سابق صدر جمہوریہ کے یوم ولادت کے طور پر تعطیل عام تھی) مقامی مدرسے، مساجد اور اسلامی مراکز دکھلائیں گے وہ بے چارے پروگرام کے مطابق صبح ساڑھے نو بجے عثمانی صاحب کے گھر آ گئے، میں ان کے ساتھ معاینہ کے لئے نکلا، انھوں نے سب سے پہلے ایک لمبے چوڑے زیر تعمیر مدرسہ کی زیارت کرائی جو تکمیل کے بعد نہایت شاندار اسکول ثابت ہوگا، اس کی آدھی

تعمیر یعنی دومنزلہ تک پہونچ کررک گئی ہے کہ پیسہ ختم ہوگیا ہے،اب پیسے آئیں تو تعمیر مکمل ہوگی، پھرخود ان کے مدرسہ کا معاینہ کیا جو میری قیام گاہ (عثمانی صاحب کے گھر) سے قریب ہی تھا، یہ مدرسہ بھی اچھا خاصا ہے اور وزارت معارف کے تعاون سے اچھا خاصا چل رہا تھا، یہ پرائمری اسکول تھا،انگریزی ٹیچر حکومت نے دئے تھے، عربی ٹیچروں کا انتظام انھوں نے اپنے طور پر کیا تھا، وہاں سے پھرایک اور مدرسہ دیکھنے گئے وہ اس مدرسہ سے بھی زیادہ شاندار تھا اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کلاسیں خالی تھیں،اس اسکول کو حضرمی حکومت نے چار اساتذہ دئے ہیں، جن میں سے ایک پہونچ چکا ہے باقی تین بعد میں آئیں گے اس کے مدیر نے مدرسہ میں گھمایا پھرایا پھر وہاں سے نکل کر ایک مدرسہ دیکھنے گئے جو الجماعۃ السلفیہ نے قائم کیا تھا مگر ان کی زیر تعمیر مسجد ہی تک پہونچے، مدرسہ نہ دیکھ سکے، باقی وایا ٹاؤں کا مدرسہ جسے غالباً مولوی سعید مرکر (داماد شیخ سعد الدین) نے قائم کیا تھا، پہلے ہی دیکھ چکا تھا اس طرح ایک بجے کے لگ بھگ ان اسلامی مراکز ومدارس کو دیکھ کر واپسی ہوئی۔

سیرالیونی سعودی مبعوث نے پروگرام بنایا کہ کل جمعہ ۱۱رمحرم کو یہاں کی سب سے قدیم اور مرکزی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھوں اور تقریر کروں، طے ہوا کہ حاجی فونابا ہی آکر مجھے لیجائیں گے وہ بے چارے تو وقت پر آکر مجھے جامع مسجد لے گئے،لیکن خود سعودی مبعوث کافی لیٹ آیا،اس درمیان میں مجھے تقریر کرنے کو کہا گیا اور مترجم نہ ہونے کی شکل میں زور دیا گیا کہ میں انگریزی ہی میں بولوں ظاہر ہے کہ میں نے دس پندرہ منٹ یونہی بول کر ختم کر دیا بعد میں مترجم آیا تو بہت معذرت کی۔

درمیان میں ایک مقامی مبلغ وداعی کے ساتھ طے ہوا کہ سیرالیون ٹیکسی سے چلیں گے،مگر آج شام کو اس نے بتلایا کہ وہ دوشنبہ کو نہیں بلکہ منگل کو روانہ ہوسکے گا،اسلئے طے ہوا کہ کل دوشنبہ ۳ر دسمبر مطابق ۱۴رمحرم کی صبح عثمانی صاحب کے ساتھ

ایرپورٹ چلے جائیں گے، وہ کسی نہ کسی جہاز میں ایک سیٹ نکال کر ہمیں سیرالیون کے لئے سوار کردیں گے، پھر وہاں پہونچ کر خط لکھوں گا انشاء اللہ۔ والسلام

☆☆☆☆☆☆☆☆

سیرالیون

۱۸؍محرم ۱۴۰۰ھ مطابق ۷؍دسمبر ۱۹۷۹ء جمعہ

محترم ومکرم حضرت والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں بخیریت ہوں امید کہ آپ حضرات بھی ہر طرح بخیر و عافیت ہوں گے، اس سے قبل ایک لفافہ فری ٹاؤن سے روانہ کرچکا ہوں ملا ہوگا جس میں یہاں بخیریت پہونچنے اور دو دن بعد دورہ کا ماحصل درج کردیا تھا۔

یہاں لبنانیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور اکثر وبیشتر کا تعلق جنوب لبنان سے ہے ایک صاحب کے بقول چھ سات ہزار ہوگی، لیکن ایک ماہر لسانیات کے بقول بیس ہزار سے زیادہ ہی ہوگی دونوں کی باتیں یوں صحیح ہوسکتی ہیں کہ چھ سات ہزار فری ٹاؤن میں باقی دوسرے شہروں میں ہونگے، معلوم ہوا کہ سیکڑوں برس پہلے لبنانیوں کا ایک قافلہ بحری راستہ سے امریکہ جانے کے لئے افریقہ کے مغربی ساحل تک آیا لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے وہ آگے نہ بڑھ سکا اور اسی علاقہ میں آباد ہوگیا۔

بہرحال یہاں کے لبنانی بقول شخصے سو فیصدی شیعہ ہیں، گھانا اور لائبیریا کی طرح تجارتوں پر قابض ہیں، انھوں نے جلد ہی ایک لبنانی نوجوان شیعہ عالم الشیخ حسین احمد شحاوہ کو بلاکر دو اسلامک سنٹر ایک ہی عمارت میں کھول رکھا ہے ایک کا نام

الجمعية الثقافية الاسلامية یا مسلم کلچر سوسائٹی ہے اور دوسرے کا نام ارسالية هلال الاسلامية یا ہلال مسلم مشن ہے، روڈان اسٹریٹ کی ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر ایرکنڈیشن کمروں پر مشتمل یہ سنٹر یہاں کے سرگرم سنٹروں میں شمار ہوتا ہے، ان سے ملاقات کے لئے شیخ جبریل سیسی مجھے لے کر گئے تو شیخ شمارہ نے بدھ کی شام کو عشاء بعد مدعو کیا کہ تفصیلی بات چیت ہوگی، انھوں نے ملاقات کے دوران اپنے پروگرام بتلائے جن میں مرکز کی مستقل عمارت کی تعمیر جس میں مدرسہ، مسجد اور امام باڑہ وغیرہ بھی شامل ہونگے اس سنٹر کے جملہ اخراجات یہاں کے لبنانی شیعہ تجار مہیا کرتے ہیں۔

اسی طرح سننے میں آیا کہ قادیانی بھی کافی نشیط ہیں اور مدرسے، عبادت گاہیں تعمیر کرتے رہتے ہیں، ان کی کتابوں کی ایک دکان بھی دیکھی تھی، جس میں وہ اپنے لٹریچر وغیرہ فروخت کرتے ہیں، اصل میں عام مسلمانوں کے پاس نشر واشاعت کا کوئی اہتمام وانتظام نہیں ہے، پریس نہیں، بلکہ پورے عرب وافریقہ کے ملکوں میں یہی حال ہے، اور اس کے برخلاف یہاں قادیانی اور شیعہ دونوں نے لٹریچر کا انبار لگا رکھا ہے، قادیانیوں کے لٹریچر انگریزی زبان میں ہوتے ہیں جو یہاں کے عام لوگوں کی زبان ہے، اور شیعہ کے لٹریچر زیادہ تر عربی زبان میں ہوتے ہیں جو لبنان سے منگوائے جاتے ہیں، شیخ شحاوہ نے مجھے بیسیوں چھوٹے بڑے عربی انگریزی کے لٹریچر تھما دئے جبکہ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اپنے مذہب اثنا عشریہ کی اصل کتابیں نہیں دئے ہوں گے۔

بمبئی کی طرح یہاں بھی مصری حکومت نے المرکز الثقافی کھول رکھا ہے بلکہ ان کے جب گھانا کا مرکز ثقافی بند ہوگیا تو اسے بھی یہیں منتقل کردیا، ان کے نشاطات تقریباً وہی ہیں جو بمبئی میں ہوا کرتے تھے، کل جمعرات کو اتفاق سے یہاں کے حجاج

کرام کی بخیریت واپسی کے سلسلے میں مرکز میں پارٹی تھی، الحاج جبریل مجھے بھی کھینچ کر لے گئے، وہاں ہلکی پھلکی تقریر وغیرہ کے علاوہ قرآن کی خطاطی سے متعلق ایک فلم بھی دکھائی، پھراس کے بعد باقاعدہ دعوت کا اہتمام تھا لہذا کھانے پینے کا پورا انتظام تھا اور ہر چیز معیاری اور قابل قدر تھی، البتہ اس دینی اجتماع کی سب سے غلط بات یہ تھی کہ ان سارے اہتمام وانصرام میں نماز مغرب کا کوئی وجود نہیں تھا، اور نہ ہی حجاج کرام اور علمائے عظام میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ دی، دنیا میں اسلام کی ٹھیکہ دار اور از ہر کی دعویدار حکومت کے معاملہ میں بھلا کس کی جرأت ہوسکتی ہے کہ دین کے متعلق ایک لفظ بولے، ویسے مجموعی طور پر یہ مرکز ثقافی نشیط معلوم ہوتا ہے اور عملی طور پر تو خیر سنا ہے، علمی طور پر یعنی تقریر لکچر اور نشرات وغیرہ کے میدان میں سرگرم ہے۔

بہر حال پروگرام کے مطابق میں آج جمعہ کو گیارہ بجے کے لگ بھگ فری ٹاؤن شہر سے لفگی ایرپورٹ روانہ ہو جاؤں گا، پونے تین بجے نائیجیرین جہاز سے بنجول (عاصمہ گامبیا) جاؤں گا وہاں کی اسلامی تنظیم کے ذمہ داروں کو ٹیلکس سے اس کی اطلاع دیدی گئی ہے، اگر چہ اس پروگرام میں جمعہ کی نماز کا معاملہ گول نظر آتا ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ اطلاع یاروں نے پہلے ہی دیدی تھی کہ جمعہ کو پہونچ رہے ہیں، اور جمعہ کو اس کے علاوہ اور کوئی فلائٹ نہیں ہے (مسافر پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے) **والسلام**

☆☆☆☆☆☆☆

سیرالیون

۱۹؍محرم ۱۴۰۰ھ مطابق ۵؍دسمبر ۱۹۷۹ء چہارشنبہ

محترم ومکرم حضرت والد ماجد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں پرسوں ۳۲؍دسمبر دوشنبہ کو چھ بجے منر دویا کے انٹرنیشنل ایرپورٹ رابرٹ فیلڈ سے گھانا ایرویز کے جہاز سے روانہ ہوکر سات بجے کے لگ بھگ لنگی (وہی جو ہم لوگ پہنتے ہیں، یہی تلفظ ہے) انٹرنیشنل ایرپورٹ پہونچے جو فری ٹاؤن کا ہوائی اڈہ ہے اور فری ٹاؤن سے بیس پچیس میل دور واقع ہے، چالیس منٹ کا یہ فاصلہ تقریباً پچیس ہزار فٹ کی بلندی سے پرواز کر کے طے کیا گیا، پھر ایرپورٹ سے بذریعہ بس فری ٹاؤن کے لئے روانہ ہوئے، ٹیکسی والے چالیس لیون مانگتے تھے جبکہ بس نے صرف چار لیون لئے، ایرپورٹ پر دس ڈالر توڑوایا تھا جس کے دس لیون ملے تھے، گویا ایک لیون ایک ڈالر کے برابر ہوتا ہے، بس کوئی دس بارہ میل چلنے کے بعد ایک گھاٹ پر رک گئی معلوم ہوا کہ ٹمالی سے اکرا (گذشتہ سال آپ کے ساتھ) واپسی جیسا لمبا چوڑا دریا پار کرنا پڑا تھا یہاں بھی کچھ اسی قسم کے لمبے چوڑے آبی قطعہ سے سابقہ پڑا تھا اور اسٹیمر بھی تقریباً ویسا ہی تھا، ہماری بس جیسی جیسی کئی بسیں بیک وقت سوار ہوگئی تھیں، چنانچہ میں تو بس سے اترا بھی نہیں، تقریباً ایک گھنٹہ تک اسٹیمر بحیرہ میں چلتا رہا جو سمندر ہی کا حصہ ہے پھر جاکر فری ٹاؤن کے ساحل پر لگا، فری ٹاؤن دور ہی سے بجلی کی روشنیوں سے معلوم ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی پر آباد کوئی شہر ہے جیسا کہ اس کے متعلق سن رکھا تھا، مجھے عمان یاد آ گیا، بہر حال بس اسٹیمر سے اتر کر آگے بڑھی تو بالکل پہاڑی راستوں کو قطع کرتے ہوئے آگے بڑھی اور چوٹی پر جاکر ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی میں نے وہاں سے چار لیون پر دوسری ٹیکسی کر کے شیخ جبریل سیسی کے گھر کا رخ کیا، یہ یہاں کی مستند و معروف اور علمی شخصیت ہے۔ رابطہ وغیرہ کے ممبر ہیں اور دارالافتاء کے مبعوث بھی ہیں، کسی زمانہ میں مصر میں سیرالیون کے سفیر رہ چکے ہیں، رات کے نو بجے تھے وہ گھر ہی میں مل گئے، ان سے رات گئے تک بات چیت ہوتی رہی، بڑھاپے میں بھی کافی نشیط نظر آتے ہیں اور دوڑ دھوپ کرتے

رہتے ہیں، اگرچہ بوڑھے ہوگئے ہیں مگر یہاں کے اسلامی نشاطات کی نگرانی خود گھوم گھوم کر کرتے رہتے ہیں۔

ان کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں کی پوزیشن دوسرے مغربی افریقہ کے ملکوں کی بہ نسبت اچھی ہے، بلکہ راستہ میں مسجدوں کے میناروں اور صبح کو ان کی لاؤڈاسپیکر کی اذانوں سے معلوم ہوا کہ میں کسی عرب ملک میں ہوں مسجدیں لمبی چوڑی صاف ستھری اور آباد ہیں، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ملک کی کل آبادی تقریباً پچاس لاکھ ہے اور مسلمانوں کا تناسب ۹۰ فیصدی ہے یہاں کا صدر مملکت اگرچہ عیسائی ہے مگر مسلمانوں کا غلبہ حکومت پر بھی نظر آرہا ہے، کل ان لوگوں کی آپس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ گھانا کے صدر ہلالیمان کی طرح یہاں کا صدر بھی مسلمان گھرانے سے ہے، عیسائیوں کے مدرسہ میں جانے سے عیسائی ہوگیا ہے، گھانا کے صدر کا بھی یہی معاملہ ہے اس کا اصل نام ہلال امام بتلاتے ہیں کیونکہ اس کے باپ بقول گھانا والوں کے اپنے گاؤں کا امام تھا اور ہلال اس کا نام تھا، اس طرح ہلال امام ہلالیمان ہوگیا۔

کل دوپہر میں شیخ جبریل سیسی کے ساتھ یہاں کی اسلامی تنظیموں اور جمعیتوں کے صدر دفتر گیا تھا، جو سپریم اسلامک کونسل آف سیرالیون کے نام سے مشہور ہے، اس کے صدر اور سکریٹری وغیرہ سے ملاقات ہوئی، میں نے گامبیا کے ویزا کی بات کی تو انھوں نے فوراً ٹیلیفون کرکے گامبیا کے سفارت خانہ کو مطلع کردیا کہ ایک آدھ گھنٹہ کے اندر ہمارے خط کے ساتھ فلاں نام کا ایک پاسپورٹ جائے گا براہ کرم آپ اسے ویزا دیدیں، یہ شیخ گامبیا کے مسلمانوں کے مہمان رہیں گے، اس کے بعد انھوں نے فوراً ایک ٹیلکس بھی گامبیا بھجوادیا کہ جمعہ کو شیخ خالد کمال پہونچ رہے ہیں ایرپورٹ پر ان سے ملو، اس طرح ماشاء اللہ اگلے سفر کا مرحلہ نسبۃً آسان ہوگیا۔ میں تو یہاں سے جمعرات ہی کو یعنی کل نکل رہا تھا، مگر شیخ جبریل نے کہا کہ کم از کم جمعہ تک تو رکو، مقصد

یہی معلوم ہورہا ہے کہ کسی مسجد میں کچھ کہلوائیں گے، میں نے بھی منظور کرلیا ہے، ویسے کل مغرب کی نماز یہاں کی جامع الجلیل میں ادا کی، نماز کے بعد عام طور پر درس قرآن ہوتا ہے اس کی جگہ مجھے تقریر کرنے کو کہا، میں نے مختصر طور پر اپنے آنے کا مقصد اور اس سفر کی غرض وغایت بیان کی اور اخوت اسلامیہ کے موضوع پر کچھ دیر تک کہا، آج فجر کی نماز ایک دوسری جامع مسجد جامع عتیق میں ان ہی کے ساتھ ادا کی، یہ مسجد جیسا کہ نام سے ظاہر ہورہا ہے یہاں کی سب سے پہلی جامع مسجد ہے اور اس پر جن لوگوں کا تسلط ہے وہ ''تیجانیت'' سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ نماز کے بعد ان کے اوراد بڑے زور وشور سے ہورہے تھے، حالانکہ دوڈھائی سو مصلیوں میں سے ورد میں حصہ لینے والے صرف چھ سات آدمی تھے، آج صبح ہی صبح یہ خط لکھ رہا ہوں انشاء اللہ کسی وقت آج ہی حوالہ ڈاک کروں گا، دیکھئے کب تک ملتا ہے، اس سے قبل لائیبریا سے دو خط روانہ کئے ہیں ملے ہوں گے یا شاید دیر سے ملیں، والسلام باقی آئندہ

☆☆☆☆☆☆☆

محترم ومکرم حضرت والد ماجد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ بخیر ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی ہر طرح بخیر وعافیت ہوں گے، جمعہ کے دن فری ٹاؤن سے دوسرا خط بشکل ایر لیٹر میل روانہ کیا تھا، امید کہ فری ٹاؤن کے دونوں خطوط منرودیا کے بھی دونوں خطوط بروقت ملے ہوں گے، اب یہ گامبیا سے پہلا اور آخری خط لکھ رہا ہوں۔

میں جمعہ کو فری ٹاؤن سے ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا تھا، کیونکہ پونے تین بجے نائیجیرین ایرویز کی فلائٹ سے بنجول جانا تھا، جس کی اطلاع وہاں پہلے سے دی

جا چکی تھی، اور جمعہ کو سوائے اس ایک فلائٹ کے اور کوئی دوسری فلائٹ نہیں تھی، پھر بیچ میں فیری سے پار ہونے کے لئے یہ لازمی تھا کہ میں جمعہ کو قربان کروں ورنہ وقت پر ایرپورٹ نہیں پہونچ سکتا تھا، بہر حال ساڑھے گیارہ بجے فری ٹاؤن سے روانہ ہوکر دو بجے کے بعد لنگی پہونچے، سفر کی جملہ کاروائیوں سے فارغ ہوکر اندر بیٹھ کر جہاز کا انتظار کرنے لگا، معلوم ہوا کہ جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہے اس درمیان کوئی خاص کام نہیں تھا، جہاز پونے چار بجے لنگی سے بنڈم بنجول کے انٹرنیشنل ایرہورٹ کے لئے روانہ ہوا، ۵۵ منٹ کی یہ فلائٹ نیچی ہی اڑان سے طے کی گئی، جہاز میں ایک مصری ازہری نظر پڑے ان کے پاس چلا گیا، معلوم ہوا کہ وہ بنجول جارہے ہیں خوشی ہوئی کہ چلو ایک جانکار آدمی ملا مگر یہ خوشی کچھ زیادہ دیر نہ رہ سکی کیونکہ وہ پہلی مرتبہ مبعوث الازہر ہوکر بنجول جارہے تھے اور انھیں کچھ پتہ نہیں ہے، بہر حال ان سے گپ شپ میں جہاز بنڈم پہونچ گیا، امیگریشن میں شیخ کو پسینہ آنے لگا تھا کیونکہ بے چارے نئے تھے اور ان کے پاس ویزہ نہیں تھا، پھر انگریزی ان کو بالکل نہیں آتی تھی، میں نے جانبین میں ثالثی کرکے امیگریشن آفیسر سے کہا کہ ان کو تم صرف ۲۴ گھنٹے کا ویزہ دیدو، یہ لوگ اپنا گھر سمجھ کر یوں ہی بغیر ویزہ وغیرہ کے چلے آتے ہیں، وہ بیچارہ میرے کہنے سے راضی ہوگیا، پھر میں نے شیخ سے کہا کہ پسینہ پونچھ ڈالئے میں نے معرکہ آپ کے لئے جیت لیا ہے، بہر حال پھر تو شیخ اپنی شیخی چھوڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے، خصوصاً جب انھوں نے دیکھا ان کے استقبال کے لئے کوئی موجود نہیں ہے، بہر حال میں فیری پار کرتے ہوئے بنجول کے لئے روانہ ہوا، شام کا وقت تھا قدرتی مناظر بہت سہانے معلوم ہوئے کیونکہ وہ اپنے علاقہ کی سرزمین سے ملتے جلتے معلوم ہورہے تھے، ایک جگہ ٹیکسی والے کو روکا کہ تم ادھر کہاں جارہے ہو بنجول تو ادھر ہے، اس نے کہا کہ یہ جو آدمی بیٹھا ہوا ہے یہ ادھر ہی کے ایک گاؤں میں اترے گا، شیخ نے کہا کہ یا تو تم مجھ سے

جھوٹ بولتے ہو کہ تم پہلے یہاں کبھی نہیں آئے ہو یا پھر تم ضرورت سے زیادہ ہی ہوشیار معلوم ہو رہے ہو کہ جہاں پہلی مرتبہ جارہے ہو وہاں ٹیکسی والے کو راستہ بتلا رہے ہو، میں نے کہا کہ آدمی کو ہوشیار تو رہنا پڑتا ہے میری نظر بورڈوں پر ہمیشہ رہتی ہے، وہاں بنجول کا نشان اس سڑک پر بنا تھا اس لئے میں نے ٹیکسی والے کو متنبہ کیا، بہرحال اس کے بعد سے تو پھر شیخ نے مجھے فضیلۃ الشیخ بنادیا، بہرحال ہوٹل پہونچ کر ٹیکسی والے کو بیس دلاسی (DALASI) ادا کیا گیا جو یہاں کا مقامی سکہ ہے تقریباً پونے دو دلاسی کا ایک ڈالر ہوتا ہے اور ایک دلاسی میں چار سلنگ ہوتے ہیں اور ہر شلنگ میں ۲۵ بتوتے، پھر مغرب پڑھ کر چائے پی گئی اور شیخ کو لیکر میں ہوٹل کے نیچے آیا کہ ہوٹل والوں سے معلوم کر کے شیخ کو مصریوں کے پاس پہونچادوں، جب پتہ نہیں چل سکا تو پھر میں نے کہا کہ چلئے عشاء کی نماز یہاں کی جامع مسجد میں پڑھتے ہیں اور وہاں مصلیوں سے معلوم کرتے ہیں، چار مبعوث الازہر یہاں جب موجود ہیں تو لازمی طور پر ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کا پتہ جانتا ہوگا، مگر مسجد میں جا کر پوچھنے پر ناکامی ہوئی، لوگوں نے بتلایا کہ دو تین جمعہ سے ہم تین چار مصری علماء کو دیکھتے تو ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتے ہیں، میں نے شیخ سے کہا کہ چلئے اب اس کے علاوہ اور کوئی سبیل نظر نہیں آتی کہ آپ رات ہوٹل میں گذاریں اور صبح پھر ان کا پتہ چلایا جائے گا، انھوں نے کہا کہ مجھے تعجب اس پر ہو رہا ہے کہ تم نے جیسا چکر چلایا تھا مبعوث الازہر تو کیا اس چھوٹے سے شہر میں اگر کوئی معمولی آدمی بھی ہوتا تو اس کا پتہ چل جاتا، مگر ان کا پتہ کیوں نہیں چل رہا ہے، بہرحال واپسی پر میں نے ٹیلیفون پر تلاش کر کے ذاکر ابراہیم سمبا کو ٹیلیفون کیا جن کے پاس گامبیا کی ایمبسی واقع فری ٹاؤن سے ٹیلی گرام آیا تھا کہ شیخ خالد کمال دو چار دن کے لئے وہاں جارہے ہیں اور گامبیا کے مسلمانوں کے مہمان ہوں گے، انھوں نے بتلایا کہ کہ دو تین آدمیوں کو ہوائی اڈہ بھیجا

تھا مگر وہ ناکام واپس آئے کہ کوئی سعودی اس جہاز سے نہیں آیا ہے، میں نے کہا کہ یہی غلط فہمی ہوئی، میں انڈین ہوں اور اتفاق سے لباس بھی انڈین ہی پہنے ہوئے تھا، لوگوں نے کوئی قادیانی سمجھا ہوگا اور توجہ نہیں دی ہوگی، بہر حال اس نے بتلایا کہ وہ صبح سویرے شہر سے باہر دورے پر جارہا ہے مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو اس نے پروگرام سمجھا دیا ہے وہ صبح تم سے مل کر پروگرام طے کرلیں گے، مگر صبح کو جب آٹھ بجے تک ہیڈ ماسٹر صاحب نہیں آئے تو شیخ کے اصرار اور تقاضے پر ہم لوگ مصریوں کی تلاش میں نکل گئے، چونکہ سنیچر کا دن تھا اور اسکول میں چھٹی تھی، اس لئے صرف عملہ کے آدمی آئے تھے، بہر حال دس بجے ہیڈ ماسٹر صاحب آئے تو انھوں نے بتلایا کہ میں بیمار تھا اس لئے ہوٹل نہیں جاسکا، پھر انھوں نے کہا کہ چاروں مصری اساتذہ یہیں اسی اسکول میں ٹھہرے ہوئے ہیں، فوراً شیخ کو لیکر ان کے پاس گیا، وہ بیچارے ایک کمرے میں طالب علموں سے بھی بدتر حالت میں تھے، پھر یہ شیخ ان سے ملتے ہی تقریباً رو دینے کے انداز میں گویا ہوئے کہ اگر یہ شیخ ہندی نہ ہوتا تو میں نہ جانے کس حالت میں ہوتا اور کتنا پریشان ہوتا، پھر انھوں نے اپنی رام کہانی بھی سنائی اور پھر اپنی کسمپرسی کا رونا لیکر بیٹھ گئے، ہیڈ ماسٹر بور ہو رہا تھا میں نے اس سے انگریزی میں بات چیت شروع کردی، پھر ہیڈ ماسٹر جاکر ایک مقامی دارالافتاء کے مبعوث کو لے آیا اس کی معیت میں ہم نے پروگرام بنایا کہ شیخ تو ہوٹل سے جاکر اپنا سامان وغیرہ اٹھالائیں میں اسی ہوٹل میں قیام کروں گا، اور پھر میں مبعوث کے ساتھ یہاں کے دوسرے شہر سری کنڈا جمعیۃ الاتحاد الاسلامی کے لیڈر سے ملنے چلا آیا، لیکن وہ نہ مل سکے اس لئے پھر ہم لوگ واپس بنجول آگئے کیونکہ مبعوث کو بارہ بجے سینگال ایمبسی میں ضروری کام تھا، دو بجے میں ایک دوسرے مبعوث سے ملا اور اس نے بتلایا کہ ایک ہندی مبعوث بھی یہاں ہے میں نے کہا کہ فوراً ملاؤ، چنانچہ اس کے ساتھ پھر اسی راستہ سری کنڈا ہوتے

ہوئے تلندن گنجن آئے، ایرپورٹ سے ہوٹل جاتے ہوئے سب سے پہلے اسی مدرسہ کے بورڈ پر نظر پڑی تھی، پھر قادیانیوں کا نصرت ہائی اسکول نظر آیا تھا، چنانچہ میں نے کہا کہ یہ تو ایرپورٹ کے راستہ میں پڑتا ہے وہاں شیخ عبدالودود سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ جامعہ کا اپنا پرانا شیخ اور بنگلہ دیش کا ہمارا ایک ساتھی ہے، بڑی خوشی ہوئی، اس کے بعد کھانا کھا کر شام کو پھر بنجول ہوٹل میں گیا، رات کو مصریوں سے گپ شپ رہی دوسرے دن یعنی اتوار کو بنجول سے تیس میل دور ایک شہر غنجور جانے کا پروگرام بنا، ایک مقامی سعودی مبعوث نے کہا کہ وہ گاڑی بھیج دے گا، چنانچہ گیارہ بجے کے بعد ہوٹل سے روانہ ہوئے ایک درمیانی شہر میں پہونچ کر ڈرائیور نے گاڑی کی کچھ مرمت کرائی ایک گھنٹہ کے بعد پھر وہاں سے چل کر ایک بجے کے لگ بھگ غنجور پہونچے، وہاں دوپہر کا کھانا کھایا گیا اور طے ہوا کہ عصر کی نماز کے بعد وہاں کی جامع مسجد میں تقریر کروں، ایک مدرسہ کا معائنہ اس درمیان میں کیا، پھر عصر کی نماز پڑھ کر تقریر کی، مقامی زبان میں ترجمہ اسی مبعوث نے کیا تھا، تقریر ختم ہونے کے بعد مسجد الحرام کا حادثہ موضوع بحث بن گیا، اور اس موضوع پر بھی بولنا پڑا، پھر مغرب سے کچھ پہلے وہاں سے روانہ ہو کر مدرسہ میں شیخ عبدالودود کے یہاں رک گیا، شام کا کھانا کھا کر پھر ہوٹل چلا گیا وہاں پہونچا تو رات کے دس بج چکے تھے، وہاں چار آدمی آٹھ بجے میرا انتظار کر رہے تھے، ایک جمعیۃ عباد الرحمان کے صدر تھے، دوسرا ایک سعودی مبعوث تھا اور دو مقامی آدمی، انھوں نے کہا کہ کل یعنی دوشنبہ کو میں ان کو وقت دوں، چنانچہ دوشنبہ کی صبح مبعوث صاحب آئے ان کے ساتھ وزارت تعلیم گیا جہاں جمعیۃ عباد الرحمان کے صدر منقش قسم کے عربی تھے ان سے ملاقات ہوئی، وزیر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے نائب وزیر سے ملاقات رہی، کچھ وزارت کے مختلف شعبوں کے سربراہوں سے ملایا پھر دو ایک جگہ اور لے گئے، اور میں بارہ بجے تک واپس ہوٹل

آ گیا، جہاں پروگرام کے مطابق شیخ عبدالودود میرا انتظار کررہے تھے، پھران کے ساتھ شہر آیا یہاں مدرسہ کے لڑکوں میں کچھ تقریر کرنی تھی اور پھر شام کو عصر کے بعد جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے ممبران کو مخاطب کرنا تھا، یہاں دو مترجموں نے ترجمہ کا کام کیا، کیونکہ دو قبیلوں کی تعداد تقریباً برابر تھی، یہاں سے مغرب پڑھ کر واپسی ہوئی اور پونے آٹھ بجے بنجول کی جامع مسجد میں عشاء کی نماز ادا کی، پھر مصریوں سے ملنے چلا گیا، گیارہ بجے تک ان کے ساتھ گپ شپ رہی، پھر ہوٹل آ گیا، کل ہی ڈاکار جانے کے لئے نائیجیرین ایرویز کے جہاز سے جو شام کو ڈاکار جاتا ہے، سیٹ رزرو کرالی تھی، چنانچہ آج صبح تیار ہو کر ہوٹل سے شیخ عبدالودود کے یہاں آ گیا تاکہ یہاں آرام کروں اور دوپہر کا کھانا کھا کر ایرپورٹ روانہ ہو جاؤں جو یہاں سے قریب ہی ہے، اس وقت دو بج رہے ہیں اور دو بجے ہی روانہ ہو جانا چاہئے تھا مگر جہاز چار بجے ہے، اس لئے یہ خط پورا کر رہا تھا، اسے شیخ عبدالودود کے حوالہ کردوں گا تاکہ وہ اسے ڈاک کے حوالہ کردیں، انشاء اللہ پھر سینگال سے خط لکھوں گا، جملہ پرسان حال کو سلام بچوں کو دعا و پیار، بڑوں کو سلام۔

☆☆☆☆☆☆☆

جمعہ ۲۵ر محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

۱۴ر دسمبر ۱۹۷۹ء

محترم و مکرم حضرت والد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

بفضلہٖ تعالیٰ میں بخیر ہوں، امید کہ آپ حضرات بھی ہر طرح بخیر و عافیت ہوں گے، امید کہ میرے سابقہ خطوط جو بالترتیب مندوویا، فری ٹاؤن اور بنجول سے

روانہ کئے گئے ہیں بروقت ملتے رہے ہونگے ،اس دورہ کا آخری مرحلہ ہے، میں بنجول سے منگل ۱۱/دسمبر کو بذریعہ نائیجیرین ایرویز شام کے ساڑھے چار بجے بخیریت ڈاکار پہونچا، جہاز ہی سے معلوم ہوا کہ یہ شہر مغربی افریقہ کے عام شہروں اور دارالسلطنتوں سے مختلف ہے، بلکہ یورپ کا کوئی حصہ نظر آرہا ہے،اس کے متعلق سنا بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ فرانسیسیوں نے افریقہ میں بھی ایک چھوٹا سا پیرس بسا رکھا ہے،خصوصاً یہ مغربی افریقہ کی فرانسیسی کالونیوں کا صدر مقام تھا، بلامبالغہ اس شہر کے بعض حصے یورپ کے کسی ترقی یافتہ علاقہ سے کم نہیں ہیں، چونکہ یہاں انگریزی کے بجائے فرانسیسی کا بول بالا تھا،اس لئے ایرپورٹ میں کچھ آنکھ مچولی چلی ،مگر ظاہر ہے کہ ڈاکار کا ایرپورٹ اتنا ترقی یافتہ اور مشہور ہے کہ یہاں کنکورڈ جہاز تک آتے جاتے ہیں تو بھلا انگریزی جاننے والے کیوں نہیں ہونگے،، چنانچہ دوسرے ڈیسک پر مسئلہ حل ہوگیا ، یہاں کا سکہ عام فرانسیسی کالونیوں کے سکہ کی طرح فرانک ہے جو یہاں ایک ڈالر میں ۱۹۵ کے حساب سے ملا،شہر ایرپورٹ سے تقریباً ۲۰ کیلومیٹر پر واقع ہے ،میں یہاں ساڑھے چار بجے پہونچا مگر شہر پہونچتے پہونچتے مغرب بعد کا وقت ہو چکا تھا، ڈاکار کے امام کی تلاش میں یہاں کی مشہور ومعروف جامع مسجد پہونچا جس کا اسلامی مغربی طرز تعمیر ہے تو پتہ چلا کہ یہاں مسجد نور بھی ہے یعنی جماعت تبلیغی والوں کی مسجد، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستان کی ایک جماعت آئی ہوئی ہے،لہذا وہاں سے سیدھا مسجد نور کا رخ کیا جو یہاں کے ایک نسبتاً غیر ترقی یافتہ (کولوبانی) محلّہ میں واقع ہے، مغرب کے بعد مسجد نور میں پہونچا تو سب سے پہلے میری نظر اپنے ایک گھانین شاگرد پر پڑی جو گھانا کا ایک بڑا شیخ ہے، پھر کیا تھا گویا اس شہر کی ساری اجنبیت دور ہوگئی، انھوں نے لوگوں سے تعارف کرایا، جماعت کے متعلق پتہ چلا کہ ہیڈ آفس تو یہی ہے، مگر قاعدہ کے مطابق جماعت کل سے دوسری مسجد میں مقیم ہے، بہر حال کھا پی کر آرام

کیا گیا،اورصبح ناشتہ کے بعد جماعت والوں سے ملاقات کیا، کچھ دیران کے پاس بیٹھ کر پھر رابطۂ عالم اسلامی کے افریقی آفس میں پہونچا، وہاں سعودی عرب کے ذمہ دار صاحب موجودنہیں تھے،ان کے سکریٹری نے کچھ غیر ذمہ دارانہ باتیں شروع کردیں، جس کی وجہ سے اس کوچھوڑ کراسی عمارت کی پہلی منزل پرواقع **اللجنة التنفيذية للتنسيق العمل الاسلامي الافريقي** کے دفتر میں گیا،وہاں بھی کوئی ذمہ دار موجودنہیں تھا،معلوم ہوا کہ اس کے انچارج جوسنگال کے مصر میں سفیر بھی ہیں، وہاں سے بھی کوئی مفید معلومات نہیں ہوسکی ، بلکہ اس کے برعکس دونوں آفسوں سے کافی مایوسی ہوئی ،جبکہ ڈاکار کے سفر کے مقاصد میں اولیت انہیں دونوں اداروں کی زیارت اوران سے استفادہ تھا، کیونکہ جیسا کہ سنا گیا ہے یہ دونوں ادارے پورے افریقہ یا کم ازکم پورے مغربی افریقہ کی سطح پر کام کررہے ہیں،وہاں سے نکل کر ہم لوگ سعودی سفارت خانہ جارہے تھے وہاں سے کسی سعودی مبعوث کے متعلق کچھ معلومات ہو، نیچے اترے تو معلوم ہوا کہ ایک ذمہ دارمکتب **اللجنة التنفيذية** کے تشریف لا رہے ہیں، ان سے کوئی خاص معلومات نہ ہوسکی سوائے اس کے کہ انھوں نے کہا کہ مصطفیٰ صاحب اس وقت ڈاکارہی میں موجود ہیں اوران سے وقت لیکر ملاقات کی جاسکتی ہے،ہم نے مسجد نور کا پتہ دیدیا کہ اگرممکن ہوتو وہاں اطلاع کرادیں پھر ہم لوگ سعودی سفارت خانہ گئے وہاں کونسلر سے ملے مگران کے علم میں کوئی سنگال میں دارالافتاء کا مبعوث نہیں تھا، اسلئے یہاں مدارس ومساجد اوراسلامی مراکز کی سرگرمیاں معلوم کرنے اوران کی زیارت کرنے میں دشواری پیش آئی ، بہرحال کچھ دیر تک گفتگو کے بعد سفارت خانہ سے نکل کر مسجد نور واپس آئے، اور شام کو جماعت اہل السنۃ کے مدرسہ کے مدیر ومدرس کی زیارت کی گئی،معلوم ہوا کہ یہاں پر تقریباً ۲۷؍ مختلف اسلامی تنظیمیں تھیں جن کوملا کر **اتحاد الجهات الاسلامية للثقافة**

الاسلامیة بنائی گئی ہے اور یہ ساری جمعیتیں اسی کے ماتحت کام کررہی ہیں، اتحاد کی عمارت اور مکتب الرابطہ اور اللجنة التنفيذية کی عمارت تقریباً سب ایک ہی ہیں، چونکہ یہاں کی سرکاری زبان فرنچ ہے، اس لئے یہاں عام طور پر فرنچ عربک اسکول کے نام سے نئے طرز کے اسکول کھل رہے ہیں جن میں عربی اور فرنچ دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں یہاں کی ۹۵ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

جمعرات کی صبح شہر کے سب سے بارونق علاقہ میدان جمہوریت میں جا کر جہاں ہوائی کمپنیوں کے دفاتر وغیرہ واقع ہیں بنک سے پیسے بھنائے اور اکرا سے واپسی کے لئے ۱۵ ردسمبر سنیچر کی سیٹ بھی بک کرالی، نائیجرین ایرویز کے جہاز سے صبح نو بجے روانگی ہوگی لیکن اکرا شام کو ۴ ربجے پہونچے گا، کیونکہ تمام چھوٹی چھوٹی جگہوں پر رکتا ہوا جائے گا، بہرحال یہ کام ضروری تھا، اس کے بعد کوئی خاص کام نہیں تھا، مسجد نور میں جو لوگ ملتے تھے ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی، اور کچھ لوگوں سے چلتے پھرتے ملاقات ہوجاتی تھی، یہاں کا ایک طالب علم جو عربی اور مقامی دونوں زبانیں جانتا تھا شروع ہی سے ساتھ ہے اس سے کافی مدد مل جاتی ہے، بلکہ اسی کی وجہ سے آج صبح سویرے طوبیٰ چلا گیا جو یہاں سے پونے دوسومیل دور واقع ہے دس بجے روانہ ہوکر ڈیڑھ بجے وہاں پہونچے، وہاں جا کر طوبیٰ کی جامع مسجد میں نماز ادا کی، یہ جامع مسجد شیخ احد بمبرا کی لڑکی حربہ سے مشہور ہے جو بارہویں صدی کے ایک عالم اور استعمار کے خلاف لڑنے والے مجاہد تھے ان کی قبر کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندستان میں اجمیر والے خواجہ کو، دیکھا تو وہی چیزیں نظر آئیں، جو عام طور پر قاہرہ کی زیارت گاہوں اور ہندوستان کی بڑی بڑی مزاروں پر نظر آتی ہیں، بہرحال وہاں پونے دو بجے پہونچے جمعہ کی اذان ہورہی تھی، جمعہ کی نماز کے بعد قبر کی زیارت کا تماشا دیکھا گیا، تھوڑی دیر رہ کر تین بجے کے بعد وہاں سے واپس ڈاکار کے لئے روانہ

ہوگئے اور یہاں بخیریت تمام عشاء کے وقت پہونچ گئے، اب صبح فجر کی نماز پڑھ کر ٹیکسی کر کے سیدھے ایرپورٹ کا رخ کرنا ہے، اب انشاء اللہ کراچی پہونچ کر خط لکھوں گا، بچوں کو دعا و پیار، بڑوں کو سلام

والسلام

☆☆☆☆☆☆☆

بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت بحمداللہ تمت